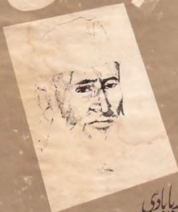
یکے از
مطبوعات آزاد صدی

مولانا عبدالماجد دریابادی کے علمی، ادبی، لسانی اور نجی خطوط کا مجموعہ

خطوط ماجدی



مولانا عبدالماجد دریابادی

خطوطِ ماجدی

مکاتیب

مولانا عبدالماجد دریابادی

مجموعہ :	خطوط ماجدی
مصنف :	مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم
مرتب :	ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری
ناشر :	ادارہ تصنیف و تحقیق پاکستان علی گڑھ کالونی ۔ کراچی ۴۱
مطبع	المخزن پرنٹرز ۔ پاکستان چوک ۔ کراچی
اشاعت اول :	فروری ۱۹۸۶ء
تعداد اشاعت :	پانچ سو
قیمت :	

ملنے کے پتے

مکتبہ شاہد — علی گڑھ کالونی ۔ کراچی ۴۱

معیار ادب — ۵/۱۲۶، ۵ ۔ ڈی ۔ نیو کراچی

سنی پبلی کیشنز — الوہاب مارکیٹ ۔ اردو بازار ۔ لاہور

پاک اکیڈمی، مسجد باب الاسلام بالمقابل آرام باغ کراچی

اور

مکتبہ رشیدیہ، قاری منزل پاکستان چوک کراچی

به تقریب

صد سالہ یوم پیدائش

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ

وطن آبائی

دہلی مرحوم (پنڈت کا کوچہ)

سَلَامٌ عَلیٰ نجدٍ، وَمَنْ حَلَّ بالنجد

وطن مادری : مدینہ طیبہ

دارم دلے گرداں کہ من قبلہ نمای خوانمش — رو سوئے ابرویش کند ہر چند می گردانمش

ولادتِ باسعادت

ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ مطابق اگست ۱۸۸۸ء

بمقام مکہ معظمہ زاد اللہ شرفا و کرامۃ، محلہ قدوۃ، متصل باب السلام

بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِندَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ

وفاتِ حسرت آیات

۲ شعبان المعظم ۱۳۷۷ھ مطابق ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء بروز ہفتہ

به مقام دہلی (دارالحکومت ہند)

آزاد نیشنل کمیٹی، پاکستان

فہرست

خطوط

پیغامات

عذر: اس مجموعے میں ہر مکتوب الیہ کے پہلے خط کی تاریخ تحریر کو بنیاد بنا کر ترتیب قائم کی گئی تھی۔ لیکن کاپی جوڑتے ہوئے بعض سیٹ آگے پیچھے ہو جانے کی وجہ سے پیش نظر ترتیب قائم نہ رہ سکی۔ (شاہجہانپوری)

مقدمہ

(۱)

۱۸۹۲ء میں دریاباد ضلع بارہ بنکی (اودھ) کے شیخ زادوں کے خاندان اور عبدالقادر ڈپٹی کلکٹر کے گھر میں ایک بچہ پیدا ہوا تو کون کہہ سکتا تھا کہ یہ بچہ جب اپنی عمر طبعی کو پہنچ کر اس دنیا سے رخصت ہوگا تو اپنے وقت کا نامور ادیب، صاحب طرز انشاپرداز اور بے باک صحافی ہوگا۔ اس وقت جب کہ مولانا سیتاپور میں زیر تعلیم تھے اور میٹرک کے امتحان میں بھی ابھی کئی سال باقی تھے ڈراموں میں حصہ لیتے تھے اس وقت جن لوگوں نے انھیں دیکھا تھا، انھیں کیوں کر خیال آسکتا تھا کہ یہ لڑکا ایک دن قومی تحریکات میں حصہ لے گا اور سیاسی زندگی کے ابتلا اور آزمایشوں سے بھی گزرے گا اور برٹش استعمار اس کی تیکھی چتون سے لرز اٹھے گا۔ اور کون شخص یہ گمان کر سکتا تھا کہ وہ نوجوان جس کی پوری تربیت دینی ماحول میں ہوئی تھی اور جس کی ننھیال اور ددھیال کی خواتین و مرد اپنی دین داری اور تقوی کی وجہ سے معروف تھے، اپنے عہد شباب میں کفر والحاد میں معروف ہوگا اور پھر ایک وقت آئے گا کہ وہ بلند پایہ مفسر قرآن ہوگا! لیکن زمانہ عجائبات سے کبھی خالی نہیں رہا، یہ اعجوبہ شخصیت بھی ہماری آنکھوں نے دیکھی جو اپنے انھیں خصائص کی بنا پر زندگی کی مختلف مجلسوں میں لوگوں کی نظر و توجہ کا مرکز رہی ہے۔ جو اپنی آزاد خیالی اور عقلیت پرستی کی بنا پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی تنقید سے باز نہ آیا تھا اور کسی بزرگ کی نصیحت کو درخور اعتنا نہ سمجھتا تھا، اس کے نزدیک وقت کے ایک شیخ طریقت سے 'نسبت و ارادت' دنیا کی سب سے بڑی سعادت ٹھہری۔ یہ جامع جہات اور جامع حیثیات شخصیت مولانا عبدالماجد دریابادی کی تھی۔

مولانا دریابادی کی شخصیت دریاباد کے دو علمی خاندانوں کا مجمع البحرین تھی۔ یہ دونوں خاندان جو ان کی ننھیال اور ددھیال کے خاندان تھے جو علمی، دینی اور تہذیبی روایات کے حامل تھے۔ اگر ایک دور کو جسے ہم زندگی کا اضطراری دور کہہ سکتے ہیں، نظر انداز کر دیا جاتے تو کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شخصیت کی تعمیر میں ان دونوں خاندانوں کی بہترین علمی اور دینی روایات نے حصہ لیا تھا۔

ان کے دادا مفتی مظہر کریم مشاہیر علما، بزرگان دین اور مجاہدین آزادی میں سے گزرے ہیں۔ لکھنؤ کے علما کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ تحصیل علمی سے فراغت کے بعد انگریزی ملازمت اختیار کرلی۔ جہاد آزادی ۱۸۵۷ء کے دوران میں وہ شاہجہان پور (یوپی) میں سرشتہ دار عدالت تھے اس لیے شاہجہان پور میں تحریک آزادی کو پروان چڑھانے میں ان کا خاص حصہ رہا۔ تحریک آزادی میں ناکامی کے بعد گرفتار ہوئے اور سات سال کے لیے انھیں جزیرۂ انڈمان بھیج دیا گیا۔ لیکن ان کی علمی قابلیت اور خدمت کی بنا پر جلد ہی رہائی مل گئی۔ مولانا دریابادی کے ددھیالی بزرگوں میں کئی اور نامور شخصیتیں گزری ہیں۔

ان کی ننھیال بھی ایک علمی خانوادہ تھی۔ ان کے نانا اور ایک بزرگ حکیم عبدالعزیز دریابادی کا ان کے زمانے کے نامور اطبا میں شمار ہوتا تھا۔ حکیم عبدالعزیز تو بلی خدمت گزاروں کی اس جماعت سے تعلق رکھتے تھے جنھوں نے ندوۃ العلماء لکھنؤ کے قیام میں کوشش کی تھی۔

مولانا دریابادی کے والد مولوی عبدالقادر بھی بڑے نیک بزرگ تھے۔ شروع ہی سے سرکاری ملازمت میں تھے۔ اپنی محنت، دیانت داری، انسانیت اور خدمت خلق کی خوبیوں کی بنا پر بلاتفریق مذہب ہندوؤں اور مسلمانوں میں عزت و احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ ترقی کرکے ڈپٹی کلکٹر کے عہدے تک پہنچ گئے تھے۔ آخر عمر میں حج کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ مکہ معظمہ میں انتقال فرمایا۔ مولوی عبدالقادر کے دو بیٹے تھے۔ بڑے کا نام عبدالمجید تھا۔ انھوں نے تحصیل علمی کے بعد سرکاری ملازمت کرلی اور ڈپٹی کلکٹر کے عہدے تک پہنچے۔ ۱۹۶۰ء میں انتقال ہوا۔ چھوٹے بیٹے کا نام عبدالماجد تھا جو اپنی جوانی میں فلسفی عبدالماجد کے نام سے اور پھر مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام سے مشہور ہوئے۔

شیخ زادوں کا یہ خاندان جس میں مولانا دریابادی کی ولادت ہوئی بارہ بنکی کا وہی خاندان ہے جو قدوائی خاندان کے عرف سے مشہور ہے۔ ان کی ابتدائی اردو اور فارسی کی تعلیم گھر پر ہوئی۔ مرزا محمد ذکی اور مولوی عظمت اللہ فرنگی محلی سے عربی زبان کی تحصیل بھی کی تھی لیکن تکمیل نہیں کی۔ اردو اور فارسی کی مبادیات سے گزرنے کے بعد انھیں اسکول میں داخل کرادیا گیا۔ ۱۹۰۸ء میں سیتاپور سے جہاں ان کے والد بسلسلۂ ملازمت مقیم تھے، میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ میٹرک کرنے کے بعد وہ لکھنؤ آگئے اور کیننگ کالج سے بی اے پاس کیا۔ ایم۔ اے کے لیے علی گڑھ تشریف لے گئے۔ داخلہ لیا کچھ دنوں قیام کیا لیکن حالات نے مساعدت نہ کی اس لیے واپس آگئے اور

مزید تعلیم کا خیال ترک کردیا۔ کالج میں فلسفہ ان کا خاص مضمون تھا۔ فلسفے کے مطالعے اور انہماک نے ان کی مذہبی زندگی کی عمارت مسمار کردی۔ وہ اپنی عقلیت پسندی اور فلسفے کے سامنے مذہبی تعلیمات، دینی عقائد حتیٰ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ان کی کتاب "سائی کلوجی آف لیڈر شپ" شائع ہوئی تو اس میں ان کی آزاد خیالی اور بے باکی زبان و قلم حد سے تجاوز کرچکی تھی۔ مولانا محمد علی نے اس پر لکھا کہ "آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو باتیں لکھی ہیں ان میں اس چیز کا خیال رکھنا ضروری تھا کہ اتنے کروڑ مسلمان جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا آقا مانتے ہیں تو کوئی بات تو آپ میں ضرور ہوگی۔ پھر بحیثیت انسان کے آپ کو کتنی کروڑ مسلمانوں کے جذبات کا احترام کرنا تھا۔" مذہب کے باب میں ان کی سنجیدگی اور جذبات کی شدت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ انٹرمیڈیٹ کے امتحان کا فارم پُر کرتے وقت مذہب کا خانہ خالی چھوڑ دیا تھا۔ اپنے آپ کو مسلمان کہلوانا گوارا نہ کیا۔ منافقت انھیں پسند نہ تھی۔

مطالعہ کا شوق مولانا دریابادی کو بچپن ہی سے تھا اور بقول خود ان کو جو کچھ الم غلم ملا پڑھ ڈالا۔ ایک ادیب کی حیثیت سے ان کی شخصیت کی اٹھان نہایت شاندار تھی بقول مولانا سعید احمد اکبرآبادی "مولانا کی تصنیفی زندگی کا آغاز ایک فلسفی اور اردو شعر و ادب کے ایک نقاد کی حیثیت سے ہوا مطالعہ کے دھنی اور رسیا، نظر میں وسعت اور ذہانت و فطانت خداداد، اس زمانے کے باکمال ارباب قلم کی صحبت و معیت، پھر سب سے بڑی بات یہ کہ انشاد تحریر کا ایک منفرد اسلوب ان سب چیزوں نے مل جل کر عنفوان شباب ہی میں اردو زبان کا ایک ممتاز ادیب اور مصنف بنا دیا۔" ادبی زندگی کا آغاز تو بارہ سال کی عمر میں ہوگیا تھا جب وہ ساتویں جماعت کے طالب علم تھے پہلا مضمون "اودھ اخبار" (لکھنؤ) میں چھپا تھا، نویں جماعت میں تھے جب ایک یونانی وڈ لٹریچر کا اردو میں ترجمہ کیا لیکن باقاعدہ ادبی زندگی کا آغاز قیام لکھنؤ کے زمانے سے ہوتا ہے۔ مطالعہ کے شوق اور اہل علم کی صحبت نے ان کے ادبی ذوق کو چمکا دیا تھا۔ لکھنؤ اہل علم و ادب کا مرکز تھا، صبح و شام ان سے ملنا جلنا تھا، رات دن بحث و مباحثے تھے، دارالعلوم ندوہ کے اصحاب درس و تدریس خصوصاً علامہ شبلی سے تعلقات تھے، فرنگی محل کے مولانا عبدالباری کے ہاں آنا جانا تھا، اکبر الہ آبادی سے تعارف تھا، مولانا محمد علی اور شوکت علی سے بھی تعلقات تھے۔ ان کے علاوہ مرزا ہادی رسوا، عبدالحلیم شرر، آثر لکھنوی، عزیز لکھنوی، مرزا عسکری،

امیر احمد علوی وغیرہ سے قریبی روابط اور ان کی محفلوں میں آنا جانا تھا۔ مشہور فلسفی ظفر حسین تو ان کے کالج کے ساتھیوں میں سے تھے۔ ابوالکلام آزاد، سید سلیمان ندوی، عبدالسلام ندوی، عبدالباری ندوی سے برابر کے دوستانہ روابط تھے اور صبح و شام کا ملنا جلنا تھا۔ ان صحبتوں نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ پڑھنے اور لکھنے کا عمل ساتھ ساتھ جاری رہا۔ ان علمی صحبتوں میں ان کی زبان منجھ گئی اور اعتماد پیدا ہو گیا۔ یہ اعتماد انھیں اپنے مطالعے پر بھی تھا، اپنی رائے اور فکر پر بھی تھا اور اپنی زبان اور قلم پر بھی۔ طبیعت کی تیزی نے قلم میں بھی جولانیاں بھر دی تھیں، وہ اپنے وقت کے بڑے بڑے اہل قلم کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ شبلی کی الکلام چھپی تو الناظر میں کئی قسطوں میں اس پر ایک زبردست تنقید لکھی۔ ادھر شبلی مرحوم کی علمی صحبتوں میں شریک تھے۔ اخبار میں تنقید چھپ رہی تھی۔ تنقید پر صاحب تحریر کے نام کی جگہ چونکہ "ایک طالب" چھپتا تھا اس لیے ایک مدت تک کسی کو پتا نہ چل سکا کہ یہ طالب علم کون ہے۔ شبہ ہوا تو مولوی عبدالحق کی طرف جو بعد میں بابائے اردو کے لقب سے ملقب و مشہور ہوئے۔

مولانا دریابادی کی زندگی کا یہ جذباتی دور تھا۔ جن بزرگوں اور دوستوں سے تعلقات تھے انھیں دریابادی کی یہ آزاد خیالی پسند نہ تھی۔ قلق تھا کہ ذہانت برباد اور صلاحیتیں رائیگاں جا رہی ہیں۔ لیکن مقصد چوں کہ اصلاح تھا اس لیے انقطاع تعلقات کی نوبت نہ آئی تھی۔ یقین تھا کہ بچپن کی تعلیم و تربیت اور ابتدائی دینی ماحول کا اثر اپنا رنگ ضرور دکھائے گا۔ ہر بزرگ نصیحت و وعظ کے بہترین موقع کی تلاش میں تھا۔ بہر حال وہ دورِ سعادت بھی آ گیا۔ اس میں سب سے بڑا حصہ تو ان کی فطرت کی سعادت اور قلب کی سلامتی کا تھا۔ ظاہری اسباب میں شبلی نعمانی کی سیرت النبی اور قرآن مجید کے انگریزی ترجمے کا حصہ تھا۔ اب تک سیرت کی جو کتابیں ان کے مطالعے میں آئی تھیں ان کا اسلوب و معیار مولانا کی عقل اور انداز فکر کو مطمئن نہ کر سکا تھا۔ سیرت النبی اسلوب و معیار کا ایک شاہکار تھی اس نے مولانا کے دماغ کو آسودہ کیا اور دماغ سے اس کا اثر دل نے قبول کیا۔ حضرت اکبر اور محمد علی کے نصائح نے اپنا رنگ دکھایا مولانا محمد علی نے انھیں لکھا کہ تم عربی کے طالب علم رہے ہو، قرآن مجید کو الہامی کتاب سمجھ کر نہ سہی عربی ادب کی بہترین کتاب سمجھ کر پڑھو۔ زبان و ادب سے تمہیں دلچسپی بھی ہے۔ حضرت اکبر الہ آبادی نے بھی انھیں اسی قسم کی بات لکھی کہ تم قرآن کو اللہ کی کتاب نہیں مانتے اس لیے اس کے آداب تلاوت کے بھی تم مکلف نہیں ہو سکتے اس لیے اگر کسی وقت بے وضو

بھی تم اس ادب کے شاہکار اور انقلاب آفریں کتاب کو بیٹھے یا لیٹے ہوئے پڑھ لیا کرو تو اس میں مضائقہ نہیں۔ کیا ہی اچھے ہمارے بزرگ تھے اور کتنا دل پذیر ان کا اسلوبِ وعظ تھا۔ جدوے کے بانیوں سے اگر ان کا سابقہ پڑتا تو پہلے ان کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر ہوتا پھر مناظرے کی دعوت دی جاتی اور پھر مباہلہ کا چیلنج دیا جاتا۔

فلسفہ اور تصوف کا قریبی تعلق ہے۔ تصوف بھی ایک فلسفہ ہی تو ہے۔ فلسفہ کے ذوق و انہماک نے انھیں تصوف اور روحانیت کی طرف متوجہ کیا۔ رفتہ رفتہ مولانا کو دماغ کے ساتھ دل اور عقل کے ساتھ جذبات کی اہمیت کا اندازہ بھی ہوتا گیا۔ تصوف و روحانیت کے ذوق نے اصحاب دل کی صحبتوں کی طرف متوجہ کیا اور بالآخر ایک دن حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ سے بیعت کا رشتہ قائم ہو گیا۔

ان کے شیخ طریقت یہی بزرگ تھے لیکن انھوں نے روحانی فیض وقت کے ایک دوسرے شیخ مولانا اشرف علی تھانویؒ سے اٹھایا لیکن محبت انھوں نے مولانا محمد علی اور اکبر الہ آبادی سے بھی اسی طرح کی جس طرح ایک مرید اپنے پیر و مرشد سے کرتا ہے۔ چنانچہ "اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں" اور "مکاتیب اکبر"، "محمد علی: ذاتی ڈائری" (دو حصوں میں) اور "حکیم الامت، نقوش و تاثرات" ان کی بلند پایہ ادبی تصانیف اور ان اکابر کو ان کا خراج عقیدت ہے۔

صحافی کی حیثیت سے مولانا کا مقام بہت بلند تھا۔ مولانا آزاد، محمد علی، ظفر علی خاں، مولانا غلام رسول مہر، صحافیوں کے اس طبقہ علیا سے تعلق رکھتے ہیں جنھوں نے صحافت سے علم اور ادب کا رشتہ قائم کیا اس سلسلے کی آخری کڑی مولانا دریابادی تھے۔ ۱۹۲۵ء میں "سچ" کے اجرا سے ان کی صحافیانہ زندگی کا باقاعدہ آغاز ہوا تھا، "سچ" کے بعد "صدق" کے نام سے اخبار جاری کیا، تقسیم ملک کے بعد اس کا نام بدل کر انھوں نے "صدق جدید" کر دیا تھا۔ اور زندگی کے آخری دنوں تک اس سے ان کا مدیرانہ تعلق رہا۔ اور ان کے رشحات فکر و قلم سے "صدق جدید" کے صفحات مزین ہوتے رہے۔

روز نامہ "حقیقت" لکھنؤ کے اجرا میں ان کی مساعی کا حصہ تھا۔ ۱۹۲۰ء میں وہ چند ماہ تک مولانا محمد علی کے "ہمدرد" دہلی سے بھی وابستہ رہ چکے تھے۔ ہندوستان کے مشہور علمی رسالہ "معارف" اعظم گڑھ کی مجلس ادارت میں تو وہ ہمیشہ رہے لیکن مولانا سید سلیمان ندوی کی غیر حاضری کے زمانے میں اس کی پوری ادارتی ذمہ داریاں بھی ان پر تھیں۔

مولانا دریابادی کو اختصار و ایجاز میں اعجاز کی حد تک کمال حاصل تھا۔ وہ روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے حکمت کے ایسے نکتے پیدا کرتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔ گرد و پیش کے واقعات پر خواہ سیاسی ہوں، خواہ تہذیبی و معاشرتی وہ چھوٹے چھوٹے جملوں اور روزمرہ کی زبان اور بول چال کے اسلوب میں نہایت خوب صورتی کے ساتھ فکر انگیز تبصرہ کرتے تھے۔ ان کے طنز کا کوئی جواب نہ تھا ان کی نگاہیں واقعات کے پس منظر اور تحریر و بیان سے دل کے چور کا پتا چلا لیتی تھیں۔ حالات و واقعات پر یہ تبصرے صدق جدید" میں مستقل طور پر "سچی باتیں" کے عنوان سے صفحہ اول و دوم کی زینت بنتے تھے۔ مولانا کی ان سچی باتوں کی مقبولیت کا دائرہ ہندوستان سے پاکستان تک وسیع تھا۔ پاکستان کے بعض اخبار ہر ہفتے، نہایت پابندی کے ساتھ اپنے صفحات میں انھیں شائع کرتے تھے، ادبی لحاظ سے بھی "سچی باتیں" اردو کے طنزیہ ادب میں خاصے کی چیز شمار کی جاتی ہیں۔

۲۰ویں صدی کے آغاز تک فلسفہ اور نفسیات کے موضوع اور مباحث پر اُردو میں لکھنے والوں کی بڑی کمی تھی۔ مولانا دریابادی کی ذات گرامی کی بدولت یہ کمی بڑی حد تک پوری ہوئی۔ انھوں نے فلسفہ و نفسیات کے موضوع پر کئی کتابیں تصنیف بھی کیں اور متعدد بلند پایہ کتابوں کا ترجمہ بھی کیا۔ چنانچہ فلسفۂ جذبات، فلسفۂ اجتماع، مکالماتِ برکلے، مبادیِ فلسفہ (دو حصے) فلسفہ اور اس کی تعلیم، ہم آپ، کتابیں بہت مشہور ہیں۔ اخلاق و تصوف کے موضوع پر ان کی تصانیف میں تاریخِ اخلاقِ یورپ (دو حصے) تصوفِ اسلام، فیہ ما فیہ (ملفوظات مولانا روم) قابلِ ذکر ہیں۔

جوں جوں مولانا دریابادی کی عمر پختہ ہوتی گئی ان کا ذوق قرآن اور سیرت سے بڑھتا گیا اور اسی ذوق کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے قرآن اور سیرت پر بلند پایہ تالیفات اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ سیرت پر ان کی جو معرکہ آرا کتاب ہے فی الحقیقت وہ بھی قرآن سے ان کے ذوق و شغف ہی کا نتیجہ ہے اس کتاب میں انھوں نے سیرت نبوی کو قرآن کی روشنی میں مرتب کیا ہے۔ سیرت نبوی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو اس میں نہ آ گیا ہو اور کوئی بات ایسی نہیں جو انھوں نے قرآن سے اخذ نہ کی ہو۔ اسی طرح "بشریتِ انبیاء علیہم السلام" ان کی ایک مختصر کتاب ہے جس میں قرآن مجید کی روشنی میں حضرات انبیائے کرام کے مرتبۂ بشریت کی تحقیق پیش کی گئی ہے۔ قرآن کی شخصیات پر ایک مفید اور معلومات افزا کتاب "اعلام القرآن یا قرآنی شخصیتیں" ہیں۔ "الحیوانات فی القرآن

یا حیوانات قرآنی" اور "ارض القرآن یا جغرافیہ قرآنی" ان کی دو اور تصانیف قرآن سے ان کے کمالِ ذوق و شغف کو ظاہر کرتی ہیں۔ لیکن ان کی معرکہ آرا تالیف "تفسیر ماجدی" ہے مولانا کی تفسیر کو جدید تعلیم یافتہ طبقے کے لیے نہایت مفید قرار دیا گیا ہے۔ مولانا دریابادی چونکہ خود تشکیک و الحاد کے دور سے گزر چکے ہیں اس بے راہ روی میں سب سے بڑا حصہ جدید تعلیم، فلسفیانہ اندازِ فکر اور مجرد عقلیت پرستی کا تھا اس لیے جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نفسیات کا ان سے بہتر نباض کون ہو سکتا تھا۔ مولانا نے اپنی تفسیر میں جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل کے چوروں کی نشان دہی کی ہے اور ان کا علاج و تدارک بھی پیش کیا ہے، تحقیقی اور تعلیمی نقطۂ نظر سے بھی تفسیر مولانا کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اس باب میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی رائے بہت اہمیت رکھتی ہے وہ لکھتے ہیں۔

> "تفسیر ماجدی کے بعد جن حضرات نے قرآن مجید کی تفسیر یا اس کی تفہیم کے سلسلے میں ان موضوعات پر لکھا ہے اس میں انھوں نے درحقیقت مولانا ہی کی خوشہ چینی کی ہے۔ مولانا کے خامہ زرنگار سے جو مضمون نکل گیا سدا بہار ہو گیا۔ لیکن علمی، تحقیقی اور ادبی حیثیت سے تفسیر ماجدی مولانا کا وہ عظیم الشان کارنامہ ہے جس کی آب و تاب وقت گزرنے کے ساتھ اور بڑھے گی اور آئندہ نسلیں شکر گزاری کے ساتھ انھیں یاد کریں گی۔"

لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ علم و ادب کا ذوق رکھنے والوں میں مولانا کے جن کمالات اور خصائص نے انھیں مقبول بلکہ محبوب بنایا ہے وہ ان کی ادبی تحریریں ہیں اور یہ عجیب بات ہے کہ شروع میں ان کا ذوق فلسفیانہ رہا۔ فلسفہ سے پیچھا چھوٹا تو مذہبیت نے ان پر قبضہ جما لیا، لیکن مجموعی طور پر ان کا تعلق زندگی بھر صحافت سے رہا۔ انھوں نے خود اعتراف کیا ہے کہ "خالص ادبی زندگی پہلے بھی نہ تھی اس دور میں فلسفہ غالب تھا اور بعد کو مذہب غالب آ گیا۔ ادبی حیثیت ضمنی اور ثانوی جب بھی رہی اور اب بھی ہے" لیکن ان کی خالص ادبی تحریریں بھی ان کی صحافتی اور فلسفیانہ و مذہبی تحریروں سے کم نہیں ہیں۔ یوں تو ان کی ہر قسم کی تحریریں اپنا بلند پایہ ادبی معیار رکھتی ہیں لیکن ان کی ادبی تحریریں واقعی اردو ادب کا شاہکار ہیں۔ ان تحریروں میں ان کی زبان، اسلوب اور فکر و انشا کی معجز نمائیاں حدِ کمال کو پہنچ گئی ہیں۔ انھوں نے بے شمار تنقیدی مضامین بھی لکھے اور آخر عمر تک وہ کتابوں پر جو مختصر تعارفی

نوٹ لکھا کرتے تھے وہ تبصرہ نویسی کی نہایت عمدہ مثالیں ہیں۔ وہ چند سطروں میں کتاب کی خوبیوں اور خامیوں کا اظہار کرتے تھے اور یہ جملے ادب و انشا کا شاہکار ہوتے تھے۔ ادب کے یہ شہ پارے ابھی مرتب کرنے کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی لیکن جو چیزیں ابھی تک مرتب ہو کر عوام و خواص سے خراج تحسین وصول کر چکی ہیں اور جن کے وجود نے مولانا کی انشا پردازانہ حیثیت کو مستحکم اور ایک نقاد کی حیثیت سے مولانا کی شخصیت کو تسلیم کرا لیا ہے ان میں سے انشائے ماجد، مضامین ماجد، مقالات ماجد، نشریات ماجد، مثنوی بحر المحبت (از انشا) کی ترتیب اور اس کا مقدمہ وغیرہ خاص طور پر اہمیت رکھتی ہیں۔

مولانا دریابادی کے چونکہ وقت کے تمام مشاہیر اہل علم و ادب سے تعلقات تھے پھر یہ کہ انھوں نے ایک نہایت کامیاب صحافیانہ زندگی گزاری تھی اس لیے انھیں بہت بڑے بڑے لوگوں سے مراسلت کا موقع ملا تھا اور اس طرح ان کے پاس مکاتیب کا بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا۔ ان تمام خطوط کی ترتیب و اشاعت کا تو انھیں موقع نہیں ملا لیکن مولانا سید سلیمان ندوی، اکبر الہ آبادی، مولانا شبلی، مولانا محمد علی وغیرہ کے خط انھوں نے کئی مجموعوں میں شائع کر دیے ہیں ان کی دو کتابیں اور جو بہت پسند کی گئیں وہ "سفر حجاز" اور "ڈھائی ہفتہ پاکستان میں" ہیں۔

لکھنؤ کی ادبی صحبتوں کا اثر تھا کہ شاعری کے کوچے میں بھی قدم رکھا۔ اور اگرچہ شاعری میں وہ نہ کامیاب ہوئے نہ شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوتے لیکن اس کوچے کے راہ و رسم سے ناواقف بھی نہ تھے۔ شاعری کے شوق کا زمانہ وہ ہے، جب مذہب کی طرف نیا نیا رجحان پیدا ہوا تھا۔ اور قوالی کا ذوق مزاج میں رچ بس رہا تھا چنانچہ قوالی کے طرز پر کچھ کلام کہا۔ مولانا محمد علی کی نعتیہ غزلوں سے بھی متاثر ہوئے اور ان پر تضمین کی۔ کچھ چیزیں قوالوں کی بدولت عوام تک پہنچیں اور خوب واہ واہ ہوئی۔ لیکن مولانا نے بہت جلد محسوس کر لیا کہ قدرت نے انھیں شاعری کے لیے نہیں بلکہ نثر نگاری کے لیے پیدا کیا ہے۔ خود ان کا ادبی ذوق اتنا پاکیزہ اور تنقیدی شعور اتنا بلند تھا کہ خود اپنی نظر میں اپنا کلام نہ جچا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کلام محفوظ بھی نہ رہا ممکن ہے تلاش سے الناظر لکھنؤ اور اس دور کے دوسرے اخبارات و رسائل میں کچھ دستیاب ہو جائے۔ ادبی تحریروں میں "زود پشیماں" کے نام سے ایک ڈرامہ ۱۹۱۰ء کی یادگار ہے۔ استاد مکرم پروفیسر سید حسنی احمد ہاشمی نے مولانا کی تصانیف کی ایک فہرست ۱۹۶۵ء میں مرتب کی تھی اس میں مولانا کی ۴۳ کتابوں کے نام درج ہیں۔ گزشتہ چند برسوں میں بھی مولانا کی کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔

افسوس کہ اردو کا یہ سپاہی، مسلمانوں کا یہ محسن، اردو ادب کی یہ مایۂ ناز شخصیت، بے مثال ادیب اور انشا پرداز، بلند پایہ صحافی، بہت بڑا مفسر اپنے وطن مالوف دریاباد میں ۶ر جنوری ۱۹۷۷ء کو اس دار فانی سے رخصت ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

(۲)

مولانا دریابادی کی کئی حیثیتیں تھیں اور وہ اپنی ہر حیثیت میں ایک ممتاز مقام کے مالک تھے وہ ایک صاحبِ نظر فلسفی تھے۔ اگرچہ فلسفے کا ذوق دینی ذوق میں اضافہ کے ساتھ گھٹتا رہا تھا اور دور آخر میں تو ان کی فلسفے سے دلچسپی بہت کم ہو گئی تھی۔ وہ بڑے کامیاب صحافی تھے۔ انھوں نے حقیقت، ہمدرد، سچ، صدق اور صدق جدید میں بڑی کامیاب اردو صحافت کے نمونے چھوڑے ہیں آخر الذکر تین کلیتاً انھی کی ملکیت اور انھی کے زیر ادارت تھے۔ ان کے شذرات خاص طور پر مشہور تھے اور بڑے ذوق اور دلچسپی کے ساتھ پڑھے جاتے تھے، وقت کی سیاسی، سماجی، ادبی، تعلیمی، تہذیبی مسائل پر ان کے خیالات، ان کا اسلوب خامے کی چیز ہوتے تھے۔ نئی کتابوں پر ان کی تنقید اور تبصرے، نہ صرف کتاب کے تعارف میں بلکہ اپنے ایجاز، بلاغت، فکر آفرینی اور نکتہ سنجی میں لاجواب ہوتے تھے۔ وہ نہایت مختصر لفظوں میں کتاب کی خوبیوں اور خامیوں کی نشان دہی کر دیتے تھے۔ ان کے رسائل اخبار و معلومات کے لیے نہیں، صرف ان کے شذرات (سچی باتیں) اور نقد و تبصرہ کے لیے پڑھے جاتے تھے۔

مولانا دریابادی ایک نامور مفسر بھی تھے۔ وہ چونکہ زندگی کے ابتدائی دور میں فلسفہ گزیدہ رہ چکے تھے اور تشکیک و الحاد کی مختلف منزلوں سے گزر کر ایمان و یقین کی لذت آشنا ہوئے تھے اور جدید تعلیم اور افکار و فلسفہ کی ان کمین گاہوں سے بخوبی واقف تھے، جہاں سے چھپ کر، خاموشی سے ایمان و یقین پر حملہ کیا جاتا ہے، جدید نفسیات بھی چونکہ ان کا موضوع رہا تھا، اس لیے انھوں نے اپنی تفسیر میں ان پہلوؤں اور گوشوں کو خاص طور پر نمایاں کیا ہے اور اس چیز نے اردو (اور انگریزی) کے تفسیری لٹریچر میں ان کی تفسیر کو نمایاں مقام کا حامل بنا دیا ہے۔

مولانا دریابادی کی ہر تحریر اگرچہ ادبی خصائص کی حامل ہوتی تھی لیکن خالص ادبی موضوعات پر اور تنقیدی مضامین بھی انھوں نے کچھ کم نہیں لکھے۔ بعض مثنویات بھی تحقیقی تنقیدی شان سے مرتب کیں۔ ان کے شذرات (سچی باتیں) کا ذکر ادب کے خاص شہ پاروں کے ضمن میں ضرور ہونا چاہیے۔ مولانا دریابادی اردو کے عدیم المثال ادیب اور انشا پرداز تھے۔ زبان پر عبور اور اس کی

باریکیوں پر نظر رکھتے تھے۔ الفاظ کے جوہر شناس تھے اور اِس دور میں رعایت لفظی، مراعاۃ النظیر، حسنِ تعلیل، محاورہ اور روزمرّہ اور لکھنوی اسکول کے خاص مختارات، ضلع جگت وغیرہ کے استعمال میں وہ اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ طنز کے وہ بادشاہ تھے اور ان کی تحریروں میں طنز کی بہترین مثالیں ملتی ہیں۔

ان کی ادبی تحریروں کا بہت بڑا حصہ خطوط کی شکل میں ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں اپنے بزرگوں، خوردوں اور برابر والوں کو جو خطوط لکھے تھے، ان کی تعداد ہزار کی دہائیوں میں شمار کی جائے گی۔ خطوط کے دو مجموعے چھپ چکے ہیں، تیسرا مجموعہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس میں ان کے بہت سے نئے خطوط بھی شامل ہیں اور ابھی ہزارہا خطوط ان کے ذاتی ذخیرے میں موجود اور اخبارات و رسالوں میں منتشر اور وقت کے اہلِ علم و اصحابِ نظر نے سرمایۂ دل اور حرزِ جاں بنا رکھے ہیں۔

خطوط نگاری میں ان کا ایک خاص اسلوب ہے۔ اس طرزِ نگارش میں وقت کا کوئی ادیب اور انشا پرداز ان کا شریک نہیں۔ انھوں نے جو خاص اسلوب اور طرزِ انشا ایجاد کیا تھا وہ ان کے ساتھ اپنا کوئی مقلد چھوڑے بغیر صفحۂ دہر پر نقش ہو گیا۔ ان کا اسلوب اب شاید کوئی اختیار نہ کر سکے گا، اس لیے کہ اب نہ کسی میں زبان کا وہ ذوق پایا جاتا ہے، نہ زبان پر نظر و عبور کا وہ عالم ہے، نہ کسی کے علم و مطالعہ میں وہ گہرائی و گیرائی ہے اور اس لیے کہ وہ دور بیت گیا جب مختلف علوم و فنون کی جامع شخصیات پیدا ہوتی تھیں اور وہ سانچے ٹوٹ گئے جن میں اخلاق و تہذیب اور ذوقِ علمی و ادبی کی جامع صفات و جامع جہات شخصیات ڈھلا کرتی تھیں۔

اردو خطوط نگاری کی تاریخ اور مختلف ادبا و فضلا کے خصائصِ نگارش پر نظر ہو تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا دریابادی اس میدان میں، اپنے خصائص میں منفرد ہیں۔ ان کے خطوط کے جو دو مجموعے مکتوباتِ ماجدی اور رقعاتِ ماجدی شائع ہوئے ہیں، وہ اپنی خوبیوں میں بے مثال ہیں۔

مکتوباتِ ماجدی۔ ان کے عزیزوں نے مرتب کیا ہے۔ اس میں ان خطوط کا انتخاب ہے، جو انھوں نے اپنے بزرگوں، دوستوں، عزیزوں اور خوردوں کو لکھے تھے اور جن کی نقول مولانا کے ذخیرۂ علمی میں محفوظ رجسٹروں میں موجود تھیں۔ یہ خطوط بین الدفتین دو حصوں میں ہیں۔ پہلے حصے کا عنوان "دل آویز خطوط" اور دوسرے حصے کا نام "دل دوز خطوط" ہے۔ یہ خطوط تاریخی ترتیب سے مرتب کیے گئے ہیں۔ حصہ اوّل کے خطوط علمی، ادبی، لسانی، مذہبی، تاریخی افکار اور بعض نج کے مسائل سے پُر ہیں۔ ان میں معلومات کے ایسے جواہر ہیں کہ تاریخ ادب و زبان اور مذہبی لٹریچر کے ہزارہا صفحوں کے مطالعے کے بعد بھی ان میں بہ مشکل بعض تک رسائی ہو سکے گی۔ دوسرے حصے میں جو خطوط

ہیں وہ عزیزوں، دوستوں، نیازمندوں وغیرہ کو ان کے متعلقین کے انتقال پر یا ان کے متعلقین کو ان میں سے کسی کے انتقال پر لکھے گئے تھے۔ ان دونوں حصوں کے خطوط کے مطالعے سے مولانا کی جو تصویر ذہن میں بنتی ہے، وہ نہایت سنجیدہ، متین، بزرگ، مشفق، ہمدرد، غم گسار اور زیادہ سے زیادہ ایک شائقِ علم و معلومات اور محققِ زبان اور صحتِ الفاظ و محاورہ کے جویا کی ہے۔ حصہ اوّل میں افکار و مسائل کے تنوع کے باوجود سنجیدہ فضا قائم رہتی ہے۔ حصہ دوم میں چونکہ تمام خطوط تعزیتی ہیں، اس لیے ان میں مضمون کی اتنی یکسانیت ہے کہ کسی کے ماں، باپ، بھائی، بیوی، بیٹے کے انتقال کے چند خطوط پڑھ چکنے کے بعد آگے بڑھتے ہیں تو پڑھے ہوئے کو پڑھنے کا احساس ہوتا ہے۔ دوسروں کے ایسے خطوط کے مقابلے میں ان میں اسلوب کی ندرت بلاشبہ اپنے اندر ایک کشش رکھتی ہے۔

مولانا دریابادی کے خطوط کا دوسرا مجموعہ "رقعاتِ ماجدی" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس میں نہ صرف رنگا رنگ افکار ہیں، بلکہ اس میں مولانا کے نفس و اخلاق کی بلندی، ذہن و دماغ کی رنگا رنگی، معاصر شخصیتوں کے بارے میں ان کے آرا اور نفرتوں اور محبتوں کا بھی پتا چلتا ہے۔ اوّل الذکر مجموعے کے خطوط چونکہ ذوقِ مجلس آرائی کی تسکین کے لیے لکھے گئے تھے اور دوسرے مجموعے کے خطوط چونکہ خلوت کے راز و نیاز کی باتوں پر مشتمل ہیں۔ ان میں مخاطب پر یہ اعتماد جھلکتا ہے کہ وہ ان اسرارِ درونِ پردہ کو افشا نہ کرے گا۔ ایسے خطوط میں بعض ایسی باتیں بھی زبانِ قلم پر آ جاتی ہیں جو یا تو دل کا بخار نکالنے کے لیے ہوتی ہیں یا تفننِ طبع کے طور پر کبھی زبانِ قلم پر آ جاتی ہیں۔ لیکن ان کے گھٹیا اور غیر ذمہ دارانہ ہونے پر اس کا اپنا دل بھی گواہی دیتا ہے۔ اگر ایسے موقع پر کوئی سنجیدہ اور نہ بزرگانہ سہی کم از کم برابر کی شخصیت اور مخلص دوست مخاطب ہو اور وہ ٹوک دے کہ یہ بات آپ کے شایانِ شان نہیں، تو وہ خود، نہ صرف خجل ہو جائے بلکہ مخاطب کا شکر گزار بھی ہو اور اگر کسی خط یا تحریر میں ہو جو چھپی نہ ہو تو وہ اسے فوراً قلم زد کر دے۔ البتہ کوئی ناشناسِ تہذیب اور مقلدِ محض مخاطب ہو تو اس کی زبان پر بے ساختہ واہ وا اور سبحان اللہ کی صدا سے تحسین و آفرین آ جائے گی۔ ترتیب و تدوین مقصد ہو تو اس پر کوئی تائیدی حاشیہ چڑھا کر اس مردم مکتوب نگار کی رسوائی کا سر و سامان خود اپنے ہاتھوں سے محنت اٹھا کر جمع کر دے گا۔

دوسرے مجموعے میں متعدد مضامین ایسے ہیں جو حضرت مولانا دریابادی کی شان، عفیفانہ ثقاہت اور مومنانہ وقار اور سنجیدگی کے خلاف ہیں مناسب ہوتا کہ فاضل مرتب ایسے جملوں کو حذف

کر دیتے جیسا کہ مولانا مرحوم کا اپنا شعار تھا فاضل مرتب نے غور نہیں فرمایا اور انھیں جوں کا توں چھاپ دیا۔ بلکہ ان پر حاشیوں میں مضمون کی سنگینی کو اور نمایاں کر دیا۔ لیکن وہ اصحابِ ذوق مولانا دریا بادی کے محققوں، زبان و ادب کے شائقوں اور مشاہیر علم و ادب کے خطوط سے دل چسپی رکھنے والوں کے نزدیک بہت شکریے کے بھی مستحق ٹھیرے ہیں۔ اگر یہ خطوط من و عن شائع نہ ہوتے تو مولانا دریا بادی کے افکار و آرا اور نفس و اخلاق کے مطالعے کا ایک بڑا اور وسیع میدان نظروں کے سامنے نمایاں نہ ہوتا، اور ہم یہ معلوم نہ کر سکتے کہ مکتوب نگار کا قلب محبتوں ہی کا نہیں نفرتوں کا بھی خزینہ ہے، ان کی زبان دعاؤں ہی سے نہیں دشنام سے بھی آشنا ہو سکتی ہے، ان کا قلم اپنے خوردوں کے لیے دعاگو کے الفاظ ہی رقم نہیں کرتا اپنے معاصر کے لیے سب و شتم کے نقش و نگار بھی بنا سکتا ہے، کسی بات پر ان کا دماغ ہی مشتعل نہیں ہوتا بلکہ دل میں کدورت بھی جگہ پا سکتی ہے۔ اس مجموعے کے ان خصائص نے ادب میں ان خطوط کی اہمیت اور مکتوب نگار کے شخص اور افکار و اخلاق کے مطالعے میں ان کی افادیت کو بہت بڑھا دیا ہے۔ اس اعتبار سے مکتوباتِ ماجدی پر رقعاتِ ماجدی کی فوقیت قائم ہو جاتی ہے۔

اس مجموعے کے بعض خطوط میں سید سلیمان ندوی کی زندگی کے بعض گوشوں، خصوصاً مولانا اشرف علی تھانوی سے بیعت کے بعد ان کے ذوق دینی میں انقلاب اور ان کی علمی زندگی میں جو زوال آیا تھا، بلکہ اس کا جو اندوہناک خاتمہ تھا، اس پر روشنی پڑتی ہے۔ مولانا دریا بادی کی اس بارے میں رائے نہایت قیمتی ہے۔

فاضل مرتب نے اس مجموعے کا نام "رقعاتِ ماجدی" رکھا ہے۔ انھوں نے غور نہیں فرمایا کہ اردو میں "رقعہ" کا ایک خاص مفہوم ہے اور مولانا دریا بادی کے یہ خطوط، خطوط ہیں، رقعات نہیں۔

یہاں میں نے "رقعاتِ ماجدی" کی جس خوبی کی طرف اشارہ کیا ہے، اسے مثالوں سے واضح کرنا مناسب نہیں۔ اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے مجموعے ہی کا مطالعہ کرنا چاہیے البتہ اس مجموعے (خطوطِ ماجدی) میں رقعاتِ ماجدی کا ایک خط بہ طورِ نمونہ شامل کر لیا ہے، اس سے اس گلستان کی بہار کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اس مجموعے میں کچھ خطوط مکتوباتِ ماجدی سے اور بیشتر خطوط اخبارات و رسائل سے

جمع کر کے مرتب کر دیے ہیں، اس کے بعد بھی بے شمار خطوط مختلف مجموعوں، رسالوں وغیرہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے لیے ایک اور مجموعۂ مکاتیب کا انتظار کرنا چاہیے۔

اس مجموعے کے خطوط سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس میں نہ مکتوباتِ ماجدی کی طرح سنجیدہ فضا ہے نہ رقعاتِ ماجدی کی طرح صرف خلوت کی باتیں ہیں، بلکہ یہ مجموعہ مولانا دریا بادی کی خطوط نگاری کی تمام خوبیوں کا جامع ہے۔

خطوط

مولانا غلام رسول مہر (لاہور)

(۱)

برادرم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مدرسۃ الیتامیٰ، مدینہ منورہ کی ایک رپورٹ ارسال خدمت ہے۔ اگر "انقلاب" میں اس کے تذکرہ کے لیے وقت و گنجائش نکل سکے تو میری ممنونیت کے علاوہ مدینہ طیبہ کی بھی ایک خدمت کا اجر حاصل ہو جائے گا۔ والسلام

عبدالماجد دریاباد، ۱۲ اگست ۲۹ء

(۲)

مولانا مہر مرحوم مسلم کانفرنس میں شرکت کے لیے لکھنؤ گئے تھے اور سیسل ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ مولانا دریابادی نے "ہاؤس آف لارڈز" اسی کو کہا ہے مولانا ظفر الملک علوی اس زمانے میں قید تھے۔ راجہ صاحب سے مراد راجہ صاحب سلیم پور ہیں۔

برادرم السلام علیکم ورحمۃ اللہ

اتفاق سے کل صبح سے اپنی ذاتی ضروریات سے میں بھی لکھنؤ آیا ہوا ہوں ابھی محض اتفاقیہ مولوی غلام محمد تملوی سے معلوم ہوا کہ آپ یہیں رونق افروز ہیں۔ آپ اس وقت تو ماشاء اللہ "ہاؤس آف لارڈز" میں ہیں، وہاں مجھ گمنام و گوشہ نشین کی کہاں گزر اور نہ اب اس قسم کے جلسوں وسوں سے مطلقاً دلچسپی باقی رہی ہے البتہ آپ سے ملنے کو بے اختیار جی چاہتا ہے۔

ایک ایکسپریس ٹرین یہاں سے لاہور کے لیے ۔ا بجے شب کو چھوٹتی ہے۔ اگر اس میں تشریف لے جانا ہے تو چھ بجے چائے غریب خانہ پر نوش فرمائیے، اگر خدانخواستہ ۹ بجے کے میل ہی سے جانا قطعی ہو تو پھر میں اسٹیشن ہی پر ملاقات کی کوشش کروں۔ "کوشش" اس لیے کہہ رہا ہوں کہ آج دو بجے کا وقت جیل میں ظفر الملک صاحب سے

ملنے کا مقرر ہوا ہے وہاں سے بروقت واپسی اپنے اختیار کی چیز نہیں۔

یہاں میں دفتر "سچ" میں نہیں بلکہ ایک ذاتی مکان، موسوم بہ "خاتون منزل" (سابق ملازمت ندوۃ العلماء قریب قبر بادشاہ) بجانب میں مقیم ہوں۔ راجہ صاحب کے ہاں کا شوفر اس پتہ سے پہنچا دیں گے۔ بشرطیکہ آپ شام تک ٹھہریں۔ اگر اس میں بھی زحمت ہو تو اس وقت آپ کی رہبری کے لیے میں آدمی بھیج دوں۔

مولانا شبلی مرحوم غزل بہت کم کہتے تھے۔ ان کی غزل کا شعر اس وقت یاد آرہا ہے ؎

شبلی کا گھر بھی خانۂ دشمن کے پاس ہے\
محشر خرام! اور بھی دو اک قدم سہی !!

والسلام

عبدالماجد دریابادی\
۲۹ جون ۳۰ء

(۳)

وعلیکم السلام

یورپ ابھی ماہیت خواب کے بارہ میں خود ہی متفق نہیں ہے۔ ان کے اطباء کا ایک بڑا گروہ اس کا قائل ہے کہ حالت نوم کی کیفیت دماغی کا نام خواب ہے سائیکالوجی کے قدیم ماہرین یہ کہتے تھے کہ حالت نوم میں جس قسم کی پیش نظر ان پر حاوی ہو جاتے۔ انہیں کے مطابق مگر زیادہ مبالغہ آمیز صورت و اشکال کے ساتھ مناظر خواب نظر آتیں گے۔ آج کل اس وقت سب سے زیادہ مقبول نظریہ آسٹریا کے نامور سائیکالوجسٹ (Trend) کا ہے کہ "Dream is the fulfilment of supperssed wis" یعنی حالت بیداری میں جو خیالات، جذبات وخواہشات بوجہ (Consciousness) کے سامنے آتے ہوئے خود جھکپاتے ہیں، وہ حالت نوم میں شعور مخفی (Sub-Consciousness) کے سامنے ابھر آتے ہیں اور یہی خواب ہے۔

اسلام نے کہیں یہ تصریح ماہیت خواب بیان نہیں کی ہے قرآن کے مطالعہ سے تین قسم کے خواب متبادر ہوتے ہیں،

۱۔ اضغاث احلام۔ محض خیالات پریشان، جس طرح بیداری میں اکثر بے سروپا خیالات آتے رہتے ہیں۔

۲- خواب مبنی بر حقیقت یا تعبیر طلب۔ مثلاً شاہِ مصر کا خواب یا یوسفؑ کے رُفقائے زندان کا خواب جس شخص کا قلب و نفس جس قدر زائد مطہر و مزکی ہوگا، اسی قدر ان خوابوں کے معنی سمجھ سکے گا۔

۳- انبیاءؑ کا خواب۔ مثلاً حضرت خلیل اللہ کا اپنے صاحبزادہ کو ذبح کرتے دیکھنا جو بمنزلہ وحی کے ہوتے ہیں۔ حدیث میں رویائے صادقہ و صالحہ کو اجزاء نبوت میں سے ایک جُز قرار دیا گیا ہے۔ یہ بھی حدیث میں وارد ہوا ہے کہ جو شخص جس قدر زیادہ راست گو ہوگا، اسی قدر صحیح خواب دیکھے گا۔

میری فہم ناقص میں یہ آتا ہے کہ بعض حقائق غیبی پر بیداری کی فعلیت حواس ظاہری، پردہ ڈالے رہتی ہے۔ بحالتِ نوم میں جب یہ فعلیت حواس رُک جاتی ہے اور قلب کو یکسوئی کا موقع ملتا ہے، تو بعض دفعہ وہ حقائق اپنے تئیں بے نقاب کر دیتے ہیں۔ صوفیہ کرام، بجائے خواب کے مراقبہ وغیرہ کے ذریعہ سے یہ کیفیت بالقصد اپنے اُوپر طاری کر لیتے ہیں۔ ہپناٹزم، کلیروانس وغیرہ انہیں کیفیات عالیہ کے نقوشِ سفلیہ ہیں۔ والسلام

عبدالماجد، دریاباد - ۱۶ر جون ۳۴ء

(۴)

چودھری محمد حسین مرحوم نے حضرت علامہ کے مکاتیب کی فراہمی کا انتظام کیا تھا۔ اس سلسلے میں مولانا عبدالماجد کو مہر صاحب نے خط لکھا تھا۔ مولانا نے خطوط بھیج دیے۔ ساتھ ہی فرمایا کہ صاف نقل میرے پاس آجائے تو میں حواشی لکھ دوں گا۔ مشرقی سے مراد علامہ مشرقی ہیں۔ اور اس جگہ لیگ کی طرف اشارہ ہے جو علامہ مشرقی اور یوپی کی کانگریسی حکومت کے درمیان تقسیم سے پیشتر ہوا تھا۔ "انقلاب" نے اس سلسلے میں مشرقی کی حمایت کی تھی۔

برادرم السلام علیکم

حضرت اقبالؒ کے جو مکاتیب منگوائے گئے، حسب ارشاد حاضرِ خدمت ہیں۔

چودھری محمد حسین صاحب سے بڑھ کر اہل اس خدمت کا اور کون ہوگا، لیکن بہرحال عجلت ہونی چاہیے اب بھی تاخیر بہت زائد ہو چکی ہے۔

ان مکتوبات کی اصل جب مجھے واپس مرحمت ہو تو بہتر یہ ہوگا کہ ان کی صاف شدہ نقل بھی

ساتھ آئے تاکہ میں جا بجا ان پر حواشی لکھ دوں۔ خطوط کی تلمیحات و اشارات تو صرف مکتوب الیہ ہی سمجھنے والے ہوتے ہیں۔ والسلام

عبدالماجد، دریاباد - ۴ر اکتوبر ۳۹ء

کانگریسی حکومت سے مقابلہ ضرور کیا جاتا، لیکن اس کے لیے صحیح ...... کی گئی ہے جو خواہ مخواہ مشرقی ہی کی ہمدردی کا غلط سہارا ڈھونڈا جاتا۔ آپ کے اخبار میں قاضی قدوۃ کو عہدِ جہانگیری کا عالم بتایا گیا ہے، قاضیؒ کا زمانہ اس سے بہت قبل کا ہے۔ ہم قدوائیوں کی خاندانی روایات کے بموجب، حضرت قاضیؒ، خواجۂ اجمیر کے ہمعصر تھے۔

(۵)

دریاباد

۱۰ر ستمبر ۱۹۵۹ء

بسم اللہ

کرم گستر! السلام علیکم

"نقش آزاد" کے تبصرے او تذکرے فلاں اور فلاں پرچے میں دیکھ کر مصدق کی زبان سے

ع ہم سے پردہ رہا غیروں سے ملاقات رہی

والسلام دعاگو و دعاخواہ:
عبدالماجد

(۶)

دریاباد

۱۹ر اگست ۱۹۶۵ء

بسم اللہ

برادرم و مہر عالم! وعلیکم السلام

مولانا[1] کے کس مقالے متعلق "مریم زمانی" کا علم مجھے آج پہلی بار آپ سے ہوا۔ یہ میرے ذہن میں بالکل نہ تھا۔ عزیز کا دیوان "گل کدہ" اسی زمانے میں نکلا۔ مولانا نے اس کے دو لفظوں "مستی" اور "تحریک" پر گرفت کی تھی کہ ان میں پہلوئے ذم نکلتا ہے (یہ پہلوئے ذم کی بحث خالص لکھنوی مذاق کی تھی) اور حیرت ہے کہ مولانا نے صرف چند ماہ کے قیام لکھنؤ میں ان باریکیوں پر بھی عبور حاصل کر لیا تھا۔ عزیز خود مستند اہل زبان تھے ان غریب کو بھی وہ نکتے نہ سوجھے جو مولانا کو سوجھ گئے تھے۔ بحث میں حصہ مشوق حسن صاحب اطہر ہاپوڑی (شاگرد داغ) اور شاعروں اور ادیبوں نے بھی لیا تھا کچھ مضمون "مخزن" میں نکلے تھے اور کچھ ایک مضمون لکھنؤ کے رسالہ

[1] مولانا سے مراد مولانا ابوالکلام آزاد ہیں۔

صبح اُمید (ایڈیٹر) بکبست لکھنوی امیں لوہب کے فرضی نام ہے۔

اس رسالہ کی جلدیں لکھنؤ کی جس لائبریری میں بھی اتفاق سے اس کی [illegible] اس وقت موجود ہے اس لیے کتابیں فوراً انہیں نکل سکتی ہیں۔

کراچی کے ابو سلمان[2] صاحب تو ابوالکلامیات کے ماہر ہیں ان سے دریافت فرمایئے میرے خط کا تو شاید جواب نہ دیں معتوب نہ ہوتا تو خود ہی لکھتا۔

مسودہ کی واپسی کا منتظر ہوں۔[3]

والسلام عبدالماجد

ایک مظلوم بیوہ اور اس کا بھائی

مولانا دریابادی کے یہ خطوط اور الم ناک داستان مولانا دریابادی کی مطلقہ اور مولوی عبدالرحمن نگرامی کی بیوہ کی طرف سے "عبدالماجد دریابادی بے نقاب" کے عنوان سے ایک کتابچے کی صورت میں چھاپ دی گئی تھی اس سلسلے کا ایک خط خواجہ حسن نظامی کے نام ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کی زندگی کا یہ نہایت اہم اور افسوس ناک واقعہ ہے۔ مولانا کے دیوانوں کے حلقے سے لوگوں نے پوری کوشش سے اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔ لیکن ایک سیرت نگار اور تحقیق کا ذوق رکھنے والے کے لیے اس واقعے سے آنکھیں بند کرکے گزر جانا ممکن نہ تھا۔ پروفیسر تحسین فراقی کے ذوق تحقیق و تالیفِ سیرت نے اسے ڈھونڈ نکالا۔ آں موصوف کے شکریے کے ساتھ یہاں اسے شامل کیا جاتا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

میری شادی تیرہ سال کی عمر میں میرے حقیقی ماموں زاد بھائی مولانا عبدالرحمن صاحب ندوی نگرامی مرحوم سے ہوئی تھی۔ شادی کے چھٹے سال مولانا موصوف کا انتقال ہو گیا[4] اس وقت میری عمر ۱۹ سال کی تھی اور میری گود میں دو سال کی ایک بچی بھی تھی جس کا نام آصفہ ہے۔ شوہر کے انتقال کے تقریباً تین سال بعد میرے والدین کو میرے

---

[1] ابو سلمان سے مقصود ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری ہیں۔ [2] سید سلیمان ندوی، مولانا آزاد اور الہلال میں ان کے مضامین سے متعلق مہر صاحب نے ایک خط لکھا تھا۔ مولانا دریابادی نے صدق میں شائع کرنے کی اجازت چاہی، مہر صاحب نے وہ خط واپس منگوا کر اشاعت کے نقطۂ نظر سے اس پر ایک نظر ڈال لی۔ اس وقت یکم بخط (مسودہ) واپس ذہنی انتقال پر جب پہنچا تو اس کی اشاعت مناسب نہ سمجھی گئی۔ [3] ۲ مارچ ۱۹۲۶ء کو نماز فجر کے بعد ہرا رچ میں انتقال ہوا، جہاں وہ اپنے ایک عزیز کے پاس جو طبیب بھی تھے علاج کے لیے گئے تھے۔ نعش نگرام لے جائی گئی وہیں تدفین ہوئی انتقال کے وقت عمر کل ستائیس سال کی تھی۔ مرحوم ندوہ کے ذہین ترین فرزند تھے نیکی اور شرافت کا مجسمہ اور حلقۂ ندوہ کی محبوب شخصیت۔ [4] سید سلیمان ندوی نے "یادِ رفتگاں" میں اور مولانا دریابادی نے "معاصرین" میں محبت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

نکاحِ ثانی کی فکر ہوئی۔ مختلف جگہوں سے پیام بھی آئے لیکن کوئی قابلِ اطمینان نہ تھا۔ مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی جو بہت سی کتابوں کے مصنف اور اخبار "سچ" کے مالک اور ایڈیٹر ہیں میرے مرحوم شوہر کے بڑے گہرے دوست بنے ہوتے تھے اور مرحوم کے انتقال کے بعد سے ہم لوگوں کے ساتھ ہمدردی اور خلوص کا اظہار کیا کرتے تھے اس لیے ہم لوگ ان کو نہایت نیک خصلت، سلیم الطبع اور بزرگ جانتے تھے۔

میری بیوگی کے کچھ عرصہ کے بعد مولوی عبدالماجد اور میرے بڑے بھائی منشی حبیب الرحمن صاحب کے درمیان میری شادی کی بابت خط و کتابت شروع ہوئی اور انہوں نے میرے عقد ثانی کے لیے سخت سے سخت تقاضا کیا جس کی تفصیل کی اس مختصر تحریر میں ضرورت نہیں۔

اس کے بعد عبدالماجد کا ایک خط آیا جس میں انہوں نے لکھا "ڈرتے ڈرتے ایک صاحب کا نام پیش کرتا ہوں، ایک صاحب ایم۔ اے [illegible] ہیں گئے ہوتے دوسری بیوی کے خواستگار ہیں اگر سب لوگ منظور کریں تو بہتر ہے۔"

اس وقت میرے والد مرحوم زندہ تھے انہوں نے ایسے رشتے کو کسی طرح گوارا نہ کیا۔

ہمارے یہاں کے انکار پر عبدالماجد نے میرے بھائی کو کئی مرتبہ لکھا کہ اب [illegible] یعنی مجھ کو میری بیوی سے علاوہ جیسے ہم لوگوں سے جو ان کے تعلقات تھے اس کے موافق کوئی نامناسب بات نہ تھی اور مجھے کچھ شبہ تھا کہ میری تقدیر کچھ اور رنگ لانے والی ہے۔ میں اپنے چھوٹے بھائی اور بہن کو ہمراہ لے کر لکھنؤ گئی اور ان کی والدہ، بیوی اور بہن سے ملاقات ہوئی، ان سے مل آئی وہاں کسی قسم کی کوئی ایسی گفتگو نہیں ہوئی جس سے مجھے کچھ عبدالماجد کے دل کا حال معلوم ہوتا۔

اُن لوگوں سے ملے ہوئے مجھے مشکل سے دو ہفتے گزرے ہوں گے کہ عبدالماجد کا ایک مفصل خط چار صفحے کا خط بھائی صاحب کے نام آیا جس کا خلاصہ مطلب یہ ہے "آپ کی بہن [illegible] ہوئی ہے وقت ان کی [illegible] گفتگو میں کچھ الفاظ و انداز [illegible] ایسے استعمال کیے [illegible] زندگی کے ساتھی بھی ہوتے ہیں۔ بیان مرنے کے بعد کے اور وفادار دوست [illegible] سے میرے دل پر یہ اثر کیا اور میں سب سے پہلے [illegible] مجھے زیادہ محبوب ہے جیسی ملت [illegible] قسمت پچھلی کی جانب رکھ سکتا ہوں [illegible] طلب [illegible] تعلق سے [illegible] دل [illegible] ہوں لہٰذا امیرانہ ٹھاٹھ سے نہیں رہ سکتا۔ [illegible] میری بیوی

ے تعلقات ایسے خوشگوار ہیں کہ لوگوں کو رشک آتا ہے۔ میری اہلیہ بیمار بھی رہتی ہیں۔ عقدِ ثانی مسنون ہے۔"

یہ خط پڑھ کر بھائی صاحب نے مجھ سے شادی کی بابت رائے لی، میں نے انکار کر دیا لیکن بھائی صاحب اور والدہ صاحبہ نے سمجھا بجھا کر راضی کیا چنانچہ اکتوبر سنہ ۳۰ء میں میں عبدالماجد کی نفس پرستی کا شکار بنی۔ یہ شادی میرے سسرال والوں سے پوشیدہ طور پر دریاباد میں ہوئی تھی کیونکہ وہ لوگ غیر خاندان ہونے کی وجہ سے اس شادی کے سخت مخالف تھے۔ مہر صرف اکیاون روپے تھا۔ شادی کا ہونا تھا کہ عبدالماجد کے رجسٹری خطوط بکثرت مع تار آنے لگے جن میں یہی لکھتے رہے کہ جلد بھیجیں اعلان کے ساتھ دوبارہ نکاح کروں گا۔

چنانچہ میں اپنے چھوٹے بھائی کے ہمراہ مع اپنی بچی آصفہ کے دریاباد گئی وہاں اعلان کے ساتھ دوبارہ پھر نکاح ہوا۔ میرا قیام تقریباً ایک ماہ عبدالماجد کے یہاں دریاباد میں رہا۔ اب میری مصیبت کا آغاز ہوتا ہے۔

میرے دریاباد جانے کے دوسرے ہی روز میرے مرحوم شوہر کے چچا زاد بھائی مولوی مطلوب الرحمٰن صاحب میری بڑی آصفہ سلمہا کو گھرام لے جانے کی غرض سے دریاباد پہنچے۔ ان کو دیکھ کر آصفہ دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کے اس طرح کے رونے پر میری جو حالت تھی اس کا میری ہی جیسی بدنصیب عورت اندازہ کر سکتی ہے۔ میں نے اپنے غمگین اور درد بھرے دل کو سنبھالا اور اسے تسلی دے کر رخصت کیا۔ تقریباً ایک ماہ بعد عبدالماجد کی اجازت سے میں اپنی چھوٹی بہن کی شادی میں دریاباد سے سندیلے آ گئی کیونکہ اعزا اور سسرال والوں کے اختلاف کی وجہ سے ہم لوگوں کو وطن گھرام چھوڑنا پڑا اور سندیلہ میں جہاں میرے بڑے بھائی ملازم ہیں سکونت اختیار کرنی پڑی یہیں سے ۲۹ نومبر سنہ ۳۰ء کو میری چھوٹی بہن کی شادی بخوشی ادا کی گئی۔

سندیلہ میں تقریباً ڈھائی ماہ مجھے رہنا پڑا۔ اس عرصہ میں عبدالماجد کے خطوط میرے پاس بہت کم آتے تھے۔ میری طبیعت اکثر گھبراتی رہتی تھی۔ اس وجہ سے میں اور بھی جلد جلد خط بھیجا کرتی تھی۔ عبدالماجد نے مجھے لکھا "اتنی جلدی خط بھیجنے کی کیا ضرورت ہے ہفتے میں ایک بار خط آنا چاہیے"[1]۔ عبدالماجد کی اس تحریر سے مجھے رنج ضرور ہوا لیکن کیا کر سکتی تھی خاموش ہو گئی۔ اس کے بعد عبدالماجد نے کرایہ بھیج کر مجھے لکھا کہ اپنے بھائی کے ساتھ دریاباد چلی آؤ چنانچہ میں جنوری میں وہاں پہنچ گئی۔ دو ہفتہ کے بعد عبدالماجد نے مجھ سے کہا کہ

[1] اس میں زیادہ دخل ان کے انضباطِ اوقات کو ہوگا جیسے دریابادی نے لکھا ہے کہ شادی کے بعد بیوہ نگرانی نہ انھیں سیرۃً پسند آئی نہ صورۃً یہ بے رخی اسی کا نتیجہ ہو سکتی ہے (تحسین فراقی)

"میں باہر (حیدرآباد) جا رہا ہوں تم اپنے میکے چلی جاؤ" یہ الفاظ سن کر مجھے صدمہ ہوا اور میں نے کہا کہ میں ابھی سندیلہ نہیں جاؤں گی کیونکہ مجھے آئے ہی کتنے دن ہوئے ہیں۔

عبدالماجد کے بڑے بھائی عبدالمجید سہارنپور میں ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ انہوں نے بھی اس سے پہلے مجھے سہارنپور بلایا تھا۔ اس لیے عبدالماجد نے مجھے سہارنپور بھیج دیا۔ دو مہینے میں سہارنپور رہی۔ اس درمیان میں عبدالماجد کے خطوط ان کے بھائی عبدالمجید کے پاس تو برابر آیا کرتے تھے لیکن انہوں نے مجھے کوئی خط نہ لکھا ان کی بے رخی سے جو کچھ خیالات میرے دل میں پیدا ہوتے وہ ظاہر ہیں۔

تھوڑے دنوں کے بعد میرے بھائی صاحب نے مجھے بلانے کے لیے عبدالماجد کو خط لکھا۔ عبدالماجد نے بھائی صاحب کو جو جواب دیا قابل ملاحظہ ہے "میں نے تو مہینہ سوا مہینہ ہوا جب ہی دلہن یا آصفہ سے سندیلہ جانے کو کہا تھا لیکن انہوں نے خود ہی عذر کیا اور سہارنپور چلی گئیں" گویا اس کے یہ معنی ہیں کہ میں بغیر ان کی اجازت کے سہارنپور گئی حالانکہ یہ بالکل غلط ہے بلکہ عبدالماجد نے خود ہی مجھے سہارنپور بھیجا تھا — سہارنپور سے ماہ مارچ میں عبدالمجید صاحب مجھے راستہ میں سندیلے چھوڑتے گئے یہاں ایک ماہ تک عبدالماجد کا کوئی خط میرے پاس نہیں آیا میں روزانہ خطوط بھیجتی رہتی تھی۔ خدا خدا کر کے ایک خط آیا جس کے الفاظ یہ تھے "تمہارے جو خطوط میرے پاس آتے ہیں وہ خط ہی تو ہوتے ہیں یا کوئی تار ہوتے ہیں؟" اس کو دیکھ کر تو میرا دل ٹوٹ گیا — وہ خرچ کے لیے دس روپیہ ماہوار مجھے برابر بھیجتے رہے۔ جب سندیلہ آئے ہوئے مجھے چار ماہ ہو گئے تو میرے اضطراب اور بے چینی کی کوئی حد نہ رہی میں نے مجبور ہو کر خود ہی لکھا کہ میں دریاباد آنا چاہتی ہوں اس کے جواب میں عبدالماجد نے لکھا "ابھی موقع نہیں ہے جب موقع ہوگا بلا لوں گا" ماہ جون میں عبدالمجید صاحب نے میرے بھائی صاحب کو ایک گھنٹہ کے لیے سہارنپور بلایا جولائی میں بھائی صاحب گئے تو ان سے کہا کہ "عبدالماجد تو کچھ بولتے نہیں، ان کی بیوی (دلہن) کی صحت روز بروز خراب ہوتی جاتی ہے اس لیے ہم لوگوں کا ارادہ ہے کہ آپ کی بہن کو الگ کر دیا جائے" بھائی صاحب یہ الفاظ سن کر حیران رہ گئے ان کی عجیب حالت ہوئی۔ عبدالمجید کو انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور سندیلہ واپس آئے یہاں آ کر تمام واقعہ بیان کیا۔ کیا بتاؤں یہ الفاظ سن کر میری والدہ محترمہ کا کیا حال ہوا۔ اور اپنی حالت میں تحریر ہی نہیں کر سکتی لیکن ساتھ ہی اس کے مجھے پھر خیال ہوا کہ ممکن ہے انہوں نے مجھے علیحدہ مکان میں رہنے کے لیے کہا ہو۔ غرض میں اپنے درد بھرے دل کو طرح طرح سے تسلی دیتی رہی۔

اس کے چند ہی روز کے بعد طلاق نامہ آگیا۔ اس وقت میری عجیب حالت تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے مجھے اندھیری فضا میں پھینک دیا ہے میری نظروں میں تمام عالم سونا ہو گیا چاروں طرف گہری تاریکیاں نظر

آنے لگیں۔

باوجود اعزہ کے شدید اختلاف کے جو خطوط تعزیت میں آئے ان میں سے ایک خط میرے حقیقی ماموں مولانا محفوظ الرحمن صاحب کا ملاحظہ کے لیے نقل کیا جاتا ہے۔

نورِ چشم میاں حبیب الرحمن صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ

دعا ہا، خدا کرے تم خوش و خرم آباد رہو۔ کل علی گڑھ سے عزیزی فریدہ سلمہ کا خط زبانی اچھی سلمہ حالات سنو بلا سے پرغم والم موصول ہوا۔ کل سے اس وقت تک کئی بار تم کو خط لکھنے بیٹھا لیکن قلم نے یارا نہ دیا کہ تم کو کیا لکھوں۔ آہ، یہ خبر خبر نہ تھی بلکہ ایک صاعقہ تھی جس نے تن بدن کو جھلسا ڈالا۔ ابتداءً تم لوگوں کی کوتاہ فہمی اور تمہارے خوشتن کی رائے کے پابند ہونے نے معاملہ کو ایک ناگوار اور ذلت آمیز طریقے سے تکمیل کو پہنچایا۔ اب اس نااہل اور ناخدا ترس انسان نے اس خاندان کی عزت و افتخار پر زبردست کاری ضرب لگائی ہے۔ اگرچہ اس وقت جماعت آپ کے رسمی تعلقات ختم ہیں لیکن قدرتی واسطے کسی کے توڑنے نہیں ٹوٹتے۔ اس ناگوار حیز نے کل گھر بھر کو بے جان بنا دیا ہے۔ یقیناً کل روز قیامت یہ ظلم کا معاملہ رب العزت کے حضور پیش ہوگا پھر میاں ملجد دیکھیں وہاں کیا جواب دے کر سرخروئی حاصل کریں گے۔ ظلم کی ٹہنی ہری نہیں ہوتی۔ ان کو خدا کے غضب سے ڈرنا چاہیے تھا۔ آہ ثم آہ۔

ایسی نامبارک حالت میں ظاہر ہے کہ اہل معاملہ کا کیا حال ہوگا اور ان کی پریشانی کا اثر اس معصوم بچہ پہ کیا پڑتا ہوگا۔ ہر ایک کو اس واقعہ سے متاثر پاکر اس کے قلب نازک کی کیا کیفیت ہوگی۔ یہ نقشہ بہ وقت ہم لوگوں کے پیش نظر ہے اور مجھے خطرہ ہے کہ اس کی صحت پر اس کا ناگوار اثر پڑے گا۔ والدعا فقط

محمد محفوظ الرحمن عفی عنہ،

ادگم ہم ۲۵ر جولائی سنہ ۳۱ء

طلاق نامہ پہنچنے کے تقریباً ایک ہفتے کے بعد عبدالماجد کا ایک خط میرے نام آیا، اس میں لکھا تھا: "میں عرصے تک تمہاری خدمت جاری رکھوں گا اور میرا ارادہ ہے کہ تمہارا بچہ کسی شریف کے ہاتھ میں دے دوں گا۔" یہ خط پڑھ کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی لیکن کیا کر سکتی تھی۔ خون کا گھونٹ پی کر رہ گئی۔

اس کے بعد بھائی صاحب نے عبدالماجد کے پاس خط لکھا جس کا مختصر مضمون یہ ہے۔ کہ آپ نے ہم لوگوں کے ساتھ بدعہدی کی ہم لوگوں پر ظلم کیا اور بالکل ذبح کر دیا۔ اور زندہ درگور کر دیا ہے آپ کو معلوم ہے کہ باوجود اعزہ کی شدید مخالفت کے ایسا کیا گیا تھا۔ صرف والدہ رافت سلمہا کی صحت کے خیال سے ایسا کریا کسی طرح آپ کے مناسب نہ تھا کہ ایک مجبور و بے چارہ ہستی کو پامال کر دیا گیا۔ شریعت میں فعل نہایت

مبغوض ہے۔ اس کا آپ نے کچھ خیال نہ کیا" — اس کے جواب میں عبدالماجد کا جو خط بھائی صاحب کے پاس آیا، بعینہٖ نقل کیا جاتا ہے:

بسم اللہ

دریاباد ۱۴ر جولائی سنہ ء

منشی حبیب الرحمن صاحب! وعلیکم السلام

آپ کے دو خط ملے ایک بھائی صاحب کے نام، دوسرا خود میرے نام میں چار روز کے بعد ابھی لکھنؤ سے واپس آیا ہوں اس لیے جواب آج سے قبل لکھنا ممکن نہ ہوا۔

آپ کو رنج و صدمہ ہونا قدرتی ہے۔ اور ایسی مغلوبیت کی حالت میں، انسان ایک بڑی حد تک عند اللہ و عند الناس معذور ہو جاتا ہے لیکن اس ممانعت کے لیے بھی کچھ حدود ہوتے ہیں بار بار ہم لوگوں کو گردن کاٹنے، ذبح کرنے قتل کر ڈالنے، ظلم کرنے بدعہدی کرنے، تلوار چلانے کا مجرم قرار دینا، والدہ رافت سلمہا کی علالت کی بحث چھیڑنا یہ سب ان حدود سے تجاوز کر جانا ہے۔ اسباب افتراق کی تفصیل اب تک میں نے آپ ہی لوگوں کی دلشکنی کے خیال سے نہیں کی تھی۔ ایسا نہ ہو کہ آئندہ مجبوراً ایسا بھی کرنا پڑے — صورت حال جو آپ نے تحریر کی ہے۔ وہ تمام تر خلافِ واقعہ ہے۔ آئندہ اس قسم کے خطوط لکھ کر مجھے مجبور نہ کیجیے کہ تمام سچائیوں کو ظاہر کر دوں۔

اپنے اعزہ کی جو شکایتیں آپ نے لکھی ہیں ممکن ہے صحیح ہوں لیکن ظاہر ہے کہ ان معاملات سے ہمارا کیا واسطہ اور ہم لوگ بجز زبانی ہمدردی و اظہار تاسف کے اور کیا کر سکتے ہیں؟ جو کچھ کیا گیا ہے آپ یقین کریں یا نہ کریں مگر واقعہ یہ ہے کہ اس میں بڑی حد تک آپ لوگوں کی بہتری اور بھلائی کو ہی پیش نظر رکھا گیا ہے — یہ مسئلہ آپ کو کسی نے غلط بتا دیا ہے کہ طلاق ہر صورت میں عند اللہ مبغوض ہے۔ طلاق تو خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔ اور صحابہ کرام نے بہ کثرت طلاقیں دی ہیں مطلقہ کے ساتھ نکاح بھی ان حضرات نے بہ کثرت کیے ہیں۔ اسے عیب تو ہماری موجودہ سوسائٹی نے بنا دیا ہے۔ جس میں عقد بیوہ، تعدد ازدواج تک بھی داخل عیوب ہیں۔ شریعت نے جس طلاق کو ناپسند کیا ہے وہ ہے جو شوہر بلا وجہ معقول عورت کو ستانے کے لیے یا محض اپنی نفس پرستی کے لیے دیتا ہے نہ کہ وہ طلاق جس کا مقصد یہ ہو کہ زن و شوہر دونوں ایک دوسرے کی صحبت ناموافق سے آزاد ہو جائیں، یہ تو عین دفع ظلم ہے نہ کہ

ظلم — آپ نے جس جذبہ ہمدردی کا واسطہ دلایا ہے یہ اسی کا تقاضا ہے، جو افتراق و قطع تعلق پر مجبور کر رہا ہے۔ ظلم اگر مقصود ہوتا تو اس کی متعارف صورتیں دوسری ہیں، جن سے آپ بھی ناواقف نہیں ہو سکتے۔

عبدالماجد

یہ خط دیکھ کر مجھے اور بھی صدمہ ہوا کہ واللہ اعلم وہ کون سی سچائیاں ہیں، اور اسباب افتراق کی خدا جانے کیا تفصیل ہے۔ میں تو بالکل بے قصور ہوں، مجھ سے کوئی ایسی شدید خطا سرزد نہیں ہوئی کہ یہ نوبت آتی — اس کے بعد میں نے خود ایک خط لکھا کہ آخر مجھے دنیا کیا کہے گی اور خدا جانے میرے متعلق لوگوں کا کیا گمان ہو۔ عبدالماجد نے میرے خط کا جو جواب دیا بعینہ نقل کیا جاتا ہے۔

بسم اللہ

دریاباد ۲۱ جولائی ۳۱ء

والدہ آمنہ سلمہا۔ وعلیکم السلام۔ کئی دن ہوئے خط ملا تھا۔ اللہ کی مشیت میں جو ہوتا ہے، وہی ہو کر رہتا ہے۔ بندہ کا کام یہ ہے، کہ جو کچھ بھی پیش آئے، اس پر صبر کرے۔ تم نے لکھا کہ لوگ تم پر طرح طرح کی تہمتیں لگائیں گے ان تہمتوں کی تردید میں جو کچھ میں لکھ بھیجوں۔ جھوٹی تہمت لگانے والے خود اپنا نامہ اعمال سیاہ کریں گے۔ میں نے کئی دن ہوئے تمہارے بھائی کو لکھا تھا کہ تکمیل ضابطہ کے لیے مہر کی کل رقم کی رسید میرے پاس بھیج دیں تو بقیہ رقم فوراً بھیج دوں۔ رسید ابھی تک آئی نہیں۔ رقم تیار رکھی ہے۔ صرف تمہاری رسید کا انتظار ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک بیوی حضرت سودہؓ کی طلاق واپس لی ہے، باقی دو بیویاں ایسی اور ہوئی ہیں جنہیں طلاق دے کر واپس نہیں لی ہے۔ شرعاً یہ ایسی کوئی بری بات نہیں ہے صرف ہمارے موجودہ رواج نے اسے اتنا بڑا بار کھا ہے جیسے دوسرے عقد کو گویا سمجھ لیا گیا ہے۔

عبدالماجد

جو خط عبدالماجد کا میرے بھائی صاحب کے نام ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملے میں میں خطاوار ہوں اور اگر افتراق کی تفصیل اور سچائیاں ظاہر ہوں تو مجھے شرمندہ ہونا پڑے — اس کے ہفتہ بھر ہی کے بعد میرے نام جو خط آیا ہے اس سے میں ہر قصور سے بالکل بری الذمہ قرار دی جاتی ہوں۔ اب کون کہہ سکتا ہے کہ صحیح بات عبدالماجد کے نزدیک پہلی ہے یا دوسری — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اور صحابہؓ کا بیویوں کو طلاق دینا یہ میری تسلی کے لیے لکھا گیا ہے یا رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم پر صلوات بھیجنے کے لیے طلاق مبغوض نہ ہو گی، دنیاوی رسمیں بری سہی مگر شریفوں کے جذبات کے موافق جیسی ہو سکتی ہیں ظاہر ہے — عبدالماجد نے مہر کے روپیہ بھی بھائی صاحب کے پاس روانہ کیے تھے۔ لیکن میں نے واپس کر دیے — اس کے بعد میں نے تھانہ بھون مولانا اشرف علی صاحب کے پاس اور دارالعلوم دیوبند مولانا حسین احمد صاحب کے پاس خطوط بھیجے کیونکہ عبدالماجد مولانا اشرف علی صاحب کے معتقد اور مولانا حسین احمد صاحب کے مرید ہیں۔ ان حضرات کے پاس خطوط بھیجنے کی غرض شرعی یہ تھی کہ ممکن ہے اس مصیبت تعیبت سے نکلنے کی کوئی صورت پیدا ہو جاتی۔ مولانا اشرف علی صاحب نے تو میرے خط کا کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ مولانا حسین احمد صاحب نے جو خطوط مجھے اور بھائی صاحب کو تحریر فرمائے وہ نقل کیے جاتے ہیں۔ اصل خطوط میرے پاس محفوظ ہیں۔

محترمہ من سلمکم اللہ تعالے   السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپ کا والا نامہ حسرت اور رنج سے بھرا ہوا پہنچا۔ نہایت زیادہ قلق اور افسوس ہوا۔ اللہ تعالے آپ کی دستگیری فرماتے آمین — میں مولانا عبدالماجد صاحب کو لکھ رہا ہوں۔ مگر وہ فرماتے ہیں کہ پہلے مجھے بہت سی باتوں کا وہم وگمان بھی نہ تھا جو کہ بعد از عقد پیش آئیں۔ وہ آپ کے کسی معاملہ میں بد خلقی وغیرہ کے شاکی نہیں ہیں۔ انہوں نے نکاح سے پہلے مدت دراز تک فکر و غور اور جدوجہد جاری رکھا کہ کوئی مناسب اور مفید موقعہ ہاتھ آجائے جہاں پر آپ کا عقد ثانی ہو جائے مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہوتے۔ تب انہوں نے ارادہ کیا تھا کہ میں خود ہی عقد کر لوں اور جیسا کہ انہوں نے آپ سے وعدہ کیا تھا۔ اسی ارادے میں پختہ تھے مگر عقد کرتے ہی ان پر چاروں طرف سے مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ گھاٹی اس قدر دشوار گزار ہو گی۔ بالآخر وہ صبر نہ کر سکے۔ اور یہ معاملہ پیش آیا۔ خط وکتابت میں جو آخری جواب ہو گا میں پھر پیش کروں گا — محترمہ من! قسمت کی بات کوئی نہیں جانتا۔ راضی بہ تقدیر رہنا چاہیے۔ اللہ تعالے سے دعا کرتا ہوں کہ وہ آپ کے لیے بہترین صورت پیدا کر دے۔ خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو جیے۔ والسلام

۲۰ ربیع الاول ۱۳۵۰ھ

ننگ اسلاف   حسین احمد غفرلہ

دوسرا خط ملاحظہ ہو۔

محترمہ من سلمکم اللہ تعالے   السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپ کا والا نامہ باعث سرفرازی ہوا تھا۔ چونکہ میں تقریباً ایک ماہ سے پھوڑے پھنسی وغیرہ میں مبتلا ہوں۔ ادھر مشاغل تدریس وغیرہ سے فرصت نہایت کم ملتی ہے۔ اس لیے جواب میں تاخیر ہوئی۔ مولانا عبدالماجد کا والا نامہ آیا تھا، وہ اپنی انتہائی مجبوریاں

کا ذکر کرتے ہیں ان کو اس قسم کی مجبوریوں کا خیال تک بھی نہ تھا۔ یہاں تک مجھ کو ان کے پہلے کلمات سے اور اب کے کلمات سے پتہ چلتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کو آپ سے پہلے بھی ہمدردی ہی نے مجبور کیا تھا کہ عقد کریں۔ ان کی ہرگز نیت نہ تھی کہ خدانخواستہ وہ جدا کریں گے۔ مگر یہ واقعات اعزہ و اقارب اور خصوصاً والدہ ماجدہ وغیرہ کے احکام کے ایسے پیش آئے کہ سوائے سر جھکانے کے کوئی چارہ کار ہی نہ رہا مجھ کو بھی سخت افسوس ہے کہ ایسا واقعہ کیوں پیش آیا اور ان کو بھی بہت ہی زیادہ رنج اور الم ہے۔ مگر تقدیرات الٰہیہ میں کس کا چارہ ہے۔ آپ کے لیے اگر خوش قسمتی مقدر ہوتی تو مولانا عبدالرحمٰن صاحب ہی کا انتقال کیوں ہوتا۔ مالک قضا و قدر نے جس طرح چاہا مقرر فرمایا۔ کسی کا اس میں کیا اختیار ہے۔ آپ نے بہت بڑا جہاد کیا تھا کہ نکاح ثانی قبول فرمایا۔ اب یہ دوسرا جہاد پیش آیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی دستگیری فرمائے اور دین و دنیا میں آپ کی ناکام المرامی اور خوش کامی کی صورت ظہور میں لائے۔ اب بجز صبر و شکر کیا چارہ ہو سکتا ہے۔ مولوی صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ میں مصارف روانہ کرتا ہوں مگر آپ کی طرف سے واپسی ہوتی ہے[1]۔ اس لیے میں عرض کرتا ہوں کہ وہ جو کچھ اخراجات کے لیے روانہ کریں قبول فرما لیا کریں کیا عجب ہے کہ وہ اپنی زندگی بھر آپ کی اس قسم کی خبرگیری فرماتے رہیں۔ آپ کو اب بجز صبر کیا چارہ ہے میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ کریم و کارساز آپ کی پردۂ غیب سے اعانت فرماتے۔ آمین

از دیوبند

۱۹ جمادی الاول ۱۳۵۰ھ   ننگ اسلاف   حسین احمد غفرلہ

اسی سلسلے میں بھائی صاحب کے پاس چچا حسین احمد صاحب کا خط آیا وہ بھی درج ذیل کیا جاتا ہے۔

محترم المقام جناب فیض مآب منشی حبیب الرحمٰن صاحب زید مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ والا نامہ باعث سرفرازی ہوا۔ میں نے مولانا عبدالماجد صاحب سے اس امر میں خط و کتابت کی۔ یوں تو اسرار کا جاننے والا خالق کون و مکان ہی ہے مگر جہاں تک ان کی پہلی اور اب کی تحریرات اور زبانی گفتگو میں تلاش کیا ان کی نیت بد نہ تھی اور اس عقد ثانی میں ان کو محض ہمدردی اور خبر گیری جیش و محترمہ کی مقصود تھی۔ اسی کے ساتھ ساتھ عقد ثانی کا اجر بھی منظور تھا۔ اگرچہ انہوں نے اس امر میں مستقبل کی دشواریوں کو سوچا سمجھا تھا مگر ان کو اندازہ میں غلطی ہوئی جس قدر وہ سمجھ رہے تھے اس کے متعلق ان کا گمان تھا کہ میں تحمل کر لوں گا، مگر خلاف امید ان کو اس قدر مشکلات کا سامنا ہو گیا جس کو تحمل کرنا ان کی طاقت سے باہر تھا۔ اور پھر بھی ایک عرصہ تک وہ برداشت فرماتے رہے مگر جبکہ بالکل ہی مجبور ہو گئے اس

[1] بالکل غلط ہے صرف مہر کے روپیہ جس کو رقم کے لفظ سے مولوی صاحب نے تعبیر کیا ہے روانہ کیے تھے وہ میں نے واپس کر دیئے تھے۔ عبدالماجد نے طلاق کے بعد میرے پاس ایک پیسہ نہیں بھیجا۔

وقت بجز اس صورت کے کوئی مفر ان کو نظر نہ آیا۔ انہوں نے اپنی قدیمی سسرال والوں کے جور و جفا کو برداشت کیا اور سب اعزہ و اقارب کے طعنوں اور تشنیعوں کو جھیلا۔ قریب کے رشتہ داروں کی بھی مگر والدہ ماجدہ کے احکام کا ٹالنا دینا سخت دشوار اور دین و دنیا کی بربادی کا باعث تھا جناب کو معلوم ہے کہ حکم شرعی کی وجہ سے انسان مجبور ہو جاتا ہے کہ اگر والدین بلا سبب بھی لڑکے کو حکم کریں تو اس پر ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی عزیزہ اہلیہ سے جدائی اختیار کر لے اگرچہ انہوں نے عقد سے پہلے اپنی قدیمی اہلیہ اور والدہ ماجدہ اور بڑے بھائی وغیرہ کو راضی کر لیا تھا مگر بعد از عقد یہ سب کچھ دنوں میں بدلنے لگے اور ایسی ایسی مشکلات ان کے سامنے آ گئیں کہ ان کے موجود ہوتے ان کا اپنے وطن اور گھر بار میں رہنا اور زندگی بسر کرنا دشوار تر بلکہ تقریباً محال ہو گیا یہ سب بھی جھیل جاتے اگر والدہ ماجدہ کا حکم نہ ہوتا۔ میں مولوی صاحب موصوف کو جھوٹا نہیں سمجھتا۔ مجھ سے اس امر کے متعلق بہت زیادہ رد و قدح کی، اور نوشت و خواند کی نوبت آ چکی ہے۔ ادھر آپ کی مشکلات بھی واقعی اور بہت زیادہ رنجدہ ہیں افسوس ہے تقدیری معاملات ہیں ان میں دم مارنے کی گنجائش نہیں۔ جس طرح آپ نے ایک ایسے ہونہار قابل بھائی کی نوجوانی کی موت پر صبر کیا اور یہی وہ مصیبت تھی جو کہ تمام مصائب کی سرچشمہ بلکہ تمام خاندان کے لیے ایک ناقابل تلافی مصیبت تھی تو پھر اس مصیبت پر بھی صبر فرمائیں۔ میں جہاں تک خیال کرتا ہوں مولوی صاحب موصوف دروغ گو مکار، شہوت پرست نہیں ہیں مگر تقدیری معاملات کے سامنے بڑے بڑے دل گردے والوں کو گھٹنے ٹیکنے پڑتے ہیں اور جن باتوں کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا ان کو برداشت کرنا ہوتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو وجود خالق کا اقرار کرنا مشکل ہو جائے۔ آپ کی عالی ظرفی اور شرافت کا مقتضیٰ یہی تھا جو جناب نے کیا کہ ایسی گندگی کو اچھالنے سے پرہیز فرمایا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عنایت فرمائے اور آپ کی مشکلات کو دور فرمائے۔ دعوات صالحہ اور خدمات لائقہ سے فراموش نہ فرمائیں۔

والسلام   از دیوبند ۱۹ جمادی الاول ۱۳۵۰ھ

ننگ اسلاف   حسین احمد غفرلہ

میری حالت شدت رنج و غم سے بالکل دیوانوں جیسی ہو گئی، مجھ میں بالکل سکت نہ رہی، ہاتھ، پیر اور بقیہ تمام جسم ٹھنڈا ہو گیا تھا لکھنؤ میں ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کا علاج ہوا۔ میں اپنی اس ردی حالت سے ذرا بھی متفکر نہ تھی۔ میری دلی تمنا یہی تھی کہ موت آ کر جلد میرے مصائب و آلام کا یک لخت خاتمہ کر دے ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کے علاج سے مجھے قدرے سکون ضرور ہوا۔ لیکن اب چار پانچ دن سے میری حالت روز بروز بالکل ردی ہوتی جاتی ہے، اٹھنے بیٹھنے سے بالکل معذور ہوں۔ اب چار پائی پر سے ہلنے کی طاقت بھی نہیں ہے، ابتدا میں دق جیسی کیفیت تھی، حرارت قائم ہو گئی تھی، کھانسی بے حد

تھی گو اب چار پانچ روز سے بلغم کے ساتھ کچھ خون کی آمیزش ہے، علاج ہو رہا ہے لیکن بظاہر کوئی امید نہیں۔ خداوند کریم سے میری دلی تمنا یہی ہے کہ مجھے جلد از جلد ان دنیاوی مصائب سے نجات دے اور اپنے حبیب پاک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں ایمان کے ساتھ اپنی اس ادنیٰ کنیز کو آغوش رحمت میں لے کر خاتمہ بالخیر کرے۔ آمین یا رب العالمین[1]۔ ان تمام واقعات میں سب سے زیادہ قابل لحاظ یہ امر ہے کہ عبد الماجد اپنے پیر مولوی حسین احمد صاحب کو تو طلاق کی وجہ یہ بتلاتے ہیں کہ والدہ نے مجبور کیا اور میرے بھائی کو جو خط لکھا ہے اس میں یہ تحریر فرماتے ہیں کہ "اسباب افتراق کی تفصیل اب تک میں نے آپ ہی لوگوں کی دلشکنی کے خیال سے نہیں کی تھی، ایسا نہ ہو کہ آئندہ مجبوراً یہ بھی کرنا پڑے ......

آئندہ اس قسم کے خطوط لکھ کر مجھے مجبور نہ کیجیے کہ تمام سچائیوں کو ظاہر کروں" حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں تحریروں میں سے ایک بھی سچی نہیں لیکن عبد الماجد نے یہ چال چلی کہ ادھر تو اپنے پیر کو بھی خوش رکھنا چاہا اور ادھر میرے اعزہ کو ایسا خط لکھا، جس سے وہ ڈر جائیں اور اس معاملہ کو آگے نہ بڑھائیں، دوسرا جھوٹ انہوں نے اپنے پیر سے یہ بولا کہ وہ معاوضہ روانہ کرتے ہیں لیکن میں واپس کر دیتی ہوں حالانکہ یہ بھی بالکل غلط ہے۔

علاوہ اس کے یہ امر بھی قابل غور ہے کہ کیا پہلے نکاح کے وقت عبد الماجد ایسے مدعی زہد و اتقا نے اپنی والدہ سے اجازت نہ لی تھی، یقیناً لی ہے۔ پھر نکاح کے بعد ان کی مخالفت کیسی۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے پیر مولوی حسین احمد صاحب کو (ناراضی والدہ کا) جو سبب بتایا وہ بھی بالکل بے بنیاد ہے۔

بہر حال میں ان تمام واقعات کو پبلک اور علما دین و اکابر ملت کے سامنے رکھ کر متمنی ہوں کہ وہ خود فیصلہ کریں اور دیکھیں کہ دنیا میں ایسی بزرگ صورت، گلیم پوش، تسبیح خواں صورتیں بہت سی ہوتی ہیں جن کے دل خواہشات نفسانی، مکر و فریب اور نفاق سے لبریز ہو گئے ہیں۔ اور وہ اسی طرح خفیہ طور پر ظلم کرتے رہتے ہیں جن کا علم کسی کو نہیں ہوتا۔

میرا ارادہ تھا کہ یہ واقعات ملک کے سامنے پیش کیے جاتے کیونکہ عبد الماجد کے مظالم سے مجھ پر تو جو کچھ مصیبت گزرنا تھی گزر رہی ہے۔ دق و سل جیسے لاعلاج مرض میں مبتلا ہو کر زندگی کے دن گن رہی ہوں لیکن میں چاہتی ہوں کہ میرے اس جانگداز واقعہ سے میری بہنیں اور ان کے والدین عبرت حاصل کریں اور ایسی مقدس ہستیوں سے بچنے اور بچانے کا ہمیشہ خیال رکھیں اور ملک کو بتائیں کہ ایسے لوگوں سے بچنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔

---

[1] مرحومہ کی یہ دعا بارگاہ خداوندی میں مستجاب ہوئی اور وہ جلد ہی اس زخم کو سینے سے لگائے ہوئے خدا کو پیاری ہو گئیں۔

فاعتبروا یا اولی الابصار

زندہ در گور

از ۔ بیوہ مولانا عبد الرحمن صاحب ندوی نگرامی مرحوم

مورخہ ۲۳ فروری سنہ ۱۹۳۲ء
نگرام ہاؤس ۔ نظیر آباد
لکھنؤ

باہتمام
کے ۔ بی ۔ اگروالا شانتی پریس ۔ الہ آباد

خواجہ حسن نظامی (دہلی)

مولانا عبد الرحمن نگرامی کی بیوہ سے مولانا عبد الماجد دریا بادی کے نکاح، پھر طلاق پر ان کے خلاف جو تحریک اٹھ کھڑی ہوئی تھی، اس میں لکھنؤ کے ایک رسالے اور خواجہ حسن نظامی کے ہفت روزہ "روزنامچہ" دہلی نے خاص حصہ لیا۔ مولانا دریا بادی نے معاملے کی صفائی اور اپنے دفاع میں متعدد حضرات کو خطوط لکھے تھے۔ ان میں مولانا حسین احمد مدنی کو خط لکھا کہ والدہ ماجدہ کے حکم کی تعمیل میں طلاق دینی پڑی، حافظ عزیز حسن بقائی کو لکھا کہ میں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جو شرع کے خلاف ہو، لیفٹیننٹ کرنل ڈاکٹر خواجہ عبد الرشید کو خط لکھا کہ پہلی بیوی کی توجہ حاصل کرنے کے لیے نکاح کیا تھا، مقصد حاصل ہو گیا تو طلاق دے دی، مطلقہ کے بھائی کو دھمکی آمیز خط لکھا:

"اسباب افتراق کی تفصیل اب تک میں نے آپ ہی لوگوں کی دلشکنی کے خیال سے نہیں کی تھی، ایسا نہ ہو کہ آئندہ مجبوراً یہ بھی کرنا پڑے"

معلوم ہوتا کہ مولانا کے عذر کو کسی نے تسلیم نہیں کیا، سب کا فیصلہ یہی تھا کہ مولانا نے بے ضرورت نکاح کیا اور بے سبب طلاق دی اور اپنے اس فعل کے جواز کے لیے شریعت کا نام استعمال کیا[1]۔ اس سلسلے میں انہیں مختلف خطابات سے نوازا گیا۔ مولانا دریا بادی نے خواجہ حسن نظامی

ماخذ: ہفت روزہ روزنامچہ دہلی بابت یکم مئی سنہ ۱۹۳۲ء

[1] خواجہ حسن نظامی نے اس واقعے کو صرف مولانا دریا بادی کے ذوق تفریح، عیش طبعی سے تعبیر کیا بلکہ مولویوں

کے نام مندرجہ ذیل خط میں ان خطابات کو خود ہی نقل کر دیا ہے۔

بسم اللہ

ایڈیٹر روزنامچہ کے نام نہیں، بلکہ رین بسیرے والے خواجہ حسن نظامی کے نام

اے جفائے تو ز دولت خوب تر — وانتقامِ تو ز جاں محبوب تر
عاشقم بر قہر و بر لطفش بجد — اے عجب من عاشقِ ایں ہر دو ضد
ناخوش تو خوش بود بر جانِ من — جاں فدائے یارِ دل رنجانِ من

(عارف رومی)

از سابق "فلسفی شاہ" وغیرہ وغیرہ
حال "ظالم و جلاد، مفتری، کذاب، نفس پرست و عیاش وغیرہ

دریاباد
۲۴ر اپریل ۱۹۳۲ء

مولانا اشرف علی تھانوی (تھانہ بھون، ضلع سہارنپور)

مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر (ضلع اعظم گڑھ) کے رسالے "الاصلاح" میں کوئی مضمون نکلا تھا، اس کے بعض خیالات کی بنا پر تھانہ بھون سے کفر کا فتویٰ جاری کر دیا گیا۔ اس سلسلے میں مولانا دریابادی نے مولانا اشرف علی تھانوی کو خط لکھا کہ یہ تو وہی عمل ہے جس کا الزام آپ بریلوی حضرات کو دیتے ہیں۔ یہ وہ خط ہیں جو "حکیم الامت" کی تالیف کے وقت چھوٹ گئے تھے۔ مکتوب نگار نے ان کے تمہیدی نوٹ میں کہا تھا کہ انھیں "حکیم الامت" کے دوسرے ایڈیشن میں بطور ضمیمہ شامل کر لیا جائے۔ افسوس کہ کتاب کے پاکستانی ایڈیشن میں یہ پھر چھوٹ گئے۔ اس فتوے پر مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا تھانوی کے دستخط

اور پیروں کے جرائم میں شمار کیا ہے۔ وہ اس سلسلے میں آگے بڑھ گئے اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے بڑھاپے میں ایک معتقدہ، اپنے ہی زیر تربیت و تعلیم بیٹی سے نکاح پڑھوا لینے اور مولانا شوکت علی کی اپنی ۲۲ سالہ انگریز سیکرٹری سے، جسے ان کے بیٹے زاہد علی پسند کرتے تھے، نکاح کر لینے کے واقعات کو بیان کیا ہے۔ زاہد علی صاحب اپنی والدہ کو بمبئی سے بھگا لائے تھے اور کراچی میں سیٹھ حاجی عبداللہ ہارون کے مکان پر رکھا تھا۔

۱ه مثنوی میں "لطفت" اور "ناخوش تو" کی جگہ "لطفش" اور "ناخوش او" ہے۔ مکتوب نگار نے بہ تصرف حسب حال کر لیا۔

تھے۔ بعد میں دونوں نے اس سے رجوع کر لیا تھا۱ه

۲۶ر جولائی ۱۹۳۶ء

سیدی و مطاعی۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا مناظر احسن صاحب کی مطبوعہ تحریریں بہ غرض ملاحظہ ارسال خدمت ہیں۔

مشیت میں جو کچھ ہوتا ہے ہو کر رہتا ہے۔ میں نے بہت چاہا کہ قبل اس کے کہ ادھر سے سلسلۂ تحریر شروع ہو، آپ کا اور مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کا بیان شائع ہو جاتے۔ فتویٰ تکفیر کی زد میں میرا تو خیر ذکر ہی کیا، مولانا سید سلیمان، مولانا سید مناظر احسن، حضرت مولانا حسین احمد، تمام علمائے ندوہ اور بہت سے علماء دیوبند سب ہی آ رہے ہیں۔ ایک اہل علم نے جو میری ہی طرح جناب والا اور حضرت مولانا۲ه دونوں سے یکساں اخلاص و عقیدت رکھتے ہیں۔ بڑی حسرت و دلسوزی سے کہا کہ اب تک تو ہم اسی کو رو رہے تھے کہ دیوبند اور تھانہ بھون کی سیاسیات الگ الگ ہیں۔ اب دنیا پر اس کا بھی اعلان ہو کر رہا کہ دونوں کا دین بھی الگ الگ ہے۔

منصب مفتی سے جناب نے جو ارشاد فرمایا وہ ضابطے سے بالکل درست سہی۔ لیکن پھر آخر بریلی والے کیوں بدنام ہیں۔ وہ بھی تو یہی کرتے ہیں کہ صاحب تقویۃ الایمان، حفظ الایمان وغیرہ کے بعد سارے عقائد سے۔ اور ان کے تقویٰ و تقدس سے قطع نظر کر کے درمیان سے ایک آدھ فقرہ یا ایک آدھ لفظ لے لیتے ہیں۔ اور اسی پر تکفیر کر ڈالتے ہیں۔

رسالہ الاصلاح حسناب کی یہ کیا ہے کہ خود جناب ہی کے ایک وعظ کا بڑا طویل حصہ جا بجا ملا در بارۂ تکفیر میں سے نقل کر دیا ہے میں نے خود بھی کلید مثنوی میں یہ مضمون پڑھا تھا۔ اصل الفاظ یاد نہیں خلاصۃً لکھ رہا ہوں، کہ مولانا کا کوئی ایک شعر جو خلاف شریعت نظر آئے، اس پر رائے نہ قائم کی جائے۔ بلکہ سارے کلام کو ملحوظ رکھ کر کی جائے۔ ابھی دو ہی چلہ مہینے کی بات ہے کہ مولانا سید سلیمان نے اپنی شدید علالت کے دوران میں جناب کو خواب میں دیکھا تھا اور کہتے تھے کہ معلوم ہوتا ہے یہ حضرت مجھے چھوڑیں گے نہیں۔ یعنی بغیر اپنے حلقہ

۱ه مولانا تھانوی کے جوابی خطوط کے لیے دیکھیے "حضرت تھانوی کے سو اور مکتوب" صدق جدید ۱۸ر اگست ۱۹۶۶ء ص ۲ تا ۸ ۲ه اشارہ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کی طرف ہے۔

اسادت میں لیے نہ رہیں گے۔

کہاں میرا دل اس سے باغ باغ ہو رہا تھا۔ کہاں آج یہ دن دیکھنا نصیب ہو رہا ہے!

والسلام

محتاج دعا: عبدالماجد

(۲)

مکتوب نگار کے آخری جملوں سے مولانا تھانوی کو اس مطلب کا شبہ ہوا کہ میں تو انہیں آپ کا مرید بنانے کی فکر میں تھا، آپ نے ان پر کفر کا فتویٰ لگا کر انہیں اپنے سے اور دور کر دیا۔ مکتوب الیہ نے اس کی تردید کی تھی۔ یہ معذرت نامہ اس شبہ کے ازالے میں ہے۔

سیدی و مطاعی۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔

پچھلا والا نامہ ملفوف ہے۔ آخر کی سرخ نشان زدہ عبارت سے شبہ ایسا ہو رہا ہے کہ گویا میں نے جناب کے کسی عمل کے اخلاص میں اشتباہ ظاہر کیا تھا اور اسے لوگوں کے معتقد رکھنے، بنانے پر محمول کیا تھا۔

استغفر اللہ۔ یہ خیال تو آپ کے ادنیٰ خدام کے لیے بھی نہیں رکھتا چہ جائے کہ خود جناب سے متعلق اس تصور ہی سے تکلیف ہو رہی ہے کہ میری کسی عبارت سے ایسا سمجھا ہی کیوں گیا۔ مولانا سلیمان کے خواب کا ذکر اور دوسرے تذکرے تو انتہائی حسرت کے اظہار کے لیے تھے کہ دین کے دو مخلص خادموں میں تعلقات یگانگت کی بنیاد پڑ کر پھر رکاوٹ پیدا ہو گئی اور "ونزعنا ما فی صدورہم من غل" کا نظارہ بجائے دنیا کے پھر آخرت پر اٹھ رہا۔ کوئی شخص باپ اور بڑے بھائی کے درمیان ایک مدت تک ان کے بچھڑے رہنے کے بعد خوشگواری دیکھے گا۔ تو طبعاً مسرت ہو گی اور جب پھر انقباض پائے گا تو اپنا دل بھی حسرت سے مرجھا جائے گا۔ اس کا یہ مطلب تو نہیں ہو سکتا کہ باپ کو کسی درجہ میں بھی منافقت برتنا چاہیے۔ والسلام

محتاج دعا،

عبدالماجد

شوکت تھانوی

(۱)

اس خط میں منشی جی سے اشارہ شوکت تھانوی کے مزاحیہ فیچر کی طرف ہے جو لکھنؤ ریڈیو سے نشر ہوتا تھا اور لگر لگ شے اشارہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی کے مجموعۂ کلام کی طرف

ہے جس پر تھانوی صاحب مولانا سے مقدمہ لکھوانا چاہتے تھے۔

دریاباد

۲۲ مارچ ۱۹۴۱ء

بسم اللہ

بندہ نواز! وعلیکم السلام

میں تو منتظر خود "منشی جی" کی آمد کا تھا بہ نفس نفیس اصالۃً بلا شرکت غیرے و آمیزش۔ وہ آتے تو سہی لیکن اس سج دھج سے کہ کسی کا ہاتھ پکڑے ہوئے لا رہے ہیں اللہ کسی کے ہمسائے پیری بنے ہوتے ہیں!

یہ منشی جی وکیل کب سے ہو گئے۔ خود "مختار" تو ہمیشہ سے تھے یہ "مختاری" کا جبہ کب سے پہن لیا۔؟

"لکھنؤ"، "سونگھ لیا"، "لگر لگ" کے "رنگ و بو" کی سیر کر لی۔ آپ کے شاعر صاحب تضمین کے کلام کا انتخاب خوب اور بہت خوب کرتے ہیں یہ دلیل ہے ان کی سخن سنجی، سخن گوئی کی۔

والسلام

دعا گو: عبدالماجد

(۲)

تھانوی صاحب نے "مذظلہ" کے عنوان سے نقوش لاہور میں مولانا دریابادی پر مضمون لکھا تھا اس سے مطلع ہو کر یہ خط لکھا۔

دریاباد

۲۷ فروری ۱۹۵۶ء

بسم اللہ

"مذظلہ" کی طرف

سے

عزیزی سلمہٗ کو

تو بستم بھی شریک ناز ہوا

آج کچھ اور بڑھائی گئی قیمت میری

والسلام

عبدالماجد

(۲)

شوکت تھانوی کا ایک مضمون "سانپ مار خاں" پڑھ کر مولانا دریابادی نے یہ خط لکھا۔

دریاباد
۲۲ مارچ ۱۹۵۶ء

بسم اللہ

عنوان "سانپ مار خاں" پڑھ کر
یہ سانپ کے لیے "مار" کیا خوب
بہ قول شخصے "وہ مارا"

عبدالماجد

(۳)

دریاباد
یکم مارچ ۱۹۵۷ء

بسم اللہ

وعلیکم السلام

برادرم!

فرمایئے آپ بدستور لاہور ریڈیو میں ہیں نا! ماشاء اللہ یہ مضمون ہے کہ

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں

بہر حال اڑتی سی خبر کان میں پڑی ہے کہ آپ حال میں اڑ کر چاٹگام پہنچے تھے اور عنقریب لندن کی پرواز کے لیے پر تول رہے ہیں، "اللہ ری" "بلند پروازیاں"

والسلام

دعاگو: عبدالماجد

(۱)

ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی[1]

"عزیب" اور "محرم" مکتوب الیہ نے اپنے دو مضمون صدق میں اشاعت کے لیے بھیجے تھے۔ مرتضیٰ علی مکتوب الیہ کے چچا تھے۔

۱۴ دسمبر ۱۹۴۵ء

دریاباد ضلع بارہ بنکی

عزیزی سلمہٗ! وعلیکم السلام

خط میں تو کوئی بات جواب طلب نہیں

[1] ڈاکٹر صاحب کے نام یہ خطوط خود انہوں نے صدق جدید ۲۱ ستمبر ۱۹۶۴ء میں شائع کرا دیے تھے۔

عزیب کی آمد آمد، اچھا مضمون ہے۔ صدق کے پاس باہر کے مضامین کا ایک انبار عظیم لگا ہوا ہے۔ گنجائش ہوتی تو ضرور درج کر دیتا۔ محرم کے طنز میں تلخی آ گئی ہے اسے کوئی مشکل ہی سے چھاپے گا اور مقصد اصلاح بھی اس سے حاصل نہ ہو گا۔

میاں سلیمان کی شادی معلوم نہیں کہاں ہوئی۔ دعوت نامہ تو آیا تھا۔

یکم جنوری سے انشاء اللہ دریاباد کی طرح سندیلہ کے مسافروں کی بھی مشکل آسان ہو جائے گی۔ پنجاب ایکسپریس حسب اوقات سابق چلنے لگے گا (علاوہ موجودہ دہرہ ایکسپریس کے)۔

بھائی ارتضیٰ علی صاحب کا وہی حال ہو گا۔ عرصہ سے کچھ سنا نہیں

آغاز یہ تھا کہ دل بڑھا تھا — جو بُت تھا نگاہ پر چڑھا تھا
انجام یہ ہے کہ مر رہے ہیں — اللہ اللہ کر رہے ہیں (اکبر)

والسلام

دعاگو: عبدالماجد

(۲)

دریاباد ضلع بارہ بنکی — مورخہ ۵ ستمبر ۶۶ء

عزیزم! — السلام علیکم

پروفیسر عبدالرحمن بارکر کی خبر آمد لکھنؤ کل سہ پہر کو "قومی آواز" سے معلوم ہوئی۔ لکھنؤ سے باہر رہنے کا خمیازہ ایسے ہی موقعوں پر اٹھانا پڑتا ہے۔ اب تو شاید چلے گئے ہوں گے۔ خدا معلوم کب آ گئے؟ کہاں ٹھہرے تھے؟ علم ہو جاتا تو ضرور ان سے ملنے پہنچ جاتا۔ دو ڈھائی سال ہوئے میری ان کی مراسلت اُردو میں ہوئی تھی۔ ان کا مفصل خط بہت اچھا تھا۔ ٹھیٹھ مشرقی انداز کا لکھا ہوا۔ اگر اب بھی ہوں تو میرا سلام پہنچا دیا جائے اور یہ مصرع بھی

؎ بھول جانا ہمارا یاد رہے۔

لکھنؤ میں وہ مسلمان کس کے ہاتھ پر ہوئے تھے؟ اور محرکات اسلام کیا ہوئے تھے؟ یعنی کیا پڑھ پڑھ کر؟ اسی طرح کے معلومات بطور خود ان سے حاصل کر لیجیے گا۔ یہاں سے کہاں گئے؟

(۳)

جس تحریر میں مکتوب الیہ کی نظم "نور علی نور" پر پسندیدگی کا اظہار فرمایا ہے۔ علی احمد مکتوب الیہ کے عزیز دوست اور مولانا دریابادی کے عقیدت مند

دریاباد، ضلع بارہ بنکی ۲۶ر اپریل ۱۹۵۵ء

عزیزی سلمہ اللہ! السلام علیکم

لکھنؤ ریڈیو کی فرمائش ۲۷ کی شام کے لیے پہنچی۔ اول تو ۲۴ر کو میرا پروگرام لاہور وغیرہ کے لیے (ڈیڑھ ہفتہ کا) ہے خیر اس کے لیے تو یہ ممکن تھا کہ ۲۴ ہی کو ۱۰ بجے ریکارڈ کرا لیتا لیکن بڑی پخ یہ نکلی کہ گفتگو نہیں، مباحثہ ہے بس ـــــ مباحثہ میرے لیے تکلیف دہ چیز ہے۔ بڑا وقت اس میں صرف ہو جاتا ہے۔ ایک بار مجھے ظفر حسن خاں اور آپ یا عبدالاحد خاں خلیل کے ساتھ گتھا دیا گیا تھا۔ بجائے ۱۵ منٹ کے ۴۵ منٹ لگ گئے اور جب بھی کسی مشکل سے ختم ہو پایا۔

ظاہر ہے کہ اس کے لیے script تیار کر کے کیسے لا سکتا ہوں۔ وہ تو عین اسی وقت تیار ہو گی۔ اس دوسرے کے پیش نظر میں تو انکار لکھے بھیجتا ہوں۔

محض اسکرپٹ تیار کرنی ہوتی تو ایسا انداز رکھتا کہ بحث و مباحثہ کی گنجائش ہی اس میں بہت کم نکل سکتی۔ ریڈیو کا خط ۲۳ کی شام کو ملا تھا۔ ۲۴ر کو صبح اگر جواب لکھتا تو بھی آج ہی ۲۶ر کو وہاں پہنچا۔

والسلام

دعاگو، عبدالماجد

اے نظم زبانی ہی سُن کر پسند آئی معارف میں پڑھ کر اور زیادہ لطف آیا۔ ماشاءاللہ وجزاک اللہ۔ مولوی نور علی احمد سے داد زبانی کہلا بھیجی تھی۔

(۴)

سید مزمل حسین مرحوم مکتوب الیہ کے بڑے بھائی اور مکتوب نگار کے رشتے میں بھانجے معتقد اور انہی کے ہم عمر تھے۔

دریاباد۔ ضلع بارہ بنکی ۲۷ر مئی سنہ ۶۰ء ۵ بجے شام

عزیزم سلمہ اللہ، وعلیکم السلام

بچی کی شادی اللہ ہر طرح مبارک کرے ـــــ اللہ کی شان کہ ابھی کل تک جو خود ایک کم سن لڑکا تھا، آج باپ ہے اور باپ ہی نہیں بلکہ بیٹی شادی کے قابل ہو گئی اور عنقریب خود نانا یا دادا بن جانے والا ہے۔ تقریبات میں شرکت کا اتفاق اب کم ہی ہوتا ہے۔ آں عزیز کے یہاں شرکت کر یوں بھی سوچ رہا تھا کہ معلوم ہوا کہ میاں مزمل علیل ہو کر آئے ہیں۔

اب تو حاضری لازمی ہو گئی۔ تہنیت پر اضافہ عیادت کا۔ انشاءاللہ آؤں گا۔ دعاگو،

عبدالماجد

(۵)

دریاباد۔ ضلع بارہ بنکی ۳ر مارچ سنہ ۱۹۶۷ء

عزیزم! السلام علیکم

کچھ متفرق اوراق ایک اُردو ڈکشنری کے لکھنؤ میں ایک کباڑیے کی دوکان سے مل گئے تھے۔ میں نے یہ گمان کر کے کہ Plattes کے ہوں گے خرید لیے اور انہیں مجلد کرا لیا یہاں آ کر جو مقابلہ کیا تو وہ گمان غلط نکلا۔

آپ اپنے ہاں کے ذخیرہ سے پتہ لگا کر لکھیے کہ یہ کس ڈکشنری کے ہیں؟ Fallon کی دونوں ڈکشنریاں اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں۔ اگر مل سکتی ہیں تو کہاں سے ملیں گی۔

ایک کام اور یاد پڑ گیا۔ عبدالرحمان بارکر وقتاً فوقتاً لکھنؤ آتے رہتے ہیں، مجھے اطلاع ہمیشہ بعد از وقت ملی ہے۔ ایک بار انہیں امریکہ خط لکھا کہ۔

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر

آپ لکھنؤ آتے ہیں اور اسی نواح کے سوا بربنہ پا، کو ہمیشہ نظر انداز کر جاتے ہیں جواب اُردو میں بڑے طنطنہ کا آیا کہ اب کی آؤں گا تو ضرور ملوں گا، مگر آئے تو پھر بھول گئے۔ اب آں عزیز کے علم میں ان کی کبھی آمد ہو تو ذرا یاد کر کے انہیں یاد دلا دی جائے۔ والسلام

عبدالماجد

(۶)

مکتوب الیہ نے اپنے دوسرے بیٹے سید الحسن ہاشمی کا رشتہ مولانا مرحوم کی نواسی صفیہ بنت عبدالعلیم قدوائی سے تجویز کیا تھا۔ مولانا نے آئندہ عبدالعلیم قدوائی سے اس سلسلے میں مراسلت کی ہدایت فرمائی تاہم مولانا کی چھوٹی صاحب زادی جو عبدالعلیم کو بیاہی تھیں۔

دریاباد، ضلع لکھنؤ ۶ر جنوری سنہ ۱۹۷۳ء

عزیزم۔ وعلیکم السلام

ماشاءاللہ میاں سعید کی جو سعادت مندیاں سننے میں آئی ہیں، وہ تو بیگانہ کو یگانہ بنا دینے

والی ہیں چہ جائے کہ جو عزیز پہلے سے ہو، اُسے عزیز تر بنا لینے میں تامل کس کو ہو سکتا ہے۔ اللہ کا شکر گزار رہنا چاہیے، اپنے فرزند کے حقیقی والدین کو اور شکر گزار تر رہنا چاہیے ایسے سعید کے مجازی والدین کو۔

بہ مسرت تمام اس رشتہ کی سفارش حلیم و زاہد سلمہا سے کیے دیتا ہوں۔ البتہ ان لوگوں کا سبیتا جلدی کا معلوم نہیں ہوتا وقت وہ لوگ ضرور کچھ چاہیں گے آنعزیز کی معقولیت کا، مقبولیت کا، محبوبیت کا۔ تھوڑا بہت علم ہے۔ اگر اُدھر کی اس معذوری کا خیال رکھ لیا جاتے تو انشاء اللہ ایک مزید تجربہ شرافتِ نفس، بلکہ کرامت نفس کا ہو جائے گا

آئندہ مراسلت بہتر ہوگا کہ براہ راست میاں حلیم سلمہ سے رہے۔ والسلام

دعاگو، عبدالماجد

مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی

السلام علیکم

مسلم کانفرنس لکھنؤ میں آپ کی تقریر پڑھ کر ج[1]

غازی بچو توئی رواست کا فزبود دن

جزاک اللہ خیر الجزاء۔ والسلام

دعاگو و دعا خواہ:

عبدالماجد

یکم جنوری ۱۹۴۹ء

ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو

(۱)

آرزو صاحب!

آپ کے ذوق ادب کا قائل تو میں میگزین کا پہلا نمبر پڑھ کر ہو ہی چکا تھا۔ آپ کی جرأت کا قائل ہونا پڑ رہا ہے کہ آپ اسی "ترقی" اور "ترقی پسندی" کے دور میں غالب مرحوم کا نام زندہ کرنے

ماخذ: جمعیت علمائے ہند کی بنیادی خدمات، ص ۲۸

[1] یہ کانفرنس ۲۷، ۲۸ دسمبر ۱۹۴۸ء کو جمعیت علمائے ہند کے زیر اہتمام مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں ہوئی تھی جس میں مولانا سیوہاروی نے نہایت پرجوش اور فکر انگیز تقریر سے پیش آمدہ حالات میں مسلمانوں کی رہنمائی فرمائی تھی۔

کی فکر میں لگے ہوتے ہیں!

کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانہ میں!

آپ کو یاران طریقت کی اس پستی کا بھی ڈر نہیں، کہ یہ گڑے مُردے اکھیڑنا نہیں تو اور کیا ہے! غالب بیچارہ، حمد و نعت کہنے والا، توحید، تصوف یا مسلک کو نئی نئی طرح پر نظم کرنے والا، قدیم عاشقانہ غزل گوئی کا دم بھرنے والا، "بور ژوا" سوسائٹی کا شاعر، وزن و قافیہ کی پابندیوں میں جکڑا ہوا، عریانی و فحاشی کے آرٹ سے ناآشنا، صنعت بے نگری سے بے بہرہ، رکاکت و ابتذال سے محروم، اس قابل ہی کب تھا کہ آج کوئی اس کے نام کو جگاتے اور اس کے حق میں فاتحہ خیر کو ہاتھ اٹھاتے!

حضرت غالب کا مرتبہ فارسی شاعری میں بھی یقیناً بہت بلند تھا، لیکن مجھ بے بصر تنگ نظر کے علم میں تو اُردو میں جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے، کوئی شاعر اس پایہ کا نہ غالب سے قبل پیدا ہوا تھا، نہ غالب کے بعد آج تک ہوا ہے۔ گو اس میں شبہ نہیں کہ بعض بعض متاخرین نے اپنے اندر "غالبیت" خوب خوب پیدا کر لی تھی۔

اور یہ کم سواد، بے استعداد، تو حضرت غالب کی شاعری ہی کی طرح اُن کی اُردو نثر کا بھی دلدادہ بلکہ قتیل ہے۔ خصوصاً جب سے کہ ان کے خطوط کا مجموعہ مرتبہ مولوی مہیش پرشاد ہماری نظر سے گزرا ہے۔ البتہ عبدیت سطر سطر سے نمایاں ہے۔ غالب اس آئینہ میں ایک مکمل انسان، ایک عبد خاص نظر آتے ہیں اور اسی حقیقت کی جلوہ آرائی، انشاپردازی کا منتہائے کمال ہے!

دعاگو، عبدالماجد

دریاباد، ۲۳ مئی ۴۹ء

(۲)

برادرم وعلیکم السلام

دیدارِ آرزو میں تو میں خود ہی حسرتِ مجسم بنا رہا! غالب کے لیے مضمون کی فرمائش مجھ مغلوب سے! وقت کس کے ہاں سے لاؤں۔ آپ کا کارڈ میری ہی غفلت سے اخبار کا غذات کے نیچے دب گیا تھا۔ اتفاق سے آج نظر پڑی، دل نے بڑی شرمندگی محسوس کی۔ بہر حال چند سطریں اُلٹی سیدھی گھسیٹے دیتا ہوں۔ الفاظ اگر نہ چلیں تو ہاشم سلمہ سے پڑھوا لیجیے گا۔ والسلام

دعاگو: عبدالماجد

دریاباد، ۲۶ مئی ۴۹ء

برادرم، وعلیکم السلام۔

ملی گڑھ اللہ اکبر تمبر نکالے! اللہ اکبر!

ہفتہ بھر شدید خانگی ترددات میں مبتلا رہا۔ بیوی، محبوب بیوی (محبوبیت کے لیے قید کسی سن و سال کی نہیں۔) موت و زیست کی کشمکش میں تھی۔ اللہ نے دوبارہ زندگی دی۔ میرا ایک قدم لکھنؤ میں، ایک دریاباد میں۔

"خطوطِ مشاہیر" کے نام سے تاج کمپنی نے میری ترتیب کی ہوئی ایک کتاب ۳، ۴ سال ہوئے شائع کر دی ہے۔ اس کتاب کا سب سے بڑا حصہ اکبر نامہ میں ہے۔ کچھ کم چھوٹے بڑے دو سو خطوط کا مجموعہ! اس میں سے کسی خاص خط کا فوٹو اگر منظور ہو تو تلاش کر کے وہ اصل خط آپ کو بھیج دوں۔

خود حضرت اکبر کی جوانی کا ایک بہت اچھا فوٹو میں نے اُن کے صاحبزادہ عشرت حسین مرحوم کے کمرہ میں دیکھا تھا اُسے حاصل کیجیے۔ ممکن ہے نعیم الرحمٰن صاحب ایم اے (شعبۂ فارسی، عربی، الٰہ آباد یونیورسٹی) کے ذریعہ سے مل جائے۔ عام طور پر ایک ہی فوٹو ان کی ضعیفی کے زمانے کا ملتا ہے، جس سے چہرہ کی ذہانت ظاہر نہیں ہوتی۔

خواجہ حسن نظامیؒ، ملّا واحدیؒ، حسرتؔ موہانی، ماہرؔ القادری، طالبؔ الٰہ آبادی، نوحؔ ناروی، حکیم عبدالقوی (ایڈیٹر روزنامہ "تنویر" لکھنؤ) مولوی صبغۃ اللہ فرنگی محلی شاہ معین الدین احمد ندوی ان سب کو لکھیے۔ بعض سے مضامین حاصل ہوں گے۔ بعض سے معلومات ملا واحدی سے دونوں۔ سر سیدؒ کے آخری دور میں حضرت اکبر علی گڑھ میں منصف تھے۔ اسی دور کے لوگوں کا پتہ چلائیے۔

حضرت اکبر پر اتنا زائد اور اتنے مختلف عنوانات سے لکھ چکا ہوں کہ اب فوراً تو ذہن کسی طرف متوجہ نہ ہو سکا۔ آگے اللہ مالک ہے۔ غالب نمبر پر لکھنے کی نوبت دیکھیے کب آتی ہے! والسلام

دُعاگو، عبدالماجد

۱۲ جنوری ۵۰ء

(۴)

عزیز مکرم۔ وعلیکم السلام

کیا کہوں آپ سے کتنا شرمندہ ہوں ـــــــ کارڈ مل گیا تھا اور اسی نے شنبے کی شام

کا مشتاق بنا دیا تھا۔ ریڈیو ایک عرصہ سے اپنے پاس نہیں۔ ایک عزیز کے پاس ہے اُن کے ہاں کہلا دیا تھا۔

لیکن ادھر تو نہ کام و نزلہ نے زور کیا ادھر اس سے بڑھ کر یہ کہ عصا بعد مغرب تیز و تند ابر و باد شروع ہو گیا اور خفیفت ترشح ہو گیا۔ بس عین وقت پر ہمت جواب دے گئی۔ اور سب سے بڑھ کر ہمت شکن یہ خیال رہا کہ ایسے میں سنائی کیا دے گا

غرض یہ کہ اب تو اس محرومی کی تلافی کی کوئی صورت بجز اس کے نہیں کہ آپ خود ہی اس مسودہ کی نقل عنایت فرمائیں۔ والسلام

دریاباد۔ ۲۲ دسمبر ۵۲ء دُعاگو عبدالماجد

(۵)

برادرم سلمہ اللہ، وعلیکم السلام

ڈاکٹریٹ مبارک ہو ـــــــ اللہ اسے دُنیا و آخرت دونوں میں نافع کرے۔ مقالہ کس عنوان پر تھا، یہ خیال نہ آیا۔

شعبۂ عربی کا نیا تقرر اور زیادہ قابلِ مبارکباد ہے۔ اُستادوں کے دیندار ہونے کی ضرورت تو ہمیشہ ہی سے تھی اب کچھ کچھ الحمدللہ ہو گئی ہے۔

آپ کا ۳ کا لکھا ہوا کارڈ ۵ کی شام کو ملا حالانکہ امکان ۴ کی شام کو ہی مل جانے کا تھا۔ ظاہر ہے کہ حسرت ہی بڑھانے والا ہوا۔ والسلام

دریاباد، ۷ فروری ۵۳ء دُعاگو: عبدالماجد

(۶)

برادرم، السلام علیکم

جی ہاں۔ آپ کے متعلق یہ دونوں خوشخبریاں پہلے پڑھ چکا تھا ـــــــ اور دل مسرور ہو چکا تھا۔

اللہ نے دین کی خدمت کا ایک بہترین موقع آپ کو دے دیا ہے۔ اس سے پورا فائدہ اٹھاتے اور ہر لمحہ اپنے کو دین کا خادم سمجھیے۔ انگریز کہیں اور کسی حال میں ہو پر اپنے کو انگریز ہی سمجھتا ہے اور یہی حال روسی، امریکی، جرمنی سب کا ہے۔ کاش ہم بھی اپنے کو ہمہ وقت اور ہر حال میں مسلمان سمجھنے کی عادت ڈال لیں۔

علم کی خدمت، وطن کی خدمت، یہ بھی بڑی خدمتیں ہیں۔ لیکن سب دین کی خدمت کے ماتحت۔

آج وہ سب، آپ سفر پر روانہ ہو چکے ہوں گے۔ دیکھیے یہ نیاز نامہ آپ کو کب اور کہاں ملتا ہے؟

اپنا مستقل پتہ ضرور لکھ بھیجیے گا۔

گِب دوسروں سے بہت غنیمت ہے۔ ان کی کتاب محمڈن ازم پر ریویو عرصے سے کرنا چاہ رہا ہوں۔ اگر لکھا گیا تو آپ کو بھیج دوں گا۔ انشاءاللہ۔

یہ کردو کچھ جانتے ہیں؟ نہ جانتے ہوں تو اس راہ پر انھیں نہ لیئے۔ بغیر اردو کے بذاتِ خود پاکستانی اسلامیات کو کیسے سمجھ سکیں گے!

جی ہاں لندن میں تو مسلمان کثرت سے ہیں۔ ضرور ذبیحہ کا انتظام ہوگا۔ آکسفرڈ میں بے شک دشواری ہے ذبح کا طریقہ یہود کے ہاں تو اب تک قائم ہے۔ خدا کرے وہاں بھی کوئی یہودی ذابح مل جائے۔ بس اتنا کافی ہے۔

سب سے زیادہ دشوار سوال جیسا کہ آپ نے خود لکھا ہے۔ چربی کا ہے۔ اس کا حل یہاں سے تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ سوا اس کے کہ بجز گائے وغیرہ کے مکھن کے ہر روغنی چیز ہی سے پرہیز کیا جائے ـــــ ڈاکٹر حمید اللہ پیرس میں ہیں اور ماشاءاللہ ہر طرح دیندار ہیں۔ اُن سے مراسلت کر کے اس کا حل دریافت کیجیے۔ اور مجھے بھی لکھیے ـــــ سفارت خانہ پاکستان وغیرہ میں کچھ مسلمان تو ضرور دیندار قسم کے ہوں گے۔ اُنہوں نے بھی کچھ حل نکالا ہی ہوگا۔ اور ووکنگ والے بھی اس حد تک تو مسلمان ہی ہیں۔

احوالِ غالب خوب رہی۔ ماشاءاللہ۔ ریویو اس وقت لکھ رہا تھا۔ گنجائش شاید اسی ہفتہ کے پرچہ میں نکلے تراشہ پبلشر کو پہنچے گا۔

مدت قیام کتنی ہے؟ واپسی میں گِب کو بھی ملی گڑھ کی دعوت دیجیے گا۔ کچھ خیال پڑتا ہے کہ وہ پاکستان اور ہندوستان آ چکے ہیں۔

حسبِ فرصت وہاں کے حالات ضرور لکھیے گا جو میرے کام کے ہوں۔ والسلام

دریاباد۔ ۵ / اکتوبر ۵۳ء   دعاگو: عبدالماجد

(۷)

برادرم سلمہ اللہ! السلام علیکم۔

ڈیلی ٹیل پا کر دل سے دعائیں نکلیں۔ جزاک اللہ۔ ایسے ہی کرم کا آئندہ بھی منتظر رہوں گا۔ اپنی خیریت، مشاغل اور ہر ایسی چیز جو صدق یا معارف کے کام کی ہو ان سب کا مشتاق رہوں گا۔

اس شرط کے ساتھ کہ آپ کے وقت اور جیب پر بار نہ پڑنے پائے۔

بحمداللہ آج ۱۸ روزے مئی کے مہینہ میں ہم کم ہمتوں اور ناتوانوں کے بھی ہو گئے۔ والسلام۔

دریاباد۔ ۲۲ / مئی ۵۴ء   دعاگو و دعاخواہ: عبدالماجد

(۸)

برادرم! وعلیکم السلام

مرحبا و جزاک اللہ۔ پراگریسو اسلام، کا ذکر انشاءاللہ کر دیا جائے گا۔ نیوز آف دی ورلڈ، ڈیلی میرر، وغیرہ کا عطیہ لطف بالائے لطف۔ آنکھیں مدت سے انہیں دیکھنے کے لیے ترسی ہوئی ہیں۔

امریکن میگزین بھی اگر آسانی سے مل جائیں تو سبحان اللہ......

دریاباد۔ ۲۲ / دسمبر ۵۴ء   شکرگزار و دعاگو، عبدالماجد

(۹)

برادرم! وعلیکم السلام

خوب مفصل وقائع نامہ میری عین خواہش کے مطابق، فجزاکم اللہ۔ گیوم کی کتاب، پراگریسو اسلام کے دو نمبر، اور متعدد لندنی پرچے سب پہنچ گئے تھے۔ اور سب کی رسید بھی فوراً لکھ چکا تھا۔ حیران رہ گیا یہ سن کر کہ وہ خط نہیں پہنچا۔ خدا کرے بعد کو پہنچ گیا ہو۔

آپ کے اس مکتوب کا بیشتر حصہ صدق میں انشاءاللہ نکلے گا۔ اس کے قبل والا مکتوب تو نکل ہی چکا ہے۔ لندنی پرچوں کے لیے شکرگزار خاص طور پر ہوا۔ اب ان پرچوں کو ہندوستان میں آنکھیں ترستی رہتی ہیں۔

آپ کے لیے دعا زبان سے نہیں دل سے نکلتی ہے۔ اللہ خیریت دارین کے ساتھ وطن واپس لائے۔

آپ کا آکسفرڈ کا پتا بھول گیا یعنی کالج کا نام یاد رہا۔ دفتر بھیجے دیتا ہوں اگر وہاں درج ہوا تو وہیں ڈاک میں پڑ جائے گا۔

والسلام

دریاباد۔ ۱۷ / جنوری ۵۵ء   دعاگو و محتاجِ دعا، عبدالماجد

عبدالعزیز کمال

(۱)

کرم گستر! وعلیکم السلام

صحیح پتا اسی کارڈ میں درج ہے۔ لکھنؤ کے پتے سے خط بہت دیر میں ملتا ہے۔

۱۔ حضرت جوہر کا تو کہنا ہی کیا، باقی شبلی و اکبر بھی۔ میرے حق میں بڑے مہربان تھے بھولوں

کے دل بڑھانا، اُن کی ہمت افزائی کرتے رہنا، بزرگوں کے معمولات میں داخل ہے، اور تینوں حضرات میرے بزرگ ہی تھے۔ اُن کے حوصلہ افزایانہ الفاظ میں میری اہلیت کو ذرا بھی دخل نہیں۔

۲- آپ جو دریافت فرمانا چاہیں بے تکلف دریافت کر سکتے ہیں۔

۳- اُس زمانہ میں تو میں اسرارِ خودی کے کوچہ ہی سے سرے سے نابلد تھا۔ انگریزیت اور الحاد میں غرق تھا۔ کئی سال بعد جب ذرا ہوش آیا، جب سے اقبالؔ ہی کو حق پر سمجھتا ہوں۔ اکبر تو یوں بھی دوسرے شاعروں کا کلام کم ہی پڑھتے تھے اور اقبال تو اُن کے خورد ہی تھے۔ اس وقت کی عام فضا سے متاثر ہو کر حضرت اکبر بھی انہیں تصوف کا دشمن سمجھے، حالانکہ اقبال منکر تصوف کے نہیں بلکہ صرف رواجی اور غیر اسلامی تصوف کے تھے۔ بہر حال غلطی اور غلط فہمی کے شکار اکابر ہی ہو جاتے ہیں۔

والسلام

۹ / اپریل ۱۹۵۱ء

دعاگو عبدالماجد

آپ کے محکمہ میں ایک افسر میرے ایک عزیز بھی تھے۔ اس وقت مری میں تعینات ہیں۔

(۲)

۲۷ / اپریل ۱۹۵۱ء

مکرم گسترا! وعلیکم السلام

۱- اُن عزیز کا نام فہیم الزمان ہے۔ مری میں R.P.A.S کے چیف انسٹرکٹر ہیں۔

۲- تصویر کو نہ پوچھیے۔ چند برسوں کے اندر خدا معلوم کس کس طرح اپنے کو بچایا ہے۔ ریڈیو میں جب تقریر کرنے جاتا ہوں، تو وہاں تو یہ بلا اکثر ہی مسلط ہوتی رہتی ہے۔

شرعی ناجوازی کے علاوہ اس میں دخل طبعی کراہت کو بھی ہے۔ اپنی صورت مجھے نہایت درجہ ناپسند ہے۔ ایک عمر ہو گئی جب سے آئینہ نہیں دیکھا۔ اتفاقی نظر پڑ جانے سے تکلیف ہی ہوتی تھی، تو تصویر کیا کھنچواتا۔

جن حضرات کے نام آپ نے لیے اُن میں اس اعتبار سے مستند صرف مولانا سلیمان ندوی ہیں۔ وہ اب سالہا سال سے اس باب میں محتاط ہیں۔ کوئی چوری چھپے کھینچ لے تو اور بات ہے۔ اس سے تو مولانا شبیر احمد عثمانیؒ تک نہ بچ سکے تھے۔

باقی گناہ کبیرہ کے درجہ میں کیں بھی تصویر کو نہیں رکھتا۔ حدیث میں ممانعت کی بھی تاویلیں ہو سکتی ہیں گو ضعیف۔

۳- اقبالؒ کے سلسلہ میں آپ نے جو کچھ کہا، بالکل صحیح ہے۔ راہ میں منزلیں بہت سی آئیں۔ کم و بیش سب جگہ ٹھہرے۔ لیکن منزلِ مقصود قرآن ہی رہی۔

• "اور جبرئیل" فلسفہ اپنے اصل اور لفظی معنی میں کسی کا بھی نہیں۔ خورد بینی مطالعہ کے بعد ہر ایک کسی نہ کسی کا خوشہ چین ہی نظر آتا ہے۔ اقبال کی طالب علمی کے زمانہ میں بڑا زور وارڈ اور میکنگر لے کا تھا۔ ان سے کچھ نہ کچھ متاثر ہونا لازمی تھا۔ اور بس۔

۴- سنہا کی کتاب پر ریویو وغیرہ پڑھے تھے۔ اصل کتاب کا مطالعہ خیال میں نہیں آتا۔ مدت سے فلسفہ کا مطالعہ بہت کم ہو گیا ہے۔ اتنے دنوں پڑھا، کچھ بھی حاصل نہ ہوا بجز الفاظ و اصطلاحات کے۔ پیاز کی طرح چھلکے ہی چھلکے۔ اب بجز بہت سی مخصوص کتابوں کے فلسفہ بالکل نہیں پڑھتا، صرف قرآن مجید اور اس کی شرحیں کافی ہیں، یا پھر دل بہلانے کے لیے ادبیات۔

۵- "آج کل" (دہلی) والا مضمون میں نے نہیں پڑھا۔ اپنے متعلق کوئی بھی مضمون نہیں پڑھتا۔ اپنی صورت کی طرح اپنی سیرت سے بھی کچھ مستقل بیزاری ہی رہتی ہے۔ ؎

غیر کیا خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے

۶- انگریزی اور اُردو دونوں ترجمے تاج کمپنی ہی کے بس میں ہیں۔ والسلام

دعاگو عبدالماجد

(۳)

۲۹ / مئی ۱۹۵۱ء

مکرم گسترا! وعلیکم السلام

ہر کسے از ظنِ خود شد یارِ من

وز درونِ من نہ جست اسرارِ من!

آپ نے بھی حسنِ ظن، مبالغہ کی انتہا کر دی ہے، اور اپنے مفروضات در مفروضات سے خدا معلوم مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا!

جواب نہیں، کیا عرض کروں۔ بجز اس دعا کے کہ اللہ آپ پر رحم فرمائے۔ اور آپ کی رہنمائی کسی واقعی اور حقیقی نائب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک کر دے۔

تصویر کی ممانعت تو حدیث سے بالکل ثابت ہے۔ میں نے اس کے صرف معصیت کبیرہ سمجھنے سے انکار کیا تھا۔ اور یہ کیا پتا کہ میں جو بچا رہا، اس میں دخل میری ذاتی کوشش کو ہی ہے۔ کہ اس پر

اسے کوئی سوال کیسے اُٹھایا جائے؟

حدیث نفس ممانعت میں وارد ہے۔ باقی حکمت ممانعت کا سوال بالکل الگ ہے۔ تاویل و توجیہہ ہر شخص اپنے ذہن کی رسائی کے مطابق کر سکتا ہے۔

رہا مسئلہ خود اعتمادی و خود داری کا۔ تو میں نے تو قرآن ہی میں پڑھا ہے کہ خدا کے رسول معصوم تک اپنے لیے یہ سمجھے ہے کہ حشر میں خدا معلوم کیا معاملہ ان کے ساتھ ہو۔ لما اذریٰ مایفعل بی تو پھر صحابہ کا کیا ذکر! اور مجھ جیسے تباہ کار و نامہ سیاہ کا نام بھی اس سلسلہ میں آنا سنجیدگی و متانت کے حدود سے تجاوز کر جاتا ہے! والسلام

دعاگو عبدالماجد

غلام یزدانی

مخدوم مکرم۔ السلام علیکم

خدا کرے آپ بخیریت ہوں اور دکن میں بندہ ہوں۔ مدت دراز ہوئی، یعنی وسط ۴۷ء میں آپ کوئی مجموعہ مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم و مغفور پر شائع کر رہے تھے۔ اور مجھے حکم دیا تھا کہ میں بھی کچھ اپنے معروضات پیش کر دوں۔ تعمیل ارشاد اسی وقت کر دی گئی تھی۔ پھر جب سے کچھ پتا نہ چلا کہ آپ کی ان کوششوں کا حشر کیا ہوا۔ کل محض اتفاق سے اپنے پُرانے کاغذات میں اُس تحریر کی نقل نکل آئی۔ اس سے یہ خیال تازہ ہو گیا۔

اب تو مدت کے بعد ہمارے یوپی کی طرح حیدر آباد میں بھی کچھ تھوڑی بہت جان پڑتی ہوئی معلوم ہو رہی ہے۔

دُعاگو: عبدالماجد

دریا باد۔ بارہ بنکی، ۱۹ر اپریل ۵۱ء

میکش بدایونی

مہربان بندہ وعلیکم السلام

رُباعیاں پہنچیں۔ ماشاء اللہ و سبحان اللہ۔ صدق کی محدود گنجائش کے مدِ نظر دو ایک تو اس میں انتخاب کر کے انشاء اللہ دے دی جائیں گی اور باقی کے لیے کوشش ہو گی کہ کسی اور پرچہ میں نکل جائیں۔ والسلام

دُعاگو: عبدالماجد

دریاباد ۸ر اپریل ۵۲ء

(۱)

صادق الخیری (دہلی)

۱۷ر اگست ۳۹ء

دریاباد۔ ضلع بارہ بنکی۔

عزیز مکرم! السلام علیکم

اب کے پرچہ اچھا نکلا۔ اس معیار کو قائم رکھیے۔ آپ کے والد مرحوم ہوا کے رخ پر چلنے والے تاجر نہ تھے مصلح تھے۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنے کی ہے اور ضرورتِ اصلاح اب پہلے سے کہیں زائد ہے:

در آکہ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی!

موقع ملا تو آج شام کو آپ کی زبان سے نکلے ہوئے بول ریڈیو پر سنوں گا۔ عورتوں کی جرنلزم پر مشرقی (یا میری زبان میں صحیح) نقطۂ نظر سے تقریر کرنے والی آپ کے علم میں کوئی خاتون ہیں؟ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن والوں نے مجھ سے مشورہ کیا ہے کیپٹن A.M. LU... کی کتابیں موقع ملے تو ضرور مطالعہ کر ڈالیے:-

Truth about child birth, The women vindication, Future of women

وغیرہ نیز "یونیورسل ہسٹری آف دی ورلڈ" میں مضمون Feminine Influence in Politics

والسلام عبدالماجد

(۲)

خط کی پہلی ہی سطر میں انجمن خدام الدین کے رسالے اسلام کا ذکر آیا ہے۔ یہ رسالہ خواجہ عبدالوحید مرحوم کی ادارت میں نکلتا تھا۔

۲۴ر اگست ۳۹ء

دریاباد، ضلع بارہ بنکی

عزیز گرامی! وعلیکم السلام

لاہور کا انگریزی جریدہ اسلام آپ کی نظر سے گزرتا ہو گا۔ احتیاطاً ایک نمبر بھیج رہا ہوں۔ اس نمبر میں شذرات Ludiminci کی ایک کتاب پر مبنی ہیں۔ اکثر شذرات ایسے ہی ہوتے ہیں۔

کٹنگز کے لیے آپ نے خوب یاد دلایا۔ ان شاء اللہ اب خیال رکھوں گا۔ میں نے دریافت کیا تھا کہ کوئی خاتون آپ کے علم میں اگر ایسی ہوں جو عورتوں کی جرنلزم پر مشرقی،

اسلامی نقطۂ نظر سے بول سکیں تو ان کا پتا لکھ دیجیے۔ اس کا کچھ جواب نہ ملا۔ اب ایک خاتون کو میں نے خود سوچا ہے۔ دیکھیے تجربہ کے بعد کیسی نکلتی ہیں۔

میں ریڈیو عموماً صرف رات کے ۹ بجے سے ۱۰ بجے تک سنتا ہوں یعنی خبروں اور دو ایک تقریروں کے لیے آپ کا نام دیکھ کر، اسی روز شام کو وقت نکالا۔ افسوس ہے کہ فضا بہت خراب تھی۔ تڑ تڑ گھر گھر، برابر لگا ہوا۔ یوں تو الفاظ بہت صاف آ رہے تھے لیکن معاً اس شور میں دب جاتے تھے۔ گویا کل ملا کر ۵ منٹ آپ کی تقریر سنی ہوگی۔

subjucation of women کا حال نہ پوچھیے۔ کالج کے زمانے میں ۱۹۱۱ء تا ۱۹۱۲ء میں اس کے عشاق میں تھا۔ سطروں کی سطریں حفظ تھیں۔ خود یہ کتاب بھی بار بار پڑھی، بلکہ ترجمہ بھی اس کا شروع کر دیا تھا۔ اب ان "ایام جاہلیت" پر ہنسی آتی ہے۔

ہاں، خوب یاد آیا۔ میں نے مدت ہوئی اپنا انگریزی پارہ قرآن آپ کو بھیجا تھا۔ اب یقیناً خالی ہوگا۔ اس کی ضرورت کئی بار پڑی۔ اگر بہ آسانی واپسی ممکن ہو تو سپرد ڈاک کر دیا جائے وقت ہو تو جانے دیجیے۔

والسلام، عبدالماجد

(۳)

دریاباد۔ بارہ بنکی۔ ۱۴ر اگست ۴۳ء

عزیز مکرم! وعلیکم السلام

محبت نامہ بڑی مدت کے بعد ملا، دل خوش ہو گیا۔ کتابیں رکھ لی ہیں۔ صدق میں ریویو انشاء اللہ ضرور کر دیا جائے گا۔ خود اب fiction کی کتابیں صرف ضرورتاً ہی پڑھتا ہوں، ورنہ جی بالکل نہیں لگتا۔ والسلام

دعاگو، عبدالماجد

مسعود حسن رضوی ادیب (لکھنؤ)

(۱)

رزم نامہ اور شاہی اسٹیج پر اردو انعامی کمیٹی کے فیصلے پر دو ہزار کے انعام پر مبارک باد کا خط۔ بزم ہائے سے مراد شاہی اسٹیج ہے جس میں واجد علی شاہ کے زمانے کی اندر سبھاؤں کے تفصیلی حالات ہیں۔

دریاباد ۵ مارچ ۵۲ء

کرم گستر! السلام علیکم

دونوں کتابوں پر دو ہزار کے انعام کی خبر تو اس سے قبل ہی مل چکی ہوگی۔ مبارکباد پیش کرنا محض رسم ادا کرنا ہے۔ رزم نامہ کی داد دل سے دیتا ہوں۔ صدق میں بھی لکھ چکا ہوں واقعی آپ کی زندگی کا ایک کارنامہ ہے۔ لیکن اس رزم نامہ کے ساتھ اس دوسرے بزم نامے کے لیے کیا عرض کروں۔ تلاش و تحقیق بلکہ توفیق اس کی بھی قابل داد کیا قابل رشک لیکن اس سب کا آخر کیا حاصل؟ دنیا اگر ان خوردبینی جزئیات سے بے بہرہ رہ جاتی تو کیا مضائقہ تھا۔ لاشۂ بے جان کو بنا سنوار کر رکھنے، لباس فاخرہ پہنانے، عطر لگانے کا مصرف مجھ کم فہم کی سمجھ میں تو آیا نہیں۔ کاش اتنا وقت عزیز آپ نے کسی اعلیٰ موضوع پر صرف کیا ہوتا۔ اس جسارت بلکہ گستاخی کے حق میں میرا اخلاص شاید کچھ شفیع ہو جائے۔

دعاگو: عبدالماجد

(۲)

کرم گستر! وعلیکم السلام

بڑے انتظار کے بعد آج اپنے عریضے کی رسید مجھ کو ملی۔ میں تو مایوس ہو چکا تھا۔

یہ آخر آپ لوگوں کو ممبروں کا کیا شوق چرایا ہے! اپنی لنگوٹی کی خیر منائیے!

چھ ممبر تو آپ کے اُس دور اتحاد و شرافت میں بھی نہ ہو سکے تھے چہ جائیکہ اب اس کے خواب دیکھیں! پورے چھ نام پیش کر کے تو اپنے کو شکست دینا ہے۔

زیادہ سے زیادہ دو کی گنجائش نکل سکتی تھی ورنہ میں تو توحید ہی کا قائل ہوں۔ میرے مذہب میں تو دوئی کی بھی گنجائش نہیں۔ اس شرک جلی پر آمین کیسے کہہ سکتا ہوں! زیادہ سے زیادہ اتفاق رائے جس ایک نام پر ہو سکتا ہے وہ ڈاکٹر صدیقی ہی کا نام ہے۔

سفر سے معذوری اپنے ضعف ہمت کی بنا پر ہے، دین کی کسی سختی کی بنا پر نہیں۔ جو عالی ہمت ہیں وہ اس سے بھی کڑے موسم میں روزے رکھ کر جہاد کر سکتے ہیں۔

اکیڈمی کی سرکاری نامزدگیوں پر صدق میں جو نوٹ لکھا تھا، حاضر خدمت ہے۔ یہ تراشہ بھیجنے لگا تو اسی نمبر میں تفسیر سورۂ قریش پر بھی نظر پڑ گئی، وہ بھی ملفوف ہے۔ والسلام

دعاگو، عبدالماجد

دریاباد، ۱۲ر مئی ۵۳ء

(۳)

مولانا کے سننے میں یہ خبر آئی تھی کہ مسعود صاحب اور حیات اللہ انصاری صاحب انجمن ترقی اردو کی مالی مدد کے لیے اردو بازار میں دہی بڑے کی دکان لگانے والے ہیں۔

دریاباد

۲۸ دسمبر ۱۹۵۵ء

بسم اللہ

کرم گستر! السلام علیکم

اردو بازار میں دکانداری تک میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن خدا کے لیے کہیں دہی بڑے کچالو یا چاٹ جور گرم کی دکان نہ کھول بیٹھیے گا۔

آستے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

دکان لگانا ہی ہے تو یا تو کباب پراٹھے گرما گرم یا پھر شیرمال کشمیری چائے یا دونوں ناممکن ہوں تو پھر گوٹا مالا۔ بہرحال بازاریت میں بھی بانکپن نہ چھوٹنے پائے۔

تقلید میں بھی کچھ رہے ایجاد کا مزہ

والسلام

دعاگو: عبدالماجد

(۴)

زیر نظر خط میں "رزم نامہ" واقعات کربلا میں مکتوب الیہ کی مرتبہ اور "شاہی اسٹیج" ریاست اودھ کے حالات میں مکتوب الیہ کی دوسری تالیف کا ذکر آیا ہے۔ انعامی کمیٹی کی مجلس سے مراد حکومت یوپی کی مقرر کردہ اس کمیٹی کی میٹنگ ہے جو کتابوں پر انعامات کے فیصلے کے لیے بنائی گئی تھی۔

دریاباد

۱۰ مئی ۱۹۵۸ء

کرم گستر! السلام علیکم

"رزم نامہ" عرصہ ہوا پڑھ لی تھی اور اپنے تاثرات اسی وقت سپرد قلم کر دیے تھے لیکن صدق میں گنجائش کا انتظار ہفتوں نہیں مہینوں کرنا ہوتا ہے۔

آپ کے حسن انتخاب، حسن ترتیب کا کیا کہنا اور کلام کا کمال یہ ہے کہ مجھ جیسا بدعقیدہ اور "واقعات" کی تاریخیت سے بڑی حد تک منکر شخص بھی گھبرا اٹھا قبول کیے بغیر نہ رہ سکا۔ آنکھ میں آنسو آ گئے۔

جی نہیں، شاہی اسٹیج نہیں آئی مجھے زیادہ انتظار تو آپ کی دوسری کتاب تذکرۂ نادرہ کا

تھا۔ اس انعامی کمیٹی کی مجلس دیکھیے اب کب تک ہوتی ہے ابھی تو کتابیں بھی نہیں وصول ہوئی ہیں۔ والسلام

دعاگو عبدالماجد

(۵)

اس خط میں سرکاری کونسل سے اشارہ یوپی کی قانون ساز اسمبلی کی طرف ہے اور ہوشیار جنگ سے اشارہ مکتوب نگار کے دوست ذوالبہر ہوشیار جنگ کی طرف ہے انھوں نے "مشاہدات" کے عنوان سے جو اپنی خود نوشت لکھی ہے اس میں حیدرآباد کی جلسی معاشرتی زندگی کی بہت سی جھلکیاں موجود ہیں جس سے کسی حد تک یہ ضرورت پوری ہوتی ہے جس کی طرف مکتوب نگار نے اشارہ کیا ہے شاہان اودھ کی زندگی کے بارے میں ایسی کوئی کتاب تیار نہیں ہو سکی جس کی آرزو مولانا دریابادی نے کی تھی۔

دریاباد

۴ نومبر ۱۹۵۸ء

کرم گستر! السلام علیکم

بے خبر تھی کہ آپ کا ایسی اردو کمیٹی سے استعفا خود اسی کمیٹی کی موت کا پیش خیمہ ہو گا پھر گورنمنٹ تو جیسے کوئی بہانہ ڈھونڈھ رہی تھی میں نے ایک خط سکریٹری صاحب کو ضابطہ سے لکھا اور کچھ تھوڑی بہت کوشش کسی ذریعہ سے کرائی۔ دونوں صورتیں بالکل بے نتیجہ رہیں۔ ممکن ہو تو زرا حیات اللہ انصاری صاحب کو کھڑکھڑا لیتے۔ قومی آواز کے ایڈیٹر بھی ہیں اور سرکاری کونسل کے ممبر بھی۔

ہاں صاحب آپ لکھنؤ میں رہتے ہیں کسی صاحب کو پکڑ کر شاہان اودھ کی پوری زندگی پر کتاب لکھوا لیتے جس میں مندرج ہو نہ جو محض واقعاتی (OBTECTIVE) حیثیت سے جس میں صبح و شام دن رات کے حالات درج ہوں۔ کھاتے کیا تھے اور کیوں کر؟ دلچسپیاں کیا کیا رہتی تھیں؟ امیروں، وزیروں، عام رعایا کے ساتھ برتاؤ کیا رہتا تھا؟ دربار کے آداب کیا تھے؟ عبادات، عقائد، مذہبی تقریبات کا کیا رنگ تھا حمام بیت الخلا، کے آداب کیا تھے؟ لکھنے پڑھنے کا شوق کہاں تک تھا؟ شادی، بیاہ، جنسی زندگی کی تفصیلات وقس علی ہذا۔

ہوش بلگرامی مرحوم سے میں نے وعدہ لے لیا تھا کہ اس قسم کی ایک مکمل کتاب وہ نظام دکن، امراء حیدرآباد، والیان بھوپال و رام پور پر اپنی ذاتی معلومات سے لکھ دیں گے۔ خیر وہ بے

چارے تو گزر ہی گئے۔

اب کسی اور سے یہ کام شاہان اودھ سے متعلق لیجیے۔ کچھ دن بعد کوئی اتنا جاننے والا بھی باقی نہ رہے گا۔

دعاگو، عبدالماجد

(۶)

مولانا دریابادی نے لکھنؤ ریڈیو سے "میری ادبی زندگی کے ناقابلِ فراموش واقعات" کے عنوان سے ایک تقریر کی تھی جسے کشور ب الیف نے بہت پسند کیا، اس کی تعریف میں ایک خط لکھا جس میں کوئی شعر بھی نقل کیا تھا۔ مولانا کا یہ خط اُسی خط کا جواب ہے۔

دریاباد ! ۳۰ر اگست سنہ۶۰ء

مکرم گسترا! السلام علیکم

کشمیری بھانڈوں کا شعر صاحب عوامی اسٹیج و شاہی اسٹیج کی زبان سے سن کر اگر بے ساختہ دونہ لکھ بھیجوں تو ظلم ہے شعر سنانے والے اور سننے والے دونوں پر۔
کہیے کہ کشمیری بھانڈوں کو کوئی ادیب اب تک ایسا قدرداں ملا ہوگا۔ والسلام

دعاگو، عبدالماجد

(۷)

زیرِ نظر خط میں ذکر پروفیسر احتشام حسین صدر شعبہ اُردو الٰہ آباد یونیورسٹی کا آیا ہے۔ مرحوم اپنی شرافت کے لیے مشہور اور مولانا دریابادی کے بڑے عقیدت مند تھے۔ آگے چل کر ذکر مولانا دریابادی کے کالج کے ساتھی اور دوست ظفر حسین خاں کا آیا ہے جن کی کتاب "نوائے فلسفہ" دارالمصنفین، اعظم گڑھ نے شائع کی ہے۔

دریاباد ! ۳۱ر اکتوبر سنہ۶۰ء

مکرم گسترا! السلام علیکم

۲۷ر کو لکھنؤ ریڈیو دہلی کی فرمائش پر ایک ادبی ملاقات ریکارڈ کرا آیا۔ تجربہ محکمہ والوں کی طرف سے بڑا ہی تلخ بلکہ صبر آزما رہا۔

وہ تری گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مردے نکل پڑے
یہ مری جبینِ نیاز تھی کہ جہاں دھری تھی دھری رہی

دامنظر۔ اب دہلی سے جب کبھی کوئی فرمائش آجاتی ہے یہی صورت پیش آتی رہتی ہے۔
لکھنؤ اور دہلی کی رقابتوں کی روایت اور جہاں کہیں ختم بھی ہو چکی ہو بہرحال لکھنؤ ریڈیو میں زندہ ہے —— ہر گریہ کے عقب میں خندہ۔ ان تلخیوں کے ساتھ اپنے احتشام صاحب کی شرافت، معقولیت، انسانیت کا بھی تجربہ ہو گیا۔ لڑائی میری طرف سے لڑتے رہے —— اور ہر قدم پیمانے کو پیچھے کر کے بھی کو آگے گیا۔
نفسِ مکالمہ کا ہر استفسار، استعبار، استعلام، استفہام پروفیسرانہ تھا اور میری گزارش طالب علمانہ۔ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پسا۔ میرے ساتھ ان کی تقریر پر بھی سنسری نشتر اچھا خاصا چلا۔ بہرحال کٹی پھٹی، لنڈی منڈی لولی لنگڑی تقریر جیسی بھی ریکارڈ ہو پاتی ہے انشاءاللہ ۸ر نومبر کی رات ۹½ بجے دہلی سے آئے گی۔ آپ کی قدر افزائی کے اعتماد پر یہ رام کہانی آپ لکھ بھیجی۔
مکرر ظفر حسین خاں صاحب کو بلرام پور اسپتال کمرہ ۹ میں دیکھ آیا۔ بے چارے سخت علیل ہیں۔ والسلام

عبدالماجد

(۸)

اُردو کے مسئلے کا جائزہ لینے کے لیے حکومت یو پی نے جو کمیٹی تشکیل دی تھی، اس کے مرتبہ سوال نامے کا ذکر اس خط میں آیا ہے۔ انجمن سے مراد انجمن ترقی اُردو، لکھنؤ ہے، جس کی طرف سے جواب بھیجا جاتا تھا۔ دوسری خاص بات جس کی طرف اشارہ مقصود ہے، یہ ہے کہ پروفیسر آل احمد سرور نے ظفر حسین خاں کے انتقال پر ہماری زبان علی گڑھ میں جو تعزیتی نوٹ لکھا تھا اس میں مرحوم کو علامہ شبلی کا شاگرد لکھ دیا تھا، حالانکہ حقیقت یہ نہ تھی۔

دریاباد ! ۱۷ر اگست سنہ۶۱ء

برادرم! السلام علیکم

اگر بہ آسانی ممکن ہو تو جواب اردو سوال نامے کا آپ کی انجمن کی طرف سے جاتے وہ میری نظر سے بھی گزر جاتے۔ عجب کیا جو میں اس کی تائید کر دینا کافی سمجھوں۔
واللہ اعلم میری جانشینی کس کے حصے میں آئی۔ پرسوں لکھنؤ جا کر مرحوم ظفر حسین خاں کی قبر پہ فاتحہ پڑھ آیا۔ بالکل پائینتی ان کے بچہ کی قبر کا کتبہ بڑا موثر نظر آیا۔ سرور صاحب نے خدا معلوم یہ کہاں سے لکھ دیا کہ مرحوم مولانا شبلی کے شاگرد تھے۔ والسلام،

دعاگو: عبدالماجد

(۹)

زیرِ نظر خط میں یو۔پی گورنمنٹ کی اس کمیٹی کا ذکر آیا ہے جو آچاریہ کرپلانی کی صدارت میں وزیرِ اعلیٰ یو۔پی، سی۔بی گپتا نے اردو کے مسائل کا جائزہ لینے کے لیے قائم کی تھی۔ مولانا دریابادی اس کمیٹی کے رکن تھے، بعد میں اس سے مستعفی ہو گئے تھے۔ اوپر کے خط میں جس جانشینی کا ذکر آیا ہے، وہ اس کمیٹی سے مولانا دریابادی کے استعفے کے بعد کا مسئلہ ہے۔

دریاباد — ۷ راکتوبر سنہ ۶۱ء

کرم گسترا! السلام علیکم

کل سرکار کے ہاں سے اطلاع آئی کہ تمہارا استعفا اس لسانی کمیٹی سے منظور کر لیا گیا اور اب تمہاری جگہ کسی اور ممبر کے انتخاب کی ضرورت نہیں۔ سچ کہا جس نے کہا تھا۔

گھبرا کے اور غیر کے پہلو سے لگ گئے
دیکھا اثر یہ نالۂ بے اختیار کا

اور اس نے بھی سچ کہا جس نے یہ کہا ہے

یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

والسلام
عبدالماجد

(۱۰)

پرنس معظم جاہ حیدرآباد (دکن) کے حالات میں "دربار در بار" مصنفہ صدق جائسی کی طرف اشارہ ہے۔

دریاباد — بسم اللہ

۸ رستمبر ۱۹۶۲ء

محترم! السلام علیکم

دربار در بار موصول۔

خدا خدا کر کے اس طوفان کا زور گھٹا۔

اے سبحان اللہ، یہ "طوفان" کی مناسبت سے "گھٹا" کیا خوب! دیکھیے اس داد پر مجھ غریب پر نہ برس پڑیے گا۔ والسلام

دعاگو عبدالماجد

(۱۱)

اس خط میں مبارک باد مکتوب الیہ کے کسی منصب پر تقرر پر ہے اور داد اس بیان کی معقولیت کی ہے جو لکھنؤ میں محافلِ میلاد کے قیام و اہتمام کے سلسلے میں شیعوں اور سنیوں میں پیدا ہو جانے والے اختلاف کے سلسلے میں تھا۔

دریاباد — ۸ رستمبر ۶۳ء

کرم گسترا! السلام علیکم

تقررِ جدید پر مبارک باد کئی دن سے پیش کرنے والا تھا بس رہ ہی رہ گیا۔ صدق کا نوٹ بھی لکھنؤ سے اس خط کے ساتھ موصول ہو جاتے گا۔

لکھنؤ کی محفل میلاد کے سلسلے میں آپ کا بیان خوب نکلا۔ پہلا بیان تو محض غنیمت کے درجہ کا ہے، لیکن آپ کا بیان واقعی قابلِ داد ہے، اس لیے یہ خط لکھنے پر فوراً آمادہ کیا۔ والسلام

دعاگو و دعا خواہ
عبدالماجد

(۱۲)

حامد علی خاں امروہہ کے رہنے والے، لکھنؤ کے مشہور بیرسٹر اور ابتدائی دور میں کانگریس کے حامیوں میں سے تھے۔ کرامت حسین مشہور قانون دان اور کرامت حسین گرلز کالج لکھنؤ کے بانی تھے۔ حامد علی خاں کی کتاب "لنگویج کنٹروورسی" پر ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی نے یہ نوٹ تحریر کیا ہے، "اینٹونی میکڈانلڈ گورنر صوبہ یو پی نے سنہ ۱۹۰۰ء میں عدالتوں میں دیوناگری رسم الخط میں درخواستیں قبول کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ بڑے ہندی نواز اور اردو مخالف تھے۔ اس کے خلاف محسن الملک کی قیادت میں اردو کی حمایت میں تحریک شروع ہوئی۔ گورنر نے ایم اے او کالج کی ایڈ بند کر دینے کی دھمکی دی اور محسن الملک کو انجمن حمایت اردو کی صدارت سے استعفا دینا پڑا۔ یہ کتاب حامد علی خاں نے اسی موضوع کے متعلق مرتب کی تھی اور اس میں اردو رسم الخط کی حمایت میں مضامین اور مراسلات کو جمع کیا تھا۔"

۱۴ رجون سنہ ۶۲ء

مخدوم مکرم! السلام علیکم

حامد علی خاں مرحوم کی ایک کتاب جسٹس کرامت حسین پر تھی، میرے ہاں سے مدت ہوئی غائب ہو گئی۔ اب اس کی ضرورت آ پڑی ہے۔ عجب نہیں کہ شیعہ کالج لائبریری میں ہو اور آپ کے تعلقات شیعہ کالج سے ضرور قائم ہوں گے۔ اگر آپ کے ذریعہ سے دو چار دن کے لیے حاصل ہو سکے تو کسی کو بھیج کر آپ سے منگوا لوں۔

ہاں صاحب کئی سال ہوتے ہیں میں نے انہیں حامد علی خاں کی ایک انگریزی کتاب آپ کی خدمت میں پیش کی تھی، نام غالباً [illegible] Language Controversy تھا اور ناگری رسم الخط سے متعلق مراسلات اور مضامین کا مجموعہ تھی۔ آپ نے واپس تو یقیناً فرما دی ہوگی۔ لیکن احتیاطاً ذرا ایک بار پھر نظر ڈال لیجیے گا۔ والسلام

دعاگو عبدالماجد

(۱۳)

حکومت ہند نے مولانا کو عربی میں نیشنل اسکالر کا اعلیٰ ترین علمی اعزاز سے نوازا تھا۔ اس کے ساتھ ڈیڑھ ہزار سالانہ کی پنشن بھی تھی جو بعد میں تین ہزار کر دی گئی تھی۔ مسعود حسن صاحب نے اس اعزاز کے ملنے پر مبارک باد کا خط لکھا تھا، زیر نظر خط اسی کے جواب میں ہے۔

دریاباد ۲۴ اگست سنہ ۶۶ء

برادرم علیکم السلام

سرکاری سند سے کہیں بڑھ کر قابل قدر تو آپ سے مخلص اہل علم حضرات کا اخلاص و حسنِ ظن ہے۔ رہی اہلیت اور نااہلی تو نااہل ترین تو میں خود ہی ہوں۔ یہ محض کسی کی صفت ستاری ہے جو ہر عیب پر پردہ ڈالے ہوئے ہے۔

والسلام دعاگو:

عبدالماجد

(۱۴)

اس خط میں ادنا ذکر اس سرکاری تقریب کا آیا ہے جو سال گزشتہ علمی اور دیگر خدمات کے سلسلے میں اعزاز پانے والوں کو عطائے اسناد کے لیے منعقد کی گئی تھی۔ مولانا دریابادی نے صفوں کی ترتیب پر اپنے تکدر کا اظہار کیا ہے۔ آخر میں ذکر مولانا کے ہمسایہ مسٹر ضیاء الدین حسین نیوتنی ضلع اناؤ ریٹائرڈ پوسٹ ماسٹر اور سید آل رضا مشہور اور خوش گو شاعر کا آیا ہے۔ جو جسٹس محمد رضا جج اودھ چیف کورٹ کے بیٹے تھے۔

دریاباد ۱۹ اپریل سنہ ۶۷ء

مخلص نواز، وعلیکم السلام

آپ کے وفورِ اخلاص نے دوبارہ آپ سے تہنیت نامہ لکھوا دیا۔ یہ کوئی نیا اعزاز نہیں وہی پارسال ۱۵ اگست والا ہے اس کی باضابطہ عطائے سند کی تقریب اب ہوئی تھی۔ آگے کی صفوں کی صفیں پدم بھوشن پدم شری وغیرہ سے بھری ہوئی تھیں۔ انھیں میں فلاں گویے فلاں سازندے فلاں سارنگیے بھی تھے اور آخری بالکل آخری صف ہم خاکساروں اہل علم کے لیے تھی۔ دو سنسکرت والے اور ایک عربی و فارسی والے کے لیے۔ منظر صبر آزما ہونے کے ساتھ ساتھ تجربہ آموز بھی رہا۔

صدق جائسی مرحوم کی صاحب زادی کا خط آیا تھا کہ مرحوم کا دیوان بھی تیار ہے اور دربارِ دُربار کے دوسرے حصے بھی، کچھ تم ان پر لکھ دو۔ جواب لکھ دیا کہ دربار کی حد تک تو ملتزم ہوں۔ باقی دیوان پر لکھنے کے لیے مجھ سے کہیں زیادہ اہلیت جناب مسعود حسن رضوی رکھتے ہیں۔ دو ہفتے کے بعد یہ خط مردہ خطوط سے زندہ ہو کر واپس آیا کہ مکتوب الیہ کا پتہ نہیں چلا۔ حالانکہ پتہ انھیں کیپٹن سنگھ کا لکھا ہوا تھا۔

ہاں صاحب میرے گھر میں ضیاء الدین حسین مرحوم کی بھانجی ہیں۔ گویا نیوتنی ان کا ننھیال ہے۔ اکثر ذکر اپنی ایک خالہ کا کرتی رہتی ہیں بڑی محبت سے۔ یہ سید آل رضا کی والدہ تھیں اور بیان کرتی ہیں کہ آپ کی بھی کوئی قریبی بہن ہوتی ہیں۔ یہ بیان صحیح ہے؟ محض لکھنے کے لیے خط کی ضرورت نہیں۔ لیکن بہرحال اسے ذہن میں رکھیے آئندہ جب کبھی کسی ضرورت سے لکھیے تو اس میں اس کا جواب بھی ہو۔ والسلام

عبدالماجد

(۱۵)

اس خط میں تفسیر ماجدی کے دوسرے دہلی ایڈیشن کی طرف اشارہ ہے:

دریاباد ۱۸ اپریل سنہ ۶۹ء

برادرم السلام علیکم

تفسیر جلد اول کو نکلے ہوئے اب کئی مہینے ہو چکے۔ جی بے اختیار چاہا کہ آپ کی نظر سے ضرور گزر کر رہے۔ بے تکلف ایک نسخہ ارسال خدمت ہے۔ اسے ہدیہ نہیں جب تک جی چاہے بہ اطمینان اپنا ہی نسخہ تصور فرمائیں۔ افسوس ہے کہ شیعہ تفسیریں تک دست

رہ سکی۔ صرف طبری کے مطالعہ کا موقع کبھی کبھی ملا۔ وہ بھی بہت کم۔

والسلام

عبدالماجد

(۱۶)

مسعود حسن صاحب کے تعلقات حسینی صاحب سے بھی بہت قریبی تھے اس لیے اُن کے نام بھی مولانا نے تعزیت نامہ لکھا۔

دریاباد

۲۹ ستمبر ۱۹۶۹ء

بسم اللہ

بندہ مہربان! السلام علیکم

علی عباس حسینی مرحوم کی سانحۂ ارتحال کی خبر پڑھ کر دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ تعزیت آپ کو پیش کر رہا ہوں

مرحوم میرے مخلصوں میں تھے۔ تہذیب و شائستگی کی تصویر بڑے شریف نستعلیق مجھ سے کچھ دن کچھ برائے نام پڑھو لکھ لیا تھا وہ رشتہ آج تک قائم رہا مجھ سے بڑے ہو کر میرے سامنے چھوٹے ہی بنے رہے۔ قبر پر چل کر فاتحہ پڑھنا ہے اور آپ اس کی رہنمائی اگر کر سکیں تو بہت خوب۔ ۵ر اکتوبر کو انشاء اللہ لکھنؤ پہنچ جاؤں گا اور قیام کچھ روز رہے گا جس دن اور جس وقت آپ کو سہولت ہو کچھ قبل سے اطلاع کر دیں خط سے یا ٹیلی فون سے ۲۲۔۔۔ آپ کے ہاں حاضر ہو جاؤں گا۔

والسلام دُعاگو:

عبدالماجد

(۱۷)

مقامی اخبارات میں مسعود حسن صاحب کی بیوی کے انتقال کی خبر پڑھ کر یہ خط لکھا۔

لکھنؤ

۲۴ر اکتوبر ۱۹۶۹ء

بسم اللہ

صورت انسے صورتی آمد برون

باز شد انا الیہ راجعون

برادرم! السلام علیکم

ابھی ابھی سانحہ کی خبر پڑھی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن
رفیقۂ حیات کی جدائی اور وہ بھی یوں آناً فاناً جس درجہ کا صدمہ بشر کے لیے ہے وہ میری بڑھانہ آپ بیتی ہے اس لیے ہمدردی اور تعزیت آپ کے ساتھ رسمی نہیں بلکہ سو فی صدی ادا رکھتا ہوں۔ اللہ ہی آپ کو صبر عطا فرمائے۔
انشاء اللہ فاتحہ سوئم میں حاضری دوں گا۔

والسلام دعاگو:

عبدالماجد

(۱۸)

دریاباد

۲۰ر دسمبر ۱۹۷۱ء

برادرم السلام علیکم

امراؤ جان ادا کے نئے ایڈیشن پر مقصود نمبروں میں خدمت گرامی میں پیش کر چکا ہوں۔
افسوس ہے کہ اس کی چھپائی میں متعدد غلطیاں رہ گئی ہیں۔
بہر حال بہ نظر اصلاح دیکھ لیجیے گا اور اگر تحریر میں زیادہ زحمت نہ ہو تو میری غلطیوں سے مطلع کر دیجیے گا۔

والسلام دعاگو:

عبدالمجید

(۱۹)

اس خط میں ذکر اس پنج ہزاری انعام کا ہے جو حکومت یو پی کی طرف سے ہر سال اردو، ہندی وغیرہ کے مسلم الثبوت ادیب کو اس کی ادبی خدمات کے صلے میں حکومت کی مقرر کردہ انعامی کمیٹی کی سفارش پر دیا جاتا تھا۔ مولانا دریابادی اس کمیٹی کے ممبر رہے تھے۔ ۱۹۷۰ء کے انعام کے حق دار مسعود حسن رضوی صاحب قرار پاتے تھے۔

۱۴ر اپریل ۱۹۷۲ء

مخدوم و مکرم السلام علیکم

"پنج ہزاری" اللہ مبارک کرے۔

یہ انعام اگر وہی ہے جو ہندی ہمیتی بابو سمپورنا نند کے زیر صدارت بہترین اردو والے کو ہر سال دیا کرتی تھی تو اس کے سلسلے میں خواہ مخواہ اتنی دیر ہو گئی۔ یہ تو آپ کو شروع میں آجانا

کئی سال قبل مل جاتا تھا۔

میں اپنی جگہ پر بھی شرمندہ ہوں کہ میں نے آپ کا نام کیوں نہ پیش کیا۔ یہ تو میرے فرائض میں داخل تھا۔

والسلام دعاگو:
عبدالماجد

سید آل عبا صاحب دہوی آوارہ

سید صاحب گورنمنٹ ہائی اسکول سیتاپور میں مولانا کی طالب علمی کے زمانے میں طالب علم تھے اور اسی وقت سے دوستانہ تعلقات تھے۔ ان کی ایک تقریر لکھنؤ ریڈیو سے نشر ہونے والی تھی مولانا نے اسی کو سننے کے لیے وقت نکالنے کا اظہار کیا ہے۔

دریاباد
۱۷ر جولائی سنہ ۱۹۵۳ء

برادرم! وعلیکم السلام

"آوارگی" کے پرچے میں یہ دعا ئے آلِ عبا خوب نکلی۔ سبحان اللہ!

ہماری کم نگاہی تم کہاں تھے ہم کہاں سمجھے

دل نے کہا، فرقۂ ملامتیہ ابھی زندہ ہے۔

کل اٹھارہ جولائی کی شب میں وقت نکال کر ضرور آپ کی پیش کردہ "بی بھٹیاری" سے دل بہلاؤں گا اور جی میں آئی تو پھر آپ کے اسٹیشن ڈائرکٹر کو اپنے تاثرات بھی بھیجوں گا۔

والسلام، دعاگو و دعا خواہ:
عبدالماجد

مولانا صبغت اللہ شہید انصاری فرنگی محلی (لکھنؤ) (۱)

مولانا شہید انصاری مولانا دریابادی کے بے تکلف اور مخلص دوست تھے۔ ان کی اہلیہ کی وفات پر مولانا نے یہ خط تحریر فرمایا۔ اس خط میں حق عصر لکھنؤ کا مشہور مقام ہے جو اس زمانے میں بکل رہا تھا۔ مولوی ہاشم مولانا شہید کے صاحبزادے ہیں، رافت مولانا کی بڑی صاحبزادی جو حکیم عبدالقوی دریابادی کو بیاہی ہیں۔ باغ مُلّا انوار حضرت فرنگی محل کا خاندانی قبرستان ہے اور حمیرا مرحومہ (م ۱۹۴۸ء) مولانا شہید کی بڑی صاحبزادی تھیں جو مفتی محمد رضا انصاری کو بیاہی گئی تھیں۔

دریاباد
۱۳ر اگست سنہ ۱۹۵۲ء
۵ بجے شام

بسم اللہ

برادرم! السلام علیکم

کیا عرض کروں کہ حق ۱۲ر اگست میں ابھی خبر صاعقہ اثر دیکھ کر دل پر کیا گزر گئی! اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیْہِ رَاجِعُون۔

کتنی دلچسپ پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ ــــــ اب ان سب پر حسرت اللہ ۳۰، ۳۵ کی رفاقت کا ٹوٹنا کوئی معمولی بات ہے۔

تعزیت کن الفاظ میں کروں اور کیا کہہ کر خود آپ کو اور پھر مولوی ہاشم سلمہٗ کو تسکین دوں! پڑھتے ہی اخبار ہاتھ سے جھٹک کر معاً دعائے مغفرت کی اور اس کے بعد یہ کارڈ لکھنے بیٹھ گیا۔ یہ کارڈ اب کل صبح ڈاک میں پڑے گا اور آپ کو کہیں پرسوں ملے گا۔

بہرحال آپ کو مبارک ہو کہ جس نے اپنی محبوبہ خدیجۃ الکبریٰ کا جنازہ اٹھایا، کفنایا دفنایا، اس سنت کا اضطراری اتباع آپ کو نصیب ہو گیا۔

آپ کی زندگی میں ایک مستقل خلا پیدا ہو گیا، لیکن آپ کو کیا خبر کہ کتنا اجر بے حساب بھی آپ کے لیے مقدر ہو چکا ہے!

رافت سلمہا لکھنؤ میں ہیں اسی ڈاک سے ابھی انہیں بھی لکھے دیتا ہوں کہ فرنگی محل فوراً جا کر حاضری دیں ــــــ میں خود عنقریب لکھنؤ آنے کو تیار ہو رہا ہوں تو سوچتا ہوں کہ بجائے فرنگی محل کے باغ ملا انوار ہی میں حاضری دوں، مرحومہ کی خاکی آرام گاہ پر اور آپ کو بھی وہیں زحمت دوں۔ مرحومہ اس وقت کیسی باغ باغ ہو رہی ہوں گی اپنے والد ماجد سے، اپنی والدہ ماجدہ سے، اپنے بھائی مرحوم سے، حمیرا مرحومہ سے اور سب سے مل کر۔

آپ بس ان کی خوشی کا تصور کر کے اپنے کو خوش کرنے کی کوشش کیجیے۔ اس دنیا کم بخت میں رکھا ہی کیا ہے بجز تکلیفوں اور مصیبتوں کے۔ اب انہیں ہر بیماری، ہر تکلیف سے آزادی مل گئی۔ گھر میں اور لڑکیاں سب اپنی ایک عزیز قریب ہی کی رحلت کا صدمہ محسوس کر رہی ہیں۔

والسلام

دعاگو و شریک غم: عبدالماجد

(۲)

مولانا شہید انصاری کے مرسلہ آموں کے تحفے کے جواب میں۔

دریاباد

۱۸ جولائی سنہ ۱۹۶۰ء

بسم اللہ

برادرم! وعلیکم السلام

ضلع کے اس پورے ملیح آباد کا جواب میرے قلم کی دسترس سے باہر ہے۔

والسلام دعاگو و دعاخواہ:

عبدالماجد

(۳)

مکتوب الیہ ڈھاکہ میں اپنے بیٹے مولوی حبیب فرنگی محلی سے ملاقات کے بعد لکھنؤ لوٹے تھے اس پر مولانا نے انہیں مبارک باد دی اور ان کے تحفۂ پنیر (cheese) کا شکریہ ادا کیا۔

دریاباد

۲۶ فروری سنہ ۱۹۶۲ء

بسم اللہ

برادرم! السلام علیکم

مع الخیر مراجعت وطن پر دلی مسرت محسوس ہوئی اور مبارک باد دلی بھی پیش کرتا۔ اس چیز کے تحفہ نے اب لازم کو الزم اور واجب کو واجب تر کر دیا جزاک اللہ وہاں تو انشاء اللہ سب خیریت ہی ہو گی۔

ملاقات آپ سے مہینوں نہ سہی لیکن احساس قرب اور امکان ملاقات خود کچھ تھوڑی نعمت ہے۔؟

"بازاریت" کی صحت میں شبہ میں اپنے قصور فہم سے نہ سمجھ سکا، لاحقہ "یت"، تو ہر اردو لفظ میں لگا کر حاصل مصدر بنایا جا سکتا ہے ——— خواہ اصلاً وہ کسی زبان کا بھی لفظ ہو جیسے انگریزیت، حیاتیت، شہریت وغیرہا۔

عید سے ایک ہفتہ بعد انشاء اللہ لکھنؤ آنے کا پروگرام ہے۔

والسلام

عبدالماجد

دانش کامل صاحب مدیر "مدینہ" (بجنور)

برادرم السلام علیکم

ذاتی طور پر آپ کا ہم خیال ہوں۔ لیکن اخبار میں لکھنے کے لیے وقت کی ضرورت ہے۔

ولیکن چو گفتی دلیلش بیار

اور وقت نکالنے سے بالکل معذور ہوں۔

صدق کے علاوہ مستقل مصروفیت قرآن مجید کی ہے۔ اُردو تفسیر کی نظر ثانی کر رہا ہوں۔ کئی گھنٹے روزانہ اس کی نذر ہوتے ہیں۔ کام ہے کہ پھیلتا اور نکلتا ہی چلا آتا ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ پہلی بار اتنی چیزیں چھوٹ کیسے گئی تھیں ——— کثرت سے آئی ہوئی فرمائشیں اس پر مستزاد۔

خیریت نامہ پاکر خوشی ہوئی۔ بوئے اخلاص اس سے چھن چھن کر آرہی ہے۔ یوں بھی آپ کی تحریریں مخلصانہ معلوم ہوئیں ——— اور یہ نعمت اللہ کی بڑی نعمتوں میں سے ہے۔ والسلام

دعاگو، معذرت خواہ: عبدالماجد

دریاباد، ۱۸ مارچ ۵۴ء

عبدالرؤف عباسی (لکھنؤ)

(۱)

عباسی صاحب صدق جدید کے پیش رو "صدق" ہفتہ وار کے منیجر تھے۔ پھر اپنا ہفتہ نامہ "حق" لکھنؤ سے جاری کیا۔ مولانا دریابادی سے اخلاص رکھتے تھے۔ انہیں اپنے ہاں محفل میلاد کی صدارت کے لیے بلایا تھا۔

دریاباد۔

۲۵ اکتوبر سنہ ۱۹۵۵ء

بسم اللہ

برادرم! وعلیکم السلام

"امر حق" سے سرتابی کی مجال کسے لیکن گوش "حق نیوش" میں عرض ہے کہ ۳۱ کی صبح سے مجھے لکھنؤ میں موجود ہونا ہے اور یہ پروگرام دو ہفتہ قبل سے طے ہو چکا ہے۔ اب کیا صورت رہ جاتی ہے کہ حاضری ۲۹ کو بھی رہے اور ۳۱ کو بھی۔ یوں بھی مسند صدارت ترک کیے ہوئے ہوں۔

والسلام معذرت خواہ:

عبدالماجد

(۲)

مکتوب الیہ کے بھائی کے انتقال پر تعزیت نامہ

دریاباد۔

۲۴ر اگست ۱۹۶۵ء

بسم اللہ

برادرم! السلام علیکم

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن حادثہ کی خبر کل سہ پہر تو ی آواز میں پڑھی۔ یہ کارڈ پہلی ڈاک سے روانہ ہے

بھائی کی جدائی کا صدمہ خانگی صدمات میں سے ایک سخت ترین صدمہ ہے۔ خصوصاً جب مرحوم بھائی عاشق زار بھی ہو۔ میں اس صدمے کا مزہ چکھے ہوئے ہوں۔

بہر حال اب دعائے مغفرت کے بجز اور ممکن ہی کیا ہے اللّٰھم اغفر لہ وارحمہ

والسلام

عبدالماجد

(۳)

مکتوب الیہ کے بھتیجے ہم نام بھتیجے عبدالرؤف جو خیر کے انتقال پر۔ مرحوم امریکہ کے ایک اخبار سے بہ حیثیت صحافی وابستہ تھے۔ وہیں کار کے ایک حادثے میں انتقال ہوا تھا۔

دریاباد

۲۰ر دسمبر ۱۹۷۰ء

بسم اللہ

برادرم! السلام علیکم

خدا کرے بمبئی سے واپسی بخیر ہوئی ہو اور مرض میں نمایاں افاقہ ہو گیا ہو، آپ لوگوں پر جو آسمان ٹوٹ پڑا اس پر سوا اس کے اور کیا عرض کیا جا سکتا ہے کہ اللہ کو کوئی بڑا امتحان لینا اور اسی کی مناسبت سے بڑا اجرِ عظیم دینا مقصود ہے جب ہی اتنی حیرت انگیز، حسرت انگیز، عبرت انگیز موت واقع کر دکھائی گئی۔ بچے اور بوڑھے اپنے اور پرائے سب ہی انگشت بدنداں! پردیس کی موت اور وہ بھی ایسی بے کسی سے خود ہی ایک پروانۂ مغفرت ہے اور موت کس کی! ایک جوان صالح کی۔ اپنے سارے کنبے کی پرورش کرنے والے اور اپنی ملت کی قلمی خدمت میں لگے رہنے والے کی۔

اللہ بال بال مغفرت فرمائے اور آپ سب لوگوں کے لیے کوئی سبیل معاش جلد سے جلد نکال دے۔

اس جنوری میں لکھنؤ حاضری کا قصد ہے اور پہلا کام آپ کی خدمت میں تعزیت اور عیادت دہرے فریضے کے لیے حضوری ہے۔

مرحوم جب مجھے خط لکھتے یا جب ملتے تو اس ادب و احترام اور اس اخلاص و محبت سے کہ بالکل سگے بھتیجے کا لطف آ جاتا دل سے دعائیں بے اختیار نکل رہی ہیں ——

والسلام دعاگو و دعا خواہ؛

عبدالماجد

محمد مقتدا خاں شروانی (علی گڑھ)

(۱)

دریاباد

۹ر جنوری ۱۹۵۶ء

بسم اللہ

محترم! السلام علیکم

جی آپ کے قلم کا کیا کہنا۔ پڑھنے والوں کا دل باغ باغ کر دیا۔ ایسی شگفتہ و شاداب تحریریں اب کم ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔ اہلِ قلم کے مقتدا جو ٹھہرے۔ قلم پہ پوری رعنائی و برنائی اس سن میں آئی! بہ قول شخصے ؎

بڑھاپے میں بھی جواں ہو رہا ہوں

لیکن پھر بھی بہ قول شخصے ہی

دین اللہ کی ہے اس میں اجارہ کیا ہے؛

والسلام دعاگو؛

عبدالماجد

(۲)

مولانا شبلی پر مکتوب الیہ کے مضمون کے جواب میں۔

دریاباد

۲۵ر فروری ۱۹۵۸ء

بسم اللہ

حضرت والا! وعلیکم السلام

آپ ماشاء اللہ پیدائش کے وقت سے مقتدا ٹھہرے آپ کی ہر قراءت پر ہم مقتدیوں کو آمین کہنا واجب خواہ بالجہر ہو یا بالسّر۔

والسّلام دعاگو و دعاخواہ:

(۳)

مکتوب الیہ کی مصنفہ و مرسلہ مثنوی "نان و حلوا" کے جواب میں

دریاباد

۶ر دسمبر ۱۹۵۸ء

بسم اللہ

معلی الالقاب! السّلام علیکم

تحفۂ لطیف ولذیذ کا کیا کہنا۔ صاحب "نان و حلوا" کہیں مل پکتے تو منہ میں پانی بھر آئے تو جان سے للچائے۔

مثنوی کی بلاغت و معنویت۔ سبحان اللہ! لیکن عنوان ثانی ذرا امام فہم و سلیس بھی ہونا تھا شلاً مثنوی شیرمال و قورمہ۔ مثنوی بریانی و زردہ وغیرہ اور سب سے بڑھ کر مثنوی اشتیاق آفریں برائے دل حزیں۔

والسّلام دعاگو:

عبدالماجد

(۴)

مکتوب الیہ نے اطلاع دی تھی کہ انہوں نے علی گڑھ ہی میں "شرشو کمپنی" کے نام سے اپنے بیٹے کو جوتے کی دکان کھلوا دی ہے۔ "کیلوہ" کے عنوان سے دوشالی پر ایک نظم بھی ارسال کی تھی نیز مولانا دریابادی کو ان کے خط کی خوبی کی بنا پر "موزن رقم" کے خطاب سے نوازا تھا۔

دریاباد

۷ر اپریل ۱۹۵۹ء

بسم اللہ

والا مناقب! وعلیکم السّلام

"چارہ" صاحب زادہ کے لیے یہ "شوشو" کا شوشہ آپ نے خوب چھوڑا۔ اور اس ضلع میں ایک بات نوک کی رکھ لی زمانے کے سر پر ایک ٹھوکر جما دی۔ داستان کیلوہ کا کیا کہنا۔ پڑھنے والے کو چارہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ شروع سے آخر تک ہر شعر پر یہی کہتا رہے۔

رقیبوں، حریفوں کے چہرے پر خوب ہی سیاہی مل دی یا "کیلوہ" کی مناسبت سے یوں کہیے

کیلے کمان کے تابوت میں کیل ٹھونک دی۔

اس بدخط کو "سوزن رقم" کا خطاب دے کر آپ نے ادھر تو یکسوئی حاصل کر لی ادھر معترض کا گلا ناپ دیا۔

دعاگو،

عبدالماجد

(۵)

دریاباد

۲۴ر فروری ۱۹۶۰ء

بسم اللہ

مخدوم و مقتدا! وعلیکم السّلام

آپ کے اشہبِ قلم نے ضلع کے سبزہ زار میں ماشاء اللہ وہ جولانیاں دکھائی ہیں وہ کلیلیں بھری ہیں وہ وہ کاوے کاٹے ہیں، وہ وہ طرارے بھرے ہیں کہ میری ہمت تو تقلید کی بن نہیں پڑتی۔ اس میدان کے غازی مرد تو آپ ہی ٹھہرے۔ میرا ابلق خامہ اگر داد کی منہ زوری کا حوصلہ کرے تو پہلے ہی قدم پر ٹھوکر کھائے۔ داغ پر داغ اٹھاتے۔ ایک ہی گردنی میں درست ہو جاتے نعل در آتش ہو کر زبان بند کرتا ہوں۔ قافیہ تنگ ہے۔ یہیں سے آگے قدم بڑھانے کی ہمت نہیں کرتا۔ اللہ آپ کا کارساز ہے۔

والسّلام

عبدالماجد

(۶)

دریاباد۔

بسم اللہ

۱۱ر اپریل ۱۹۶۰ء

کرم گستر! السّلام علیکم

نظم نے مولوی نذیر احمد مرحوم کی یاد تازہ کر دی۔ وہی رنگت وہی ڈھنگ وہی ساز وہی آہنگ؛ تیسرے شعر کے پہلے مصرع میں ٹیک کے مقابلہ "لینا" کیا خوب ایک نئی صنعت "ضلع ذولسانین"۔

والسّلام

عبدالماجد

(۷)

دریاباد

۵ر دسمبر ۱۹۶۱ء

بسم اللہ

بندہ نواز! وعلیکم السّلام

اس دور ظلمت میں آپ کو "النور"[1] کی خوب سوجھی۔ میں نے اس وقت پڑھی ضرور ہوگی لیکن اتنے عرصے کے بعد کہاں یاد ——

والسلام

عبدالماجد

(۸)

دریاباد
۲۸ر ستمبر ۱۹۶۲ء

بسم اللہ

کرم گستر! وعلیکم السلام

عرض سے طول کے عشق کا کیا کہنا سطح بلند پر زاویہ نظر ہے۔ نقطہ رکھنے کی گنجائش نہیں ہے۔ خط ختم کیے دیتا ہوں کہ کہیں مقالہ اقلیدس کی شکل نہ اختیار کر لے۔

دعاگو،

عبدالماجد

(۹)

علی گڑھ کے سفر میں مکتوب الیہ کا کلام سن کر اور علی گڑھ کی گزک سے لطف اندوز ہو کر شکریہ کا خط، لکھنؤ کی زبان میں گزک کو تل شکری کہتے ہیں۔

دریاباد
۴ر دسمبر ۱۹۶۲ء

بسم اللہ

کلام حسن کر ع
قیامت ڈھائے گا جنت میں یہ بوڑھا جواں ہو کر

تل شکری کھا کر ع
نیشکر اس کے کیا مقابل ہو
آم بھی اس گزک کے آگے ہیچ

والسلام

عبدالماجد

---

[1] مراد مولوی سلیمان اشرف صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی پرانی تصنیف جو تحریک ترک موالات کی مخالفت میں تھی مکتوب الیہ نے یہ کتاب مولانا مرحوم کو بھیجی تھی۔

(۱۰)

دریاباد
۱۱ر جنوری ۱۹۶۳ء

بسم اللہ

۱۶ر دسمبر ۱۹۶۲ء کی شام ایک خوشگوار شام تھی جب چھتاری کمپاؤنڈ علی گڑھ میں ایک مقتدا کے چلاتے ہوئے شبینہ اسکول کو ایک مقتدی نے دیکھا اور دیکھا کیا یہ کہیے کہ چند منٹ کی سرسری سیر میں اس کی چند جھلکیاں دیکھ لیں! مسلمان بچوں اور بچیوں کا یہ منظر کہ بجائے سینما دیکھنے یا تاش و شطرنج وغیرہ میں وقت کی دولت لٹانے کے دینی تعلیم اور درس قرآن ہی میں مشغول ہیں آنکھوں میں نور اور دل میں سرور پیدا کرنے کو کافی تھا۔

علی گڑھ جس کا ترجمہ غالباً سید محمود مرحوم نے حصار مرتضوی کیا تھا آخر علی گڑھ ہے اور اس کا فیض حدود یونیورسٹی تک محدود نہیں شہر بھر اس اجالے میں ہے اور دینی تعلیم کی فوقانیت تو دوسرے مادی علوم سے کچھ بڑھ ہی کر ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے جواں ہمت کارکن کو عمر خضر عطا فرمائے[1]

میکشوں کے سر پہ یارب پیر میخانہ رہے

والسلام

عبدالماجد

(۱۱)

دریاباد۔
۱۷ر نومبر ۱۹۶۳ء

بسم اللہ

حضرت سلامت! السلام علیکم

"خیر مقدم"[2] پڑھا، قلم اٹھاتا ہوا، گنگناتا ہوا نہیں صاف رقص کرتا ہوا نظر آیا۔ کیا قلم کی حد تک رقاصی آپ کے مذہب میں جائز ہے۔

والسلام

عبدالماجد

(۱۲)

دریاباد
۲۹ر مئی ۱۹۶۵ء

بسم اللہ

کرم گستر بہتر ہوں! وعلیکم السلام

یہ سب ہنر تو اپنے ہنر کی ہر تحسین کو بہ حکم عقل تحسین ناشناس ہی کے حکم میں رکھتا ہے پھر بھی نفس

---

[1] جواں ہمت کارکن سے اشارہ خود مکتوب الیہ کی طرف ہے۔ [2] مکتوب الیہ کی نظم کی طرف اشارہ ہے۔

کا تقاضا ہے کہ کچھ مسافروں کو اس سے مستثنیٰ رکھا جائے اور اس مستثنیٰ جماعت کا "مقتدا" آپ سے بڑھ کر کون ہوگا۔

دعا گو و دعا خواہ:

عبدالماجد

(۱۲)

دریاباد

۱۷؍اپریل ۱۹۶۵ء

بسم اللہ

ہم سب کے امام و مقتدا! السلام علیکم

خط پر خط پہنچ رہے ہیں۔ اور ہر دفعہ لطف عبارت سے محظوظ کر رہے ہیں جواب میں کوئی بات عرض کرنے کی نہ سوجھی یہ کیوں خواہ مخواہ طول دوں ——

والسلام

عبدالماجد

(۱۳)

دریاباد

۵؍نومبر ۱۹۶۵ء

بسم اللہ

مقتدی کا سلام مقتدا کو

ارذل کا خطاب افضل سے۔

لکھنؤ میں صوبہ حج کمیٹی میں آپ کی ذات برادری کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی آپ کا ذکر خیر چھیڑ کر اکبر کا مصرع آپ کی شان میں بلکہ آپ کی آن میں انہیں سنایا۔

ع قیامت ڈھائے گا جنت میں یہ بوڑھا جواں ہو کر

سن کر پھڑک گئے اور کیسے نہ پھڑکتے اللہ نے تخلیق ہی آپ کی ایسی کی ہے پڑھے لکھوں کی زبان میں ایک مجموعہ عالم اور نخاس والوں کی بولی ٹھولی میں بوڑھے بالم۔

والسلام

عبدالماجد

جعفر علی خاں اثر لکھنوی

(۱)

خط میں جلال لکھنوی کی کتاب سرمایۂ زبان اردو پر مکتوب الیہ کی تنقید کی طرف اشارہ ہے۔

دریاباد

۱۴؍اپریل ۱۹۵۶ء

بسم اللہ

مخدوم و مکرم! السلام علیکم

"علی گڑھ میگزین" کا "مجاز نمبر" ابھی نظر سے گزرا۔ عالم "مجاز" میں "حقیقت" ایک ہی نظر آئی اور وہ ہے آپ کا مضمون "لکھنؤ کی زبان" یا "سرمایۂ زبان اردو" پر تنقید۔ ماشاء اللہ سبحان اللہ۔ مدت کے بعد زبان پر ایسا محققانہ مضمون نگاہ کے سامنے آیا بے اختیار آپ کو لکھنے کا دل چاہا۔ اللہ آپکی عمر و صحت میں برکت عطا فرمائے میرا تو ارادہ ہے کہ آپ کی یہ ساری تحقیقات اصل کتاب پر بطور حاشیہ نقل کر لوں۔

صرف گھماگھم اور گھماگھمی کے سلسلے میں جو ارشاد ہے اس سے پوری طرح مستفید نہ ہو سکا۔ "ہمواڑی" کا بھی دونوں معنوں میں استعمال اس ہیچمدان کی نظر سے گزرا ہے۔ دعا گو:

عبدالماجد

(۲)

دریاباد

۱۴؍ستمبر ۱۹۵۶ء

بسم اللہ

مخدوم و مکرم! السلام علیکم

انشاء اللہ ۱۷؍ستمبر (دوشنبہ) کی سہ پہر کو تقریباً ۵ بجے آدھ گھنٹے کے لیے حاضر خدمت ہوں گا۔ برسات کا موسم ہے ایسا نہ ہو کہ عین وقت پر شدید بارش ہو جائے اور مجھے شرمندگی سے پانی پانی ہونا پڑے۔

والسلام دعا گو!

عبدالماجد

(۳)

دریاباد

۱۷؍اکتوبر ۱۹۵۶

بسم اللہ

مخدوم و مکرم! السلام علیکم

اس روز یقین فرمائیے کہ آپ کی گفتگو سے بہت کچھ مستفید ہو کر آیا پھر گفتگو کی لذت پر مزید کی حلاوتیں مستزاد —— دماغ اور معدہ دونوں اپنے اپنے حصے سے بہرہ ور۔

یہ فرمائیے کہ اودھ پنچ (اول) اور فسانۂ آزاد میں جو کثرت سے ترکیب "پامال سر ملک" کی آتی ہے

یہ اس بین سرپا کی ماہیت کیا ہے اور صحیح تلفظ کیا رکھتا ہے۔ کسی لغت وغیرہ میں اس کا نظر سے گزرنا یاد نہیں پڑتا۔ والسلام دعاگو، عبدالماجد

(۴)

۱۰ر دسمبر ۵۶ء

مخدوم و مکرم! السلام علیکم

کل اتفاق سے لغات النسا مؤلفہ مولوی سید احمد دہلوی صاحب فرہنگ آصفیہ میں نظر گھما گھمی پر پڑ گئی۔ تلفظ وہی ہے جو آپ نے بیان فرمایا تھا یعنی گھما گھمی نہ کہ گھما گھمی۔ جی میں آیا کہ بہ تاکید آپ کو لکھ بھیجوں۔

والسلام

دعاگو، عبدالماجد

(۵)

"نوبہاراں" اثر لکھنوی کا مجموعۂ کلام ہے جو اس زمانے میں شائع ہوا تھا۔

۱۴۔ اپریل ۵۸ء

مخلص نوازا السلام علیکم

"نوبہاراں" کا کیا کہنا، وقت نکال کر ایک، ایک شعر بغیر درمیان سے کچھ چھوڑے پڑھتا جا رہا ہوں۔ اتنی توجہ کم ہی کسی کتاب کے حصے میں آتی ہے۔

ص۴۰ پر اس شعر نے غضب ہی ڈھا دیا۔ اس سے بڑھ کر شعر تو اس دیوان میں بھی عاشقانہ رنگ میں نہ ملے گا۔

چپ بھی رہتے ہو تو گفتار کا ہوتا ہے گماں

شاذ اس طرز کی شیریں سخنی ہوتی ہے

سبحان اللہ، ماشاء اللہ۔ تصوف و معرفت کے شعر بھی ایک سے بڑھ کر ایک ہیں اس سلسلے سے الگ۔ بارک اللہ۔

والسلام۔

دعاگو، عبدالماجد

(۶)

اثر لکھنوی نے مولانا دریابادی سے یقیناً اپنی پسند کے اشعار کے انتخاب کے لیے کہا ہوگا۔

یکم مئی ۵۸ء

ذرہ نوازا وعلیکم السلام

آپ خواہ مخواہ میری عزت افزائی کے در پے ہیں۔ بہرحال جوں توں ڈرتے جھجکتے تعمیل ارشاد کر دی ہے۔ ایسا تو کوئی شاعر آج تک ہوا ہی نہیں جس کا ہر شعر یکساں مرتبے کا ہو۔ غالب کا سا نغز گفتار اور پھر منتخب شائع شدہ کلام اس پر بھی پڑھنے والا اپنے رنگ کے شعر بس کچھ ہی پاتا ہے۔

ایک صاد، علامت میری پسند کی ہے اور ڈبل صاد علامت بہت زیادہ پسند کی ہے۔

باقی ناپسند کا کوئی سوال تو آپ کے کلام میں پیدا ہی نہیں ہوتا۔

مرزا محمد ہادی رسوا مرحوم سے میں نے کسی مشکل شعر کا مطلب دریافت کیا جواب میں لکھا کہ میں کبھی شعر پر غور و فکر نہیں کرتا۔ بس جو شعر پہلی ہی نظر میں پسند آ گیا چن لیتا ہوں۔ باقی کو یہ سمجھ کر چھوڑ دیتا ہوں کہ میرے لیے نہیں ہیں۔ بات خوب اور میرے دل کی کہی۔ جس شعر کے سمجھنے میں زور لگانا پڑے وہ شعر نہ رہا فلسفہ ہو گیا۔ جواب میں غیر معمولی دیر ہو گئی، معافی چاہتا ہوں۔ والسلام

دعاگو، عبدالماجد

(۷)

"چغتائی" سے اشارہ مرزا سید الظفر چغتائی کی طرف ہے۔ مولانا دریابادی کے ہم وطن اور ان کے پاس روز کے آنے جانے والوں میں تھے۔ اثر مرحوم کے ہاں بھی ان کا آنا جانا تھا "کاپی" سے مراد اثر صاحب مرحوم کی بیاض ہے جو انہوں نے مولانا کو انتخاب کلام کے لیے بھیجی تھی۔

۱۲ر جون ۵۸ء

کرم گستر! السلام علیکم

قلمی کلام کے مطالعہ سے اب فرصت ہوئی۔ چغتائی اگر شام کو آتے تو کاپی ان کے حوالے کر دوں گا۔ صرف م بناتا گیا ہوں کوئی دس شعر ایسے نظر آئے کہ طبیعت بے اختیار پھڑک اٹھی ان پر دوہرے م بنا دیے ہیں۔ اشارۃً وہ شعر حاضر ہیں۔

(۱) جس نے دیکھا وہ دیکھتا ہی رہا — الخ
(۲) اس کے مائل کثرت ہوتی — "
(۳) سارا عالم آئینہ ہے — "
(۴) میری مرضی ہو جہاں — "
(۵) نگاہ مل نہ سکی حشر — "
(۶) جب کہا اس نے مدعا کہیے — "
(۷) عدل کے بدلے مطلب — "
(۸) نہ پڑھی فرد عمل میری — "
(۹) شوق بڑھتا گیا گناہوں کا — "
(۱۰) میر کی ایک عمر وفا میری — الخ

آپ کے عاشقانہ کلام سے تو خیر توقع ہی یہ تھی لیکن حیرت ہے کہ آپ کو تصوف اور معرفت سے اتنا درک کہاں سے حاصل ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس دریا کے شناور ہیں۔ بچپن سے سنتا آیا تھا کہ شیعہ حضرات تصوف کے دشمن ہوتے ہیں۔ ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔ والسلام

دعاگو: عبدالماجد

(۸)

دریاباد
۱۰ر اکتوبر ۱۹۵۸ء

بسم اللہ

مخدوم و مکرم! السلام علیکم

خدا کرے ہر طرح بخیریت ہوں۔

(۱) فسانۂ آزاد میں کئی جگہ محاورہ آیا ہے "حکم بس آیا داخل ہے"، حکم بس آیا ہی چاہتا ہے کے عمل پر "داخل" کا یہ استعمال مجھے نامانوس معلوم ہوا۔

(۲) شعر یا غزل لکھنے کے بجائے فعل "کہنا" تو برابر استعمال میں ہے لیکن اپنے لڑکپن میں مجھے یاد پڑتا ہے یہی فعل "کہنا" میں نے کتاب کی تصنیف کے لیے بھی سنا ہے۔ مثلاً یہ کتاب کس کی کہی ہوئی ہے؟ ان دونوں محاوروں سے متعلق براہ کرم اپنی تحقیق سے مستفید فرمائیں۔ والسلام دعاگو:

عبدالماجد

(۹)

اثر مرحوم نے اپنا لغت "فرہنگ اثر" خود شائع کرنے کے عزم کا اظہار کیا تھا۔ مولانا دریابادی کی رائے اس کے برعکس تھی۔ وہی مخلصانہ مشورہ اس خط میں دیا اور چند اشاعتی اداروں کے نام بھی تحریر کر دیے جو اس لغت کی اشاعت پر آمادہ ہو سکتے تھے۔

۱۲ر اپریل ۱۹۶۰ء

بندہ نواز! وعلیکم السلام

آپ کی کتاب لغت کا کیا کہنا۔ بے پڑھے ہوئے بھی اس پر ایمان بالغیب رکھتا ہوں لیکن بجائے اس کو خود چھپوانے کی زحمت میں پڑنے کے کیا کسی ناشر کے حوالہ کر دینا بہتر نہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ نقد نذرانہ یا رائلٹی یہ لوگ کچھ زیادہ نہ دے سکیں گے تاہم یہ کیا کم ہے کہ آپ کو سارے خرخشوں سے نجات مل جائے گی۔ ذیل کے ادارے ضرور قابل غور ہیں ان میں جس کسی سے بھی معاملت طے ہو جائے۔ راجہ رام کمار پریس سابق نول کشور پریس۔ کتاب گھر مسعود حسن رضوی والا۔ دانش محل امین الدولہ پارک۔ فروغ اردو امین آباد۔ انجمن ترقی اردو علی گڑھ جس کے سرور صاحب سکریٹری ہیں۔ چھپ جانے کے بعد یوپی سرکار کی انعامی کمیٹی سے قدردانی یقینی ہے لیکن خود میری صدارت کی مدت تھوڑی رہ گئی ہے۔

کتاب کا نام معلوم نہیں آپ نے کیا رکھا ہے؟

ایک خیال ناقص اور عرض کروں۔ کتاب میں تنقید و تبصرہ سب ہی لغات پر ہو۔ فرہنگ آصفیہ، جلال، امیر اللغات وغیرہ سب پر محدود محض نور اللغات پر نہ رہے ورنہ لوگ خواہ مخواہ ایک شخصی بحث بنا لیں گے۔ غالب ہے یہی غلطی قاطع برہان تصنیف کرتے وقت ہو گئی تھی۔ والسلام

دعاگو: عبدالماجد

(۱۰)

۲۹ر اگست ۱۹۶۱ء

مخدوم و مکرم! السلام علیکم

خدا کرے آپ ہر طرح صحیح تندرست اور بہ عافیت ہوں۔ ذیل کے دو فقروں میں فصیح اور فصیح تر آپ کسے قرار دیں گے۔ "وہ اپنے کو ڈاکٹر کہلاتا ہے" "وہ اپنے کو ڈاکٹر کہواتا ہے"؟ فسانۂ آزاد میں کہوانا بار بار آیا ہے۔

دعاگوئے صحت وعافیت؛

عبدالماجد

(۱۱)

۵ ستمبر ۱۹۶۱ء

مخدوم و مکرم! السلام علیکم

ایک زحمت آج پھر دے رہا ہوں۔

(۱) امراؤ جان ادا (مرزا رسوا) میں میں نے سلام کی جمع مونث پڑھی تھی۔ "لوگ اُن کو سلامیں کرتے تھے"۔ میں سمجھا چاہنے کی غلطی ہے اب بجنسہٖ یہی جملہ فسانۂ آزاد میں پڑھا۔ اب تو چاہنے کی غلطی تسلیم کرنا مشکل ہے۔

(۲) "اس ہفتے میں وہ آنے کے داخل ہے"، یعنی اس ہفتے وہ آیا چاہتا ہے یا پہنچا چاہتا ہے۔ داخل کی یہ ترکیب کئی جگہ فسانۂ آزاد میں بھی نظر آئی اور سمجھ میں نہ آئی۔

(۳) اور خود آپ کے مضمون میں میر انیس کا یہ مصرع منقول دیکھا۔

گویا علی کھڑے ہیں مہیا جہاد پر

یعنی مہیا مستعد، آمادہ کے معنی میں ہے۔ دو تین لکھنوی صاحبان مثلاً مرزا محمد عسکری مرحوم جھوائی ٹولوی سے دریافت کیا سب نے اس مفہوم سے لاعلمی ظاہر کی۔ جواب صرف اسی صورت میں مرحمت فرمایئے کہ لکھنے پڑھنے سے صحت پر کوئی بُرا اثر نہ پڑ رہا ہو ورنہ ہرگز میری طرف سے کوئی تقاضہ نہیں۔ والسلام

دعاگو، عبدالماجد

(۱۲)

"فرہنگ" ترشائع ہوگیا۔ مولانا دریابادی کی نظر سے گزرا یہ خط اسی خوشی اور شکریے کے اظہار کے لیے لکھا گیا۔ فیلن اور پلیٹس مشہور اردو انگریزی لغات نویس ہیں۔

۱۸ ستمبر ۱۹۶۱ء

مخدوم و مکرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

عطیہ گرامی موصول ہوا کیا کہنا ماشاءاللہ و سبحان اللہ۔ یہ تو پورا ایک دفتر نکلا، حجیم، ضخیم، میں سمجھے ہوا تھا کہ کوئی رسالہ ہوگا مختصر سا۔

بہر حال سراپا سپاس ہوں۔ صدق میں گو اب تبصرے نہیں نکلتے۔ تاہم اس کا مختصر تعارف تو ضروری ہے گنجایش جب بھی نکل سکے۔

سرسری نظر جہاں جہاں پڑی داد ہی دیتے بنی۔ جھنڈولیا، در جھنڈے گرڈا، اجھانو، تینوں لغت خوب نکلے۔

آپ یہ کتاب نہ لکھ جاتے تو اپنے اوپر بھی ظلم کرتے اور اردو ادب پر بھی۔ اللہ اس طرح کی صحیح خدمت اردو کے لیے آپ کی عمر و صحت میں زیادہ سے زیادہ برکت عطا فرماتے۔

کتاب میں بار بار نام فیلن اور پلیٹس کے آتے ہیں اگر شروع میں ان کا مختصر تعارف آجاتا تو ناظرین کے لیے بہتر ہوتا۔ والسلام

دعاگو، عبدالماجد

(۱۳)

۵ نومبر ۱۹۶۱ء

کرم گستر! السلام علیکم

خدا کرے آپ ہر طرح بخیر ہوں۔

اہل دہلی کی تحریروں میں برابر بجائے کھلانے کے کھولنے کا استعمال دیکھتا ہوں۔ ایک آدھ لکھنوی کی تحریر میں بھی دیکھا ہے آپ کے نزدیک کھولنا کہاں تک صحیح ہے۔

والسلام

دعاگو: عبدالماجد

(۱۴)

بسم اللہ

دریاباد

۳ جون ۱۹۶۳ء

مخدوم و کرم! السلام علیکم

آپ کی زبان پر مجرمانہ (میم کے ساتھ) یا جرمانہ (ب کے ساتھ ہے)؟ آپ کی زبان پر تلفظاً باہر (بروزن ساغر) ہے یا باہر (بروزن ماہر)۔ خدا کرے آپ ہر طرح بخیر و عافیت ہوں۔ والسلام عبدالماجد

(۱۵)

اثر لکھنوی کے انتقال پر ان کی بیوہ کے نام تعزیتی خط

دریاباد۔
۹ر جون ۱۹۶۷ء

بسم اللہ

خاتون محترم! السلام علیکم

اپنے مرحوم شوہر نامدار کی وفات پر دلی تعزیت قبول فرمائیے۔ اللہ ان کے مرتبے عالی کرے۔ اپنے رنگ میں فرد تھے۔ سخن گوئی، سخن فہمی، نقادی کہنا چاہیے ان پر ختم تھی اور میرے لیے تو سراپا محبت و اخلاص تھے۔ جب کبھی حاضر ہوتا بغیر کھلائے پلائے اور وہ بھی پورے تکلف اور اہتمام کے ساتھ واپس نہ آنے دیتے۔

صدمہ تنہا آپ کے اور قریبی عزیزوں کے لیے نہیں، ہم سب شریک غم و ماتم ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

والسلام
عبدالماجد

ڈاکٹر محمد حسن (دہلی)

جواہر لال یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر محمد حسن تھیٹر قائم کرنا چاہتے تھے اور اسے حیدرآباد، بمبئی وغیرہ لے جانا چاہتے تھے مولانا دریابادی کا ڈرامہ "زود پشیمان" بھی پیش کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں مولانا سے تعاون کی درخواست کی تھی۔

دریاباد
۱۴ر مئی ۱۹۷۶ء

بسم اللہ

مکرم گستر! تسلیم

آپ کا خط پا کر آپ کی ستم ظریفی کا قائل ہو گیا۔ تھیٹر کو فروغ دینے کی کوشش میں ترغیب و تحسین کی توقع مجھ دقیانوسی مُلّا مدیر صدق سے!

عشق و مزدوری عشرت گہ خسرو کیا خوب!

کہیں میرے پیام کو لینے کسی کے اشتہار کا جزو بنانے کا تو ارادہ نہیں "زود پشیمان" بالکل نو عمری کی تصنیف ہے اور وہ بھی بڑی حد تک قلم برداشتہ۔ شیکسپیر کا نشا اس وقت سوار تھا اور دو چار کتابیں فن پر الٹی سیدھی پڑھ ڈالی تھیں۔

اب اگر کتاب پر نظر ثانی کروں تو پچاس فیصد بدل ڈالوں۔ ایسی کتاب کو آپ یاد ہی کیوں دلاتے ہیں جس کے ذکر ہی سے شرمندہ ہوا جاتا ہوں۔

والسلام، دعاگو
عبدالماجد

(۱)

شاہد احمد دہلوی (کراچی)

۲۔ جولائی ۱۹۵۶ء کو لکھنؤ ریڈیو سے ڈپٹی نذیر احمد کی توبۃ النصوح پر مولانا دریابادی کی ایک تقریر نشر ہوئی تھی، جو شاہد صاحب نہ سن سکے تھے۔ خط میں ذکر اسی کا ہے۔

دریاباد
۱۲ر جولائی ۱۹۵۶ء

بسم اللہ

برادرم! وعلیکم السلام

یہ کیا غضب ہوا کہ وہ نشریہ آپ ہی تک نہ پہنچا اگر کوئی سنتا نہ سنتا ایک آپ ہی تو سن لیتے۔ داغ نے تو آرزو کی تھی:

میری فریاد دوسرا نہ سنے
تم سنو اے بتو خدا نہ سنے

اور دوسرے مصرعے کی گستاخی اللہ معاف کرے، یہاں اس کے بالکل الٹا ہوا چھاپنے میں وہ بات تو بھی نہیں رہ سکتی۔ اس کا تعلق سننے سے تھا پڑھنے سے نہیں، میں ٹاک سنانے کے لیے تیار کرتا ہوں، بطور مقالہ یا مضمون پڑھنے کے لیے نہیں۔

خیر اب تو جو ہونا تھا ہو چکا سوچ رہا ہوں کہ صاف کروا کے یہاں وہاں کے کسی رسالہ کے حوالہ کر دوں۔

اتفاق سے تازہ ساقی ابھی ابھی ملا۔ ہر مضمون اور ہر رسالہ پڑھنے کی ہمت کہاں سے لا سکتا ہوں لیکن ساقی ان چند رسالوں میں ہے جس پر ایک نظر ضرور ڈال لیتا ہوں۔ گستاخی معاف ہو تو اپنے سن کی بڑائی سے فائدہ اٹھا کر کچھ عرض کر دینا چاہتا ہوں۔

(۱) فلسفۂ آزاد پر مضمون بحیثیت مجموعی بہت اچھا ہے قابل داد ہے لیکن "احکام" کے بجائے یہ "احکامات" کیا؟ اور محل مدح پر "خامہ فرسائی" کیسی؟ اسی طرح "مکو" کا استعمال ایسے فقروں میں کہ "دل کو بھایا"۔ ایڈیٹر کو ذی مروت زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔

(۲) جوش اپنے فن کے استاد بھی اور زبان کے ماہر لیکن لغزش استادوں اور ماہروں سے
بھی ہو جاتی ہے پہلی رباعی کے پہلے مصرع میں "گویا" کا محل استعمال سمجھ میں نہ آیا۔
(۳) صفحہ ۴۱ کے متعدد مصرعے میری فہم سے بالا تر نکلے اور پھر مصرع ثانی میں تو ایک کھلا ہوا کرشمہ
ایڈیٹر کی مروت کا ہے۔ کسی شعر میں کوئی بات قابلِ داد نہ معلوم ہوئی۔

والسلام
عبدالماجد

(۲)

دریاباد
۲۱ اکتوبر ۱۹۶۶ء
بسم اللہ

برادرم! السلام علیکم

ابھی ابھی فرحت انوار سلمہا کے خط سے آپ کے ہاں کے سانحہ کی خبر ملی۔ اللہ آپ لوگوں
کو صبر و تسکین عطا فرمائے اور مرحومہ کو خود آپ لوگوں کے لیے وسیلۂ رحمت و مغفرت بنا دے
مومن کی تو کوئی ادنیٰ سی تکلیف بھی بغیر اجر کے نہیں رہتی چہ جائیکہ ایسا صدمہ جانکاہ ——
اجر جنریل ایک اسی صدمہ سے آپ کا حصہ ہو گیا۔
ہم اور آپ بوڑھے اور بچے سب ایک ہی منزل کے لیے رواں دواں ہیں، دلی خوشی یہ
سن کر ہوئی کہ آپ نے اس موقع پر صبر جمیل سے کام لیا۔ آزمائش بڑی اور کڑی تھی مبارک ہو
کہ آپ اس امتحان میں پورے اترے۔ والسلام

دعاگو، عبدالماجد

مولانا حکیم محمد زماں حسینی (کلکتہ)

مکتوب الیہ کے والد کے انتقال پر مولانا دریابادی کا تعزیتی خط

دریاباد
۱۴ اگست ۱۹۵۶ء
بسم اللہ

کرم فرما! وعلیکم السلام

بے شک اس وقت آپ کا دل دکھا ہوا ہوگا اس دکھے ہوئے دل کے جذبے کو کام میں لائیں
اور اپنے اور ان مرحوم اور ساری امت کے حق میں دعائے خیر فرمائیں —— قلب شکستہ کی
دعا کا کیا کہنا۔ لَهُمْ مَا يَشَاءُونَ فِيهَا وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ ہر منہ مانگی مراد حاصل بلکہ اس سے بھی سوا!

آپ ماشاء اللہ خود صاحب علم و فہم ہیں۔ لقمان کو حکمت کون سکھا سکتا ہے۔ صبر جمیل کے لیے
یہ اکسیر آیۃ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ کے دونوں اجزا کے معانی کا استحضار رہے
جب ہم خود اپنے لیے نہیں اللہ کے لیے ہیں تو ہمارے باپ اور بھائی اور بیٹے ہمارے ہوتے
کب؟ سب کے سب اللہ ہی کی ملک۔ جس کی چیز تھی اس نے جب چاہی واپس لے لی اور پھر
ظاہری جدائی کی مدت کتنی؟ ہم سب کے سب ہی ایک منزل کی طرف دوڑتے بھاگتے تو چل ہی
رہے ہیں اور آگے پیچھے پہنچ ہی رہے ہیں۔ پھر بے صبری کا ہے کی! یہ دونوں جس کے دل میں
اتر گئے تو پھر اسے آگے کسی صبر کی ضرورت ہی نہیں —— اور آپ تو خوش قسمت
ہیں کتنا موقع آپ کو ان مرحوم کی خدمت کا مل گیا۔ اس سچے صلی اللہ علیہ وسلم کا قول یاد کر
لیجیے جس نے کہا ہے کہ رب کی خوشی باپ کی خوشی میں اور رب کی ناخوشی باپ کی ناخوشی میں ہے

والسلام دعاگو و دعاخواہ: عبدالماجد

(۲)

بھائی کی وفات پر مولانا دریابادی کا تعزیتی مکتوب۔

دریاباد
۱۹ جولائی ۱۹۵۹ء
بسم اللہ

کرم گسترا! وعلیکم السلام

بھائی اور پھر اکیلے بھائی کی مفارقت کا صدمہ یقیناً بہت سخت ہوتا ہے چہ جائیکہ جب
مفارقت بالکل اچانک اور غیر متوقع ہو۔ سینے میں ایک خلا ہو گیا ہوگا جس کی تڑپ ہر وقت بے
چین رکھتی ہوگی۔
آیتہ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ کے معنی و مفہوم کا مراقبہ ایسے ہی موقعوں کے لیے ہے۔
ان شاء اللہ تسکین اسی سے ہوگی۔
جس نے وقت ڈالا ہے وہی وقت کاٹے گا بھی۔
صدمے بھی بہ قدر ظرف ہی دیے جاتے ہیں۔ آپ کو جو اجر بے حساب ملنے والا ہے اس کا
ابھی آپ کو اندازہ ہی نہیں ہو سکتا —— انتظار کی بڑی سے بڑی مدت بھی پلک جھپکتے ختم ہو جاتی
ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اپنے رشتے کے بھائیوں اور عزیزوں کا دل سے غم و حزن محسوس
فرمایا ہے۔ یہ اضطراری اتباع سنت مبارک ہو۔

والسلام دعاگو و دعاخواہ،

عبدالماجد

(۳)

مکتوب الیہ کے فرزند مولوی حکیم محمد عرفان الحسینی کے مولانا محفوظ الرحمٰن نامیؔ کی تیسری صاحبزادی سے رشتہ ازدواج کے قیام پر مولانا دریابادی کی مبارک باد۔

دریاباد

۸ر نومبر ۱۹۶۲ء

کرم گسترا! وعلیکم السلام

تقریب عقد اردو میں خاندان "نامیؔ" میں اللہ ہر طرح مبارک و مسعود کرے۔ اَللّٰھُمَّ اَلِّفْ بَیْنَھُمَا اَلْخ یہیں سے پڑھے دیتا ہوں اس کو جسمانی حاضری کا بدل سمجھا جائے۔ والسلام

عبدالماجد

خواجہ محمد شفیع دہلوی (لاہور)

(۱)

دریاباد

۱۵ر اگست ۱۹۵۶ء

بسم اللہ

برادرم! وعلیکم السلام

خوشی اس کی ہے کہ دریافت خیریت سے خود آپ کی خیریت دریافت ہو گئی۔ مذکور میری خیریت تھی اور مقدور آپ کی خیریت "فالحمد للہ" ہندوستان آنے کا ارادہ کبھی نہیں ہوتا! آپ دلی کو کبھی تو آکر دیکھ جائیے

سہاگن نہ سہی بیوہ سہی

والسلام دعاگو و دعاخواہ

عبدالماجد

(۲)

خط کی طویل بحث کا پس منظر یہ ہے کہ خواجہ صاحب نے لکھا تھا کہ میں نے ایم ۔ اے (اردو) میں داخلہ لیا ہے۔ مذکورہ سے مراد پاکستانی حکام کے غلط طرزِ عمل کا تذکرہ ہے۔

دریاباد

۱۷ر نومبر ۱۹۵۶ء

بسم اللہ

عزیزم! السلام علیکم

بات آج سے کوئی پچاس سال قبل کی ہے۔ میرا بچپن تھا۔ داغؔ مرحوم کا آخر زمانہ تھا۔ ریاض الاخبار کا شباب تھا۔ داغ کی غزل شائع ہوئی۔ مطلع تھا ؎

دلبر سے جدا ہونا یا دل کو جدا کرنا

اس سوچ میں بیٹھا ہوں آخر مجھے کیا کرنا

ریاضؔ نے اعتراض کیا کہ "کیا کرنا" نہ دلی کا محاورہ ہے نہ لکھنؤ کا۔ داغؔ نے نج کے خط میں جواب دیا کہ "یہ میری زبان ہے۔ کیا اعتراض میری زبان پر بھی ہے؟" ریاض نے بھی نج کے خط میں جواب دیا کہ "آپ کی زبان پر میری مجال کیا ہے جو اعتراض کر سکوں، لیکن سوال یہی ہے کہ آپ کی زبان ہے بھی؟ اگر آپ کی زبان ہے تو اپنے ہزارہا اشعار میں سے کہیں اس کی سند دکھا دیجیے۔ تو شاہ مان لوں گا۔" ہوا یہ ہے کہ لکھنؤں کے درمیان سالہا سال الانسان گھر سے رہنے سے آپ نا دانستہ ان کا محاورہ باندھ گئے۔ داغؔ اس پر لاجواب ہو گئے۔ تو یہی معاملہ آپ کے "داخلہ لینے" کے ساتھ ہے۔ اگر اسے آپ نے دلی والوں سے سنا ہے اور اسے صحیح سمجھتے ہیں تو یہ سند بالکل کافی ہے۔ باقی اسکول اور کالج کے لڑکوں کی اردو تو انگریزی اردو یا صاحبانہ اردو ہے۔

اردو جاننا اور چیز ہے اور اردو سے متعلق جاننا اور۔ آپ کے چاروں استادوں میں مجھے علم نہیں کہ اردو جاننے والے کوئی صاحب ہیں یا نہیں ہاں اردو سے متعلق بے شک بہت کچھ جانتے ہوں گے اور اپنے لکچروں میں لسانی معلومات کا انبار لگا دیتے ہوں گے جیسا کہ ہر فرنگی محقق کر سکتا ہے۔ یہ چیزیں بھی سیکھنے کی ہیں اور ان استادوں سے ضرور سیکھیے لیکن نفس اردو کی بول چال کا جہاں تک تعلق ہے بس اپنے شہر کی جگہوں کو اپنی درس گاہ سمجھیے۔

"امراؤ جان ادا" میں اس مقام پر میں بھی ذرا کھٹکا تھا لیکن یہ سمجھ کر گزر گیا تھا کہ بازاری خاگینہ بہت ثقیل ہوتا ہوگا ایک پیسہ میں بہت سا ملا ہوگا اور ادھر امراؤ جان ادا کی نزاکت اور نفاست اسنے کی بھی روادار نہ ہوئی ہوگی۔

"خوگینہ" سے میں واقف نہیں۔ نور اللغات وغیرہ میں بھی درج نہیں شاید کسی مخصوص و محدود طبقہ کی بولی ہوگی۔

یہ بھی خط بڑا لمبا ہو گیا۔ تذکرۂ شعرا کا تذکرہ اس لیے اس میں قصداً نہیں کرتا پھر کبھی۔ اور وہ کوئی خوشگوار موضوع میرے لیے اب بھی نہیں۔

والسلام، دعاگو،

عبدالماجد

(۳)

خواجہ صاحب نے مثنوی میر حسن کے بعض اشعار کے معنی دریافت کیے تھے

دریاباد

۲۰ر جنوری ۱۹۵۵ء بسم اللہ

برادرم سلمہ اللہ تعالیٰ! وعلیکم السلام

(۱) واچھڑے قدیم زبان میں کلمۂ داد و تحسین یا کلمۂ استعجاب تھا۔ کیا خوب کے معنی میں۔ میرے نسخہ میں دوسرا مصرع یوں ہے۔

کہیں ہوتی دی اور کہیں واچھڑے

(۲) "موترے" وہی موتھرے ہے گھوڑوں کے پیر کی بیماری میرے نسخہ میں شعر کے الفاظ یوں ہیں:

نہ ہڈوں کا نہ موترے کا خلل
نہ پتان اور پرستارے کا بل

(۳) میرے نسخہ میں یہ شعر یوں ہے:

ہوئی دست بازو کی سرسائیاں اڑائی گئیں ہاتھ کی گھائیاں

"سرسائی" سر پر وار کرنے کو کہتے ہیں۔ اور "گھائیاں اڑانا" پٹے بازوں کی اصطلاح میں کسی معین ضرب کا نام ہے۔

(۴) میرے نسخہ میں دوسرا مصرع یوں ہے:

لوگ لچھمی کے لے پرلو

معنی وہی ناچ کی ایک قسم کے معلوم ہوتے ہیں۔

(۵) "جریب ناپنا" منقول از نور اللغات جلد ۲ ص ۲۱۲

بادشاہی جلوس میں ہاتھی کے پیچھے ریشم کی ڈوری پڑی رہتی تھی فیل بان اس کو ہاتھ میں لپیٹتا

جاتا تھا جب کوس پورا ہو جاتا وہ بان ایک چھڑی لے کر بادشاہ کو مجرا کرتا جس سے مراد ہوتی کہ سواری کوس بھر آئی۔ ریشم کی اسی ڈوری کو جریب کہتے ہیں۔

(۶) جی ہاں، قلادہ گوٹ کے معنی میں ہے۔

(۷) "بڑھا کر لکھیے سات سے نو قلم" اس کا مطلب مجھ پر بھی نہ واضح ہوا۔ لکھنؤ ہی میں ایک صاحب منشی شیخ ممتاز حسین جونپوری[1] پرانے آدمی ہیں ادیب و منشی خوش نویسی کے ماہر ان سے لکھ کر دریافت کرتا ہوں۔

(۸) شلق مالوں کی زبان میں ایک نقش کا نام ہے جس میں نو خانے ہوتے ہیں کلام کا سیاق بھی یہی چاہتا ہے کہ بات مالوں کی اصطلاح میں چل رہی ہے۔ اپنا بھی پرانی زبان کو سمجھنا اتنا مشکل ہو رہا ہے۔ جتنا کسی غیر زبان کا۔ آئندہ کبھی اس قسم کی خدمت لینا ہو تو صفحہ فصل وغیرہ کا حوالہ ضرور دیا جائے۔ بڑا وقت مجھے اپنے نسخہ میں ان اشعار کے ڈھونڈھنے میں لگ گیا۔

والسلام، دعاگو،

عبدالماجد

(۴)

خواجہ صاحب کے والد خواجہ عبدالمجید مرحوم کے انتقال کی خبر پڑھ کر یہ تعزیت نامہ تحریر کیا

دریاباد

۱۶ر اکتوبر ۱۹۵۵ء بسم اللہ

برادرم! وعلیکم السلام

دعائے مغفرت کل سہ پہر کو خط پاتے ہی کر دی تھی خط قبل عصر ملا تھا اس وقت سے اب تک یاد کر کے ہر نماز کے بعد اور اس وقت بھی کر رہا ہوں۔

(۲) مرحوم کی خوش نصیبی تھی کہ اولاد سعید آپ کی سی چھوڑی، وطن سے صدہا میل دور دارالہجرت میں وفات بجائے خود ایک علامت مقبولیت کی ہے۔

آپ بھی خوش نصیب ہیں کہ اتنے عرصے خدمت کا موقع پایا۔

باقی یہ سایہ تو جس سن میں اٹھے گا بہرحال صدمہ ہی کا باعث ہوگا اور یہی صدمہ ہر اجرِ اُخروی کی بنیاد ہے۔

---

[1] شیخ صاحب نہ صرف خوش نویسی کے ماہر تھے بلکہ دوسرے اصناف کے بھی محقق تھے لکھنؤ کی پرانی چیزوں سے سب سے زیادہ واقف اور مرزا محمد ہادی رسوا کے خاص دوستوں میں تھے۔

اپنی والدہ ماجدہ اور بھائی بہنوں سب کو میرا پیام تعزیت پہنچا دیجیے۔ آپ کا بڑا فریضہ انہیں لوگوں کے ساتھ حسن سلوک بہ قدر ان کے مراتب رہ گیا۔

اصل حقیقت کے اعتبار سے غم اور سوگ کون کس کا کرے جبکہ آگے پیچھے سب ہی تیزی کے ساتھ ایک منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔

گھر کی ذمہ داریاں اب ساری آپ ہی پر آ پڑی ہوں گی۔ باپ کا سایہ بڑا ہی بابرکت ہوتا ہے۔

ع اب اسے ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر

اس یقین میں شک نہ لائیے گا کہ اللہ ہر مسلمان کا والی و ناصر ہے۔ والسلام دعاگو،

عبدالماجد

(۵)

آخر مارچ ۱۹۶۱ء میں دہلی میں انڈو پاک کلچرل کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس کے روح رواں ڈاکٹر تارا چند تھے انھیں کی دعوت پر مولانا مرحوم دہلی تشریف لے گئے تھے اور خواجہ صاحب جن سے مولانا مرحوم کے مخلصانہ تعلقات تھے اس کانفرنس میں شرکت کے لیے تشریف لائے تھے مکتوب میں اسی سفر کا ذکر ہے اور ملاقات نہ ہونے پر افسوس۔

دریاباد

۱۲ اپریل ۱۹۶۱ء

بسم اللہ

برادرم!

السلام علیکم

یہ لطیفہ بلکہ المیہ سنیے کہ آپ ۱۳ مارچ کو دہلی میں موجود اور میں جا کر بھی محروم دید واپس آیا ——— سکندر کو بھی آب حیات تک پہنچ کر مایوس ہی واپس ہونا پڑا۔

مجھے خیال بھی نہ تھا آپ دہلی میں موجود ہوں گے آپ کا نام تو واپس آ کر اخبارات میں بسلسلۂ مشاعرہ پڑھا۔

میرا بھی دہلی جانا برسوں کے بعد ہوا تھا ایک ہی دن ٹھہر کر چلا آیا۔ دہلی کے تاثرات خواجہ دہلوی کے قلم سے پڑھنے کے قابل ہوں گے۔

والسلام

عبدالماجد

مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی لکھنؤ

(۱)

مفتی صاحب نے مولانا دریابادی کو اپنے ہاں لکھنؤ میں صبح کی چائے پر مدعو کیا تھا اور اس موقع پر مولانا ابوالحسن علی ندوی معروف بہ علی میاں صاحب کو مدعو کرنے اور قومی آواز کے ایڈیٹر حیات اللہ انصاری کو بھی بلا لینے کی اجازت طلب کی تھی۔ مولانا شہید سے مراد مولانا صبغت اللہ شہید انصاری فرنگی محلی ہیں۔ "لانفرق بین احد منکم" کو قرآن کی آیت نہ سمجھ لیا جائے۔

دریاباد

۵ ستمبر ۱۹۵۶ء

بسم اللہ

عزیزم!

وعلیکم السلام

دوشنبہ کی صبح کا وقت تو شہید صاحب کے لیے بک ہو چکا تھا۔ ان کی منظوری سے بہ آسانی اپنے ہاں منتقل کرا سکتے ہیں۔ لانفرق بین احد منکم

مولانا علی میاں صاحب اور حیات اللہ انصاری کا اجتماع پر لطف رہا۔ دین و دنیا ایک ہی دسترخوان پر ——— ربنا آتنا فی الدنیا حسنة و فی الآخرة حسنة کی عملی تفسیر۔

والسلام، دعاگو:

عبدالماجد

(۲)

مولانا مفتی عبدالقادر فرنگی محلی کے انتقال (۲۵ اگست ۱۹۵۹ء) پر مرحوم کے بھتیجے مفتی محمد رضا انصاری کے نام مکتوب تعزیت۔

دریاباد، بارہ بنکی

۲۹ اگست ۱۹۵۹ء

عزیزم سلمہ! السلام علیکم

ع "جس وقت کا دھڑکا تھا، وہ وقت آ گیا آخر"

اللہ کا چاہا آخر پورا ہو کر رہا۔ اور وہی ہمیشہ بہتر ہوتا ہے جو اس کا چاہا ہوتا ہے۔ لیکن بندہ بیچارہ بھی کیا کرے اس کی آہ و فغاں، گریہ و زاری، ماتم و شیون سب قدرتی ہیں۔ عزیزوں قریبوں، مخلصوں متوسلوں کے دل میں ٹیس ہی ایسی اٹھتی ہے۔

اور پھر مرحوم کی تو ذات ایسی تھی کہ دُور دُور کے لوگ بھی اس صدمہ کو اپنا ہی صدمہ سمجھیں گے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اللّٰھم اغفرلہ وارحمہ، اللہ بال بال مغفرت ورحمت سے مالامال فرمائے۔

کل اسی وقت نماز جنازہ اس کی پڑھائی جارہی ہوگی جو خود بیشمار جنازے پڑھا چکا، اور کل تک خود دوسروں کی مغفرت کی دعائیں کرتا رہا تھا۔ کل سہ پہر کو برابر یہی خیال آتا رہا خبر وفات اسی وقت معلوم ہوتی تھی، کل یہاں مغرب کے وقت جماعت سے دعا کرادی تھی۔

اللہ آپ سب عزیزوں کو صبر جمیل کی توفیق فرمائیں۔

ان شاء اللہ ۲۹ کی شام کو یا ۳۰ کو صبح ضرور مزار پر فاتحہ پڑھوآؤں گا اور اگر وقت ملا تو فرنگی محل بھی حاضری دے لوں گا۔ والسلام

دعاگو، عبدالماجد

(۳)

دریاباد۔
۱۱ر جون ۱۹۶۶ء

بسم اللہ

عزیزی سلمہٗ! السلام علیکم

مولوی سید امین الحسن بسمل موہانی مرحوم میرے عزیز ترین دوستوں میں تھے، اور فرنگی محل کے مرید۔ ان کے بجائے سید ظہور الحسن موہانی شرکت عرس فرنگی محل کے لیے آج ہی کل میں حیدرآباد سے لکھنؤ پہنچ رہے ہوں گے (میرے خط میں تھا کہ ۱۲ کو پہنچ جائیں گے)۔ بس دوسرا ورق کاٹ کر ان کے حوالہ کر دیا جائے۔

"علاوہ" کا استعمال موقع نفی پر ذرا نازک ہے۔ اچھے اچھے اس میں چوک جاتے ہیں، "علاوہ ایک سبیل کے اور کوئی سبیل موجود نہ تھی" یہ موقع علاوہ کا نہیں بجز یا سوائے کا ہے علاوہ کے معنی بشمول کے ہیں، حذف کے نہیں۔

"قومی آواز" نے بدسلوکی کی ادبی بدعت جاری کر کے اب اس سے بھی بڑھ کر بدعت ہم جنسی کی شروع کی ہے[1] ــــ اردو میں چلے ہوئے لفظ اس گندے مفہوم کے لیے ہیں اگر انہیں چھوڑنا ہی ہے تو "تلذذ بالمثل" سے کام لینا تھا۔ "ہم جنسی" تو اس موقع کے لیے سوفی صد مہمل ہے۔ والسلام۔

دعاگو و دعاخواہ:
عبدالماجد

---

[1] انگریزی لفظ homosexuality یا اغلام کا ترجمہ قومی آواز نے ہم جنسی سے کیا تھا اس پر نوٹ ہے۔

(۴)

جوش صاحب پاکستان سے لکھنؤ گئے تھے، مولانا دریابادی ان سے ملنا چاہتے تھے۔ رند خراباتی سے وہی مراد ہیں۔ مفتی صاحب کے جوش سے غیر معمولی تعلقات تھے اس لیے انہی کو اس سلسلے میں خط لکھا۔

دریاباد
یکم ستمبر ۱۹۶۷ء

بسم اللہ

عزیزم! وعلیکم السلام

ایک رند خراباتی اور پھر کافر عشق (مسلمانی مرا درکار نیست) کے نعرہ زن کا تعارف و تذکرہ مفتی شہر کے قلم سے خوب اور بہت خوب رہا۔ داد قبول ہو۔

لیکن یہ کچھ نہ بتایا کہ وہ حضرت ہیں کہاں؟ ملنا چاہوں یا خط لکھوں تو کس پتے سے۔ ملیں تو ملیح آباد تک جانے کو تیار ہوں ــــ یہ جاننے کا ہمہ تن منتظر ہوں۔

تحریر میں وہ جو کچھ بھی غضب ڈھاتے ہوں میرے سامنے تو اپنی مؤثر نعتیہ نظم انہوں نے بڑے ادب کے ساتھ سنائی ہے اور ایک سے زائد بار۔

جی نہیں مولانا فرنگی محلی کا ذکر اگر کہیں آس پاس بھی اس کتاب میں ہوتا تو میں ضرور ظاہر کر دیتا کتاب میری پہلے کی دیکھی ہوئی ہے۔

والسلام دعاگو و دعاخواہ:
عبدالماجد

(۵)

دریاباد۔
۱۱ر جنوری ۱۹۷۲ء

بسم اللہ

عزیزم سلمہٗ! السلام علیکم

ابھی دس بجے دن کو جبکہ مرحومہ[1] کا سوئم ہو رہا ہوگا ــــ مولوی عظمت اللہ مرحوم کی خبر وفات پڑھی[2]۔ مرحوم میرے استاد محض رسمی قسم کے نہ تھے حقیقی اور بڑے شفیق استاد تھے، عربی ٹوٹی پھوٹی جو کچھ بھی آئی انہیں کی بدولت آئی اٹھ کر دعائے مغفرت کر دی۔

---

[1] مکتوب الیہ کی کسی قریبی عزیزہ کا سوئم۔

[2] مرحوم مولانا کے سیتاپور گورنمنٹ ہائی اسکول میں عربی کے استاد تھے اور اس زمانے میں مولانا کی مضمون نگاری کی ہمت افزائی کی تھی۔

قریب کے سارے عزیزوں کو تعزیت رسانی کا مزید اجر حاصل کیجیے۔

والسلام دعاگو و طالب دعا

عبدالماجد

شیخ ممتاز حسین جون پوری (لکھنؤ)

شیخ صاحب نہ صرف ادبیات کے محقق تھے بلکہ لغویات پر سند کا درجہ رکھتے تھے۔ کاش ان کے جواب کا پتا بھی چل سکتا۔

دریاباد

۲۰ جنوری ۱۹۵۷ء

بسم اللہ

کرم گسترا! السلام علیکم

میر حسن کی مثنوی سحر البیان میں ایک شعر ص ۳۲۰ پر ہے ؎

ہوا جب کہ نوخط وہ شیریں رقم
بڑھا کر لکھے سات سے نو قلم

سیاق شہزادہ کی خوش نویسی کا ہے۔ دوسرے مصرع میں، یہی یہی ہمارے سات سے نو قلم، یقیناً خطاطی ہی کی کوئی اصطلاح ہوگی۔ آپ کچھ مدد فرما سکتے ہیں۔

مرزا رسوا صاحب کا کلام جتنا امراؤ جان ادا اور ذات شریف میں ملتا ہے وہ اگر یکجا ہو جاتا تو بہت کچھ تھا پھر آگے دیکھا جاتا۔

والسلام

عبدالماجد

خلیل الرحمٰن اعظمی (بسم اللہ منزل، علی گڑھ)

مکتوب الیہ نے اپنی کتاب پر تبصرہ نکلنے پر صدق جدید کا متعلقہ شمارہ بھیجنے کے لیے درخواست کی تھی۔

دریاباد

۲۵ مارچ ۱۹۵۷ء

بسم اللہ

بسم اللہ منزل سے خط، بسم اللہ کے گنبد میں پہنچا۔

تبصرہ دفتر سے ناشر کے نام اسی وقت روانہ کر دیا جاتا ہے، اب اس وقت دفتر لکھے

بھیجتا ہوں کہ ایک تراشہ آپ کو بھی بھیج دیا جائے۔

دعاگو،

عبدالماجد

حکیم بنیاد علی (میرٹھ)

اپنے دواخانے (دارالشفاء مصطفائی) کے شربت "روح پرور" کے تحفے کے جواب میں شکریے کا خط۔

دریاباد

۳۰ اپریل ۱۹۵۷ء

بسم اللہ

شربت "روح پرور" واقعی اس موسم میں ایک تحفۂ روح پرور ہے اور پھر ایک نہیں دو دو بوتلیں، اجر کو اضعافاً مضاعفہ کرنے والی۔ جنتان، ذواتا افنان و مدھامتان[1] کی شان لیے ہوئے۔

والسلام

دعاگو عبدالماجد

(۱)

نادم سیتاپوری[2]

نادم صاحب نے دریافت کیا تھا کہ مولانا دریابادی کے تصنیفی شعور کی رہنمائی اور تربیت میں کن کتابوں اور مصنفوں نے حصہ لیا؟ نیز ان کی پہلی تصنیف کون سی ہے اور ان کی وجہ

دریاباد۔ ضلع بارہ بنکی

۱۵ اکتوبر ۱۹۵۷ء

کرم گسترا وعلیکم السلام۔ جوابات عرض ہیں۔

۱۔ سب سے بڑھ کر مولانا شبلی، ان سے کم درجہ میں کچھ اور لوگ ہیں۔

۲۔ سب سے بڑھ کر مولانا شبلی کی "الکلام" اور "رسائل"۔ ان سے بھی قبل کے دور میں مولانا ثناء اللہ امرتسری اور مرزا غلام احمد قادیانی کی مناظرانہ کتابیں، آریہ وغیرہ کی رد میں۔[3]

---

[1] یہاں سورہ رحمٰن کی تین آیتوں کے الفاظ جمع ہیں۔ وَمِنْ دُونِهِمَا جَنَّتَانِ (آیت ۶۲) ذَوَاتَا أَفْنَانٍ (آیت ۴۸)، مُدْهَامَّتَانِ (آیت ۶۴)

[2] نادم صاحب کے نام خطوط پر بیش تر حواشی ان کے اپنے قلم سے ہیں۔

۳۔ پھر وہی مولانا شبلی جب کالج کی زندگی شروع ہوئی تھی تو لکھنؤ میں مولانا سے ذاتی نیازمندی اور عام رباطی بھی رہی۔ ادبی اور شعری مذاق جو کچھ بھی پیدا ہوا مولانا ہی کا فیض ہے۔

۴۔ مستقل پہلی تصنیف "فلسفۂ جذبات" اس سے بھی پیشتر دو مقالے جو ایک ناشر نے رسالے کی صورت میں شائع کر دیئے تھے ایک محمود غزنوی دوسرا غذائے انسانی۔

۵۔ اس کا جواب مشکل ہے۔ یوں تو ظاہر ہے اپنی سب سے بڑی خدمت تفسیر قرآن (اردو، انگریزی) کو سمجھتا ہوں۔ باقی حکیم الامت محمد علی کی ذاتی ڈائری اور سفر حجاز بھی شاید کچھ وزن و قیمت رکھتی ہوں۔

والسلام
عبدالماجد

(۲)

یکم نومبر ۱۹۵۷ء — دریاباد ضلع بارہ بنکی

برادرم! وعلیکم السلام

۱۔ جی ہاں "الناظر"[1] میں وہ سلسلۂ مضامین ایک طالب علم کے فرضی نام سے اپریل ۱۹۱۰ء سے جنوری ۱۹۱۱ء تک سات نمبروں میں جاری رہا تھا اور بڑے لوگوں نے اس وقت بڑی ہمت افزائی کی، میں اس وقت انٹر کا طالب علم تھا۔

۲۔ علمی مضامین اس سے قبل بھی لکھ چکا تھا سہ روزہ "وکیل" امرتسر میں بجز ۱۹۰۷ء و ۱۹۰۸ء میں۔

۳۔ والد مرحوم[2] کا قیام سیتاپور میں ۱۹۱۰ء تک رہا غالباً اکتوبر تک! آغاز قیام ۱۸۹۹ء سے ہوا۔

۴۔ میری تعلیم تھرڈ کلاس (برانچ اسکول) سے لے کر دسویں درجہ تک وہیں ہوئی ۱۹۰۸ء میں میٹرکولیشن وہیں سے کیا۔ ہیڈ ماسٹر برابر بابو گھمنڈی لال رہے۔ والد مرحوم کے تعلقات علاوہ اپنے افسران اور ہمسر حکام کے، پبلک سے بہت گہرے اور مخلصانہ رہے۔ میر مظفر حسین[3]۔

---

[1] مولانا شبلی کی "الکلام" پر یہ ایک طالب علم کے نام سے مولانا نے یہ تنقید کی تھی۔ بہ قول دریابادی مولانا شبلی کے نام کی صرف آڑ تھی یہ تنقید دراصل اسلامی بنیادی عقائد وجود باری رسالت وغیرہ پر تھی (آپ بیتی ص ۲۱۲)

[2] مولانا کے والد مولوی عبدالقادر صاحب مرحوم پنشنر سیتاپور میں تحصیل دار رہے پھر ڈپٹی کلکٹر۔ ریٹائرمنٹ کے بعد کچھ دنوں تک میونسپل بورڈ سیتاپور کے سیکریٹری بھی رہے۔

[3] اپنے عہد کے ایک مشہور وکیل جن کی فیاضی اور دریا دلی کے افسانے سیتاپور اور اس کے پاس پڑوس میں آج تک مشہور ہیں۔

سید نذیر احمد[1]۔ عبدالمجید خان۔ مولوی ہادی علی خان۔ سید رضی۔ منشی احمد حسن لاہرپوری۔ حکیم انوار حسین خیرآبادی۔ آغا میر عظیم محمد ہاشم۔ سید محمد احمد (ریٹائرڈ سب جج) (اور) حکیم مہدی[2] کے نام اس وقت یاد آ گئے۔ ہاں حافظ امیر احمد لاہرپوری بھی ہیں۔

شہر کے علاوہ خیرآباد۔ لاہرپور۔ ہرگاؤں۔ محمود آباد والوں سے بھی بہت تعلقات تھے۔ نیز رئیسوں میں راجہ سورج بخش سنگھ تعلقہ دار کملا پور اور پرینڈی کے ٹھاکر ۔ ۔ ۔ ۔ ہیں۔ راجہ صاحب محمود آباد سے خصوصی تعلقات دوستی و بزرگی کے تھے۔

۶۔ اپنے استادوں میں بابو گھمنڈی لال، ماسٹر دولت رام، حکیم احمد زکی، مولوی عظمت اللہ فرنگی محلی کو بڑے شکریہ کے ساتھ یاد رکھتا ہوں۔ نیاز احمد مرحوم۔ اعجاز احمد۔ دوست محمد۔ راج نرائن ہرکولی۔ آغا حسن بھی تھے۔

۷۔ بھائی صاحب بحمد اللہ بخیریت ہیں۔ گو کمر دور بہت زیادہ ہو گئے ہیں۔
خدا کرے کہ آپ کی سب باتوں کا جواب آ گیا ہو۔

والسلام
عبدالماجد

(۳)

۱۱ر نومبر ۱۹۵۷ء

برادرم! وعلیکم السلام

۱۔ جی ہاں جسٹس سید محمود[3] مرحوم کا نام آپ نے خوب یاد دلایا ۔ ۔ ۔ ۔ ہی میں رہتے تھے بعد کو اسٹیشن والی کوٹھی دبیگم باغ میں اٹھ گئے تھے۔ انتقال جون ۱۹۰۳ء میں عین نماز جمعہ کے وقت

---

[1] میرے حقیقی چچا سیتاپور کے مشہور وکیل اور اپنے زمانے کی ایک ہر دلعزیز شخصیت۔ مدتوں میونسپل بورڈ کے ممبر و وائس چیئرمین، آنریری اسسٹنٹ کلکٹر اور آنریری مجسٹریٹ رہے۔ مولانا کے والد مولوی عبدالقادر مرحوم سے خصوصی تعلقات تھے۔

[2] سردار محمد ہاشم خاں ایک تاریخی شخصیت! جن کے پوتے آغا سید احمد مرحوم سابق صدر پاکستان اسکندر مرزا کے ہم زلف تھے۔ سیتاپور کے ایک مشہور طبیب! (ناظم سیتاپوری)

[3] سید محمود آخر عمر میں سیتاپور اپنے چچا زاد بھائی سید محمد احمد خاں سب جج کے پاس چلے آئے تھے، یہیں ۱۹۰۳ء میں انتقال ہوا۔ لاش علی گڑھ بھیجی گئی۔

فرمایا۔ باوجود دائم الخمر ہونے کے بڑے پختہ مسلمان تھے۔

۲۔ جی ہاں وہ ...... زکی نہیں۔ یہ حکیم مرزا محمد زکی لکھنوی مرحوم ابن مرزا محمد تقی ...... کے باشندے تھے ان کے چھوٹے بھائی آج بھی لکھنؤ کے ایک بڑے طبیب ہیں۔ حکیم محمد تقی شفا۔ منزل گھسیاری منڈی۔ میرے عربی کے سب سے پہلے استاد۔ اور شفیق استاد تھے۔ عادات و اطوار مزاج کے لحاظ سے خالص لکھنوی۔ ذہانت کو بہت ہی بجا مصرف میں صرف کرنے والے۔

۳۔ جی ہاں۔ سید اعجاز احمد ہی ہیں پہلے پہلے سب انسپکٹر تھے۔ بھگوان دین وکیل کا نام بھی آپ نے خوب یاد دلایا۔ دوست محمد خاں محلہ عالم نگر کے رہنے والے تھے۔ پستہ قد۔ چیچک رو۔ فٹ بال کے اچھے کھلاڑی۔ ایک نام امراؤ مرزا عشق[1] کا رہ گیا تھا اب غالباً مرحوم ہو چکے ہیں۔
سید محمد طاہر وکیل کا ساتھ کالج میں رہا تھا۔

۴۔ "الناظر" کی وہ جلدیں اب کہاں ملیں گی؟ میرے پاس وہ بھی نہیں۔ آپ کا اب لکھنؤ جب آنا ہو تو دو ایک گھنٹے کا وقت نکال لیجیے، دفتر الناظر بک ایجنسی حکیم عبدالعزیز روڈ جا کر ہیں ان پرچوں سے نوٹ حاصل کر لیجیے۔ ممکن ہے کتب خانہ محمود آباد (اسٹیٹ) میں وہ جلدیں ہوں۔ میرے لیے اب ان مضمونوں میں کیا کشش ہو سکتی ہے الٹی تکلیف ہی اس کا خیال کر کے ہوتی ہے۔ اس وقت تمام تر ملحد تھا۔ دہریہ و منکر خدا کے معنوں میں نہیں بلکہ "RATIONALIN" "لا ادریہ" کے معنی میں۔ تنقید یکسر عقائد اسلامی، وجود باری، نبوت، ضرورت مذہب وغیرہ پر تھی "الکلام" کو ہدف آڑ بنا لیا تھا۔ عمر اس وقت ۱۸-۱۹ سال کی تھی۔

والسلام

عبدالماجد

(۵)

۲۷/جولائی ۱۹۵۹ء — دریاباد ضلع بارہ بنکی

برادرم وعلیکم السلام

ابھی کچھ روز ہوئے آپ کا کوئی مضمون کسی پرچہ میں پڑھا تھا اور وہ بہت پسند آیا تھا۔ بلکہ اسی وقت آپ کو داد کا خط بھیجنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ پھر موقع نہ ملا۔ اس وقت نہ اس پرچے کا نام

[1] مرزا امراؤ بیگ عشق لکھنوی۔ جوش ملیح آبادی کے عزیزوں میں ہیں۔ الحمد اب بھی بقید حیات ہیں (نادم سیتاپوری)

یاد آ رہا ہے نہ مضمون کا عنوان!

"ندیم" بھوپال[1] آ تو بیشک رہا ہے لیکن آتے تو خدا معلوم کتنے پرچے رہتے ہیں۔ سب کہاں پڑھ سکتا ہوں! صرف چند کا انتخاب کر لیا ہے۔ آپ کا اس سے کوئی خصوصی تعلق تو آج معلوم ہوا۔ اب انشاء اللہ اسے بھی اس منتخب فہرست میں رکھ لوں گا۔

بھائی صاحب[2] لکھنؤ میں بدستور ہیں اور ماشاء اللہ بخیریت ہیں۔ بخیریت اس سن اور اس نحیف جثے کو دیکھتے ہوئے۔

والسلام

دعاگو

عبدالماجد

جناب نادم سیتاپوری۔ احمد برادرس۔ چوکی امامباڑہ بھوپال

(۴)

مورخہ ۲۰ر مارچ ۱۹۵۸ء — دریاباد ضلع بارہ بنکی

برادرم وعلیکم السلام

اور تو یاد نہیں پڑتا اتنا یاد ہے کہ آخر جنوری میں آپ کا جو خط ملا تھا اس میں یہ سوال تھا
—— شرر نے شبلی پر اعتزال کا الزام کیسے لگا دیا؟
جواب میں یکم فروری کو عرض کر دیا تھا کہ شرر نے ٹھیک لکھا شبلی کا اعتزال ان کے "الکلام" میں نمایاں ہے۔ "علم الکلام" اور مقالات وغیرہ میں بھی کسی قدر جھلک رہا ہے بعد کو ان کی جو تکفیر ہوئی وہ انہیں عقائد کی بنیاد پر —— بس اس کے بعد پھر کوئی خط نہیں پہنچا تھا۔

والسلام — دعاگو

عبدالماجد

(۷)

"فتنہ" اور "عطر فتنہ" ریاض خیرآبادی کے مزاحیہ اخبار۔ "ریاض الاخبار" ان کا سنجیدہ ادبی ہفتہ وار تھا گورکھپور سے جاری ہوئے تھے۔

۲ راگست ۱۹۶۱ء — دریاباد ضلع بارہ بنکی

[1] بھوپال کا ایک ہفت روزہ جو اب بند ہو چکا ہے۔ عزیز گیلانی کی ادارت میں جاری ہوا تھا۔

[2] جناب ڈپٹی عبدالمجید صاحب مرحوم مولانا دریابادی کے حقیقی بڑے بھائی (نادم سیتاپوری)

برادرم! السلام علیکم

"انتخاب نقدیں" جا بجا سے پڑھ لیا۔ آپ نے ایک فریضۂ اخلاص و نیازا دا کر دیا۔ ورنہ اب کون "نقدیں" کو پوچھتا ہے اور کون "ریاض الاخبار" کو ۔۔۔ دنیا ہی دوسری ہو گئی ہے۔

آپ کے دیباچہ یا مقدمہ میں دلکشی متن کتاب سے کم نہیں۔ لیکن اب ان تلمیحات و کنایات سے لطف اٹھانے والے رہ گئے ہیں!

بہرحال جس محدود حلقہ کے لیے آپ نے کتاب تیار کر دی ہے وہ انشاء اللہ اس کی پوری قدر کرے گا اور آپ کے ذوق و تلاش دونوں کی داد دل کھول کر دے گا۔ والسلام

میرا وہ ڈاک والا خط سیتاپور کے پتے سے تو مل ہی گیا ہو گا؟

دعاگو:

عبدالماجد

(۱۴)

مورخہ یکم ستمبر ۱۹۶۳ء — دریاباد ضلع بارہ بنکی

برادرم! السلام علیکم

۲۔ کی شام تک لکھنؤ انشاء اللہ پہنچ جاؤں گا اور ۴۔ ۲½ ہفتے تک ہیڈ کوارٹر یہی رہے گا۔ یعنی مستقل قیام وہیں! لیکن بیچ بیچ میں باہر بھی برابر جانا رہے گا۔

قیام کی صورت میں یہ سمجھ لیجیے کہ جیسے کوئی مسجد میں معتکف ہوتا ہے۔ صرف سہ پہر یعنی مغرب سے ایک گھنٹہ قبل فارغ رہوں گا۔ اسی میں آج فلاں قبرستان چلا گیا اور کل فلاں لائبریری۔ کبھی کبھی ..... گھر پر لوگوں سے مل لوں گا۔ وقت میں اس حد تک بخل سے کام نہ لوں تو کچھ کام بھی نہیں کر سکتا۔ آپ کو محض اطلاع دیے دیتا ہوں کہ اگر اتفاق سے اس دوران میں لکھنؤ آنا ہو جائے تو بس خبر کر دیجیے گا۔ محض مجھ سے ملنے کے لیے سفر ہرگز نہ اختیار کیجیے گا۔ والسلام

دعاگو و دعا خواہ:

عبدالماجد

(۶)

۱۱ر مارچ ۱۹۶۱ء — دریاباد ضلع بارہ بنکی

۲۳ ر رمضان المبارک۔

برادرم! وعلیکم السلام انشاء اللہ ۲۱ر مارچ (منگل) کو صبح دس بجے کی گاڑی سے سیتاپور[1]

---

[1] بہ بہا برس کے بعد میری درخواست پر مولانا ۲۱ر مارچ ۱۹۶۱ء کو چند مختصر لمحات کے لیے سیتاپور تشریف

[2] پہنچوں گا۔ کچھ دیر بعد بڑی لین (N. E. R) سیتاپور سٹی کے لیے مل جاتی ہے اسی پر آپ کے اسٹیشن پر اتر وں گا۔ ایک خادم ساتھ ہو گا۔

مقامِ افسوس ہے کہ اب یہ قیام اور مختصر کرنا پڑے گا ایک ہی ہفتہ کے بعد کتنی دن کے لیے سفر دہلی و علی گڑھ پر روانہ ہو جانا ہے اور پھر وسط اپریل میں خیال ڈیڑھ دو ہفتے کے لیے لاہور کا ہے۔

۲۲۔ (بدھ) کی شام کو ½ ۱ بجے واپسی کی اجازت چاہوں گا۔ بیشتر وقت چلنے پھرنے میں گزرے گا۔ سول لائن کے حصے تو پیدل ہی دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس "مرحوم کوٹھی" کی خبر جو آپ نے سنائی دی۔ دل نے وہی قلق محسوس کیا جو کسی عزیز کی خبر وفات سن کر ہوتا ہے۔ زوال محمود آباد چھوٹے پیمانے پر زوال حیدرآباد ہے سارے مسلمانوں کی کمر توڑ دینے والا۔ انا للہ ۱۰ بجے سے شام تک یہی پروگرام رہے گا کمیونسٹ سے بھی خاصی یادیں وابستہ ہیں۔ عیدگاہ، مسجد عالم نگر وغیرہ بھی دیکھنا ہیں یعنی قبروں پر فاتحہ پڑھنا ہے دوسرے دن یہ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ صبح کی چائے ذرا سویرے پینے کا عادی ہوں۔ نماز فجر کے دیر حنفیوں کے ہاں دیر میں پڑھی جاتی ہے، کوئی آدھ گھنٹہ بعد۔ باقی کسی اور وقت کی کوئی خاص پابندی نہیں۔

لائے تھے۔ چونکہ مولانا کا بچپن سیتاپور ہی میں گزرا ہے اس لیے یہاں کے ذرے ذرے سے انہیں والہانہ لگاؤ اور محبت ہے۔ زحمت سفر اس شرط پر گوارا فرمائی کہ ان کا سیتاپور آنا عوام پر ظاہر نہ کیا جائے اور نہ کسی جلسے وغیرہ کا اہتمام ہو۔ سیتاپور آنے کے شرائط اتنے سخت تھے کہ اسٹیشن پر سواری لانے تک کی ممانعت تھی۔ بہت ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ اتفاقاً ایک موٹر کا انتظام ہو گیا ہے۔ اگر کوئی خاص زحمت نہ ہو تو غریب خانے تک اسی پر تشریف لے چلیے۔ اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ صرف یہ فرمایا کہ پہلے سول لائن چل کر اس کوٹھی کے در و دیوار کو گلے لگا لوں جس سے بچپن کی ہزارہا یادیں وابستہ ہیں۔ یہ کوٹھی ریاست محمود آباد کی ملکیت تھی جو خاتمۂ زمینداری کے بعد فروخت ہو گئی تھی۔ اس کوٹھی میں میرے ملاقاتی ایک صاحب ۸۰۵۰ رہتے تھے میں نے انہیں پہلے سے اطلاع کر دی تھی۔ وہ بے چارے منتظر تھے۔ مولانا نے اس کوٹھی کے ہر ایک در و دیوار کو دیکھا۔ ان کی آنکھوں سے عجیب حسرت برس رہی تھی۔ دو دن اور ایک شب کے اس مختصر قیام میں مولانا نے سیتاپور کے ایک ایک گلی کوچے میں پھر کر ماضی کی یاد دل کو تازہ کی۔ یہ کارڈ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ [3] سٹی اسٹیشن سے میرا گھر قریب ہے۔ [4] محمود آباد اسٹیٹ کی وہی کوٹھی جس میں مولانا کے والد ماجد مولوی عبدالقادر صاحب مرحوم کا قیام تھا اور مولانا کا بچپن جس میں گزرا تھا کوٹھی سول لائن سیتاپور میں ہے۔ مگر اب نقشہ بدل گیا ہے۔

اظہر[1] صاحب میرے لیے اجنبی نہیں۔ فرنگی محل میں ایک بار جمال میاں[2] کے ہاں ملاقات ہو گئی تھی بڑی محبت سے پیش آئے اپنی موٹر پر شفاخانے تک پہنچا گئے تھے۔ آپ نے ایک نام غلام رسول[3] کا لیا ہے کچھ اور آتا پتہ دیجیے۔ آپ ہی کے محلے میں ایک صاحب ماسٹر ایوب حسین رہتے ہیں۔ انہیں ۲۰ مارچ کو مطلع کر دیجیے گا کہ اگر وہ کھانے یا چائے کو کہیں تو میری طرف سے منظور کر لیجیے گا۔

محمود آباد سے ہم لوگوں کے تعلقات امیر الدولہ راجہ[4] امیر حسن خان مرحوم کے زمانے سے چلے آتے ہیں ان کی صاحبہ سنا ہے کہ ہم لوگوں کی عزیز بھی تھیں۔ مہاراجہ کے وقت تو یہ تعلقات عزیزانہ حد تک پہنچ گئے تھے۔

ایک صاحب "بہادر مرزا[5]" اسکول میں مجھ سے سینئر تھے۔ محمود آباد میں بجلی کے کام پر ہو گئے تھے ایک بار اتفاق سے ریل میں ملاقات ہو گئی تھی۔ والسلام

دعاگو:

عبدالماجد

(۸)

۳۰ اکتوبر ۱۹۶۱ء — دریاباد۔ ضلع بارہ بنکی

برادرم سلّمہ علیکم السلام

مولوی شاہ[6] عبدالغنی مرحوم کو اپنے بچپن میں بار ہا دیکھا۔ والد مرحوم سے ملنے اکثر تشریف لاتے

---

[1] میرے بڑے بھائی سید محمد اظہر صاحب منیجر محمود آباد اسٹیٹ۔ (ناظم سیتاپوری)

[2] فاتح۔ منزل گولہ گنج لکھنؤ کی وہ تاریخی عمارت ہے جس میں سب سے پہلے "ندوہ" قائم کیا گیا تھا۔ مولانا شبلی کا قیام بھی اسی میں رہتا تھا چونکہ یہ عمارت خود مولانا کے اہل خاندان نے خرید لی ہے اس لیے مولانا جب بھی لکھنؤ جاتے ہیں اسی عمارت میں قیام فرماتے ہیں۔

[3] سابق صدر پاکستان اسکندر مرزا کے ہم زلف آغا سید احمد رضا مرحوم کا خاص ملازم۔ جو بچپن میں مولانا کو کرکٹ اور ٹینس وغیرہ کھلایا کرتا تھا مولانا نے بارہا اس کا ذکر کیا مگر نام انہیں یاد نہیں تھا جب سیتاپور آتے تو بڑی محبت سے غلام رسول کو گلے لگا کر ملتے۔

[4] انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد اودھ کے یک دیال اور فیاض رئیس، راجہ امیر احمد خاں آف محمود آباد کے دادا۔

[5] بہادر مرزا۔ محمود آباد اسٹیٹ میں الیکٹرک انجینئر تھے۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی چلے گئے تھے۔ گرمی ہندوستان کی تھی ملازمی پرمٹ سے ہندوستان آ گئے تھے یہیں حرکت قلب بند ہو گئی غالباً جون پور میں دفن ہیں۔

[6] حکیم مومن خاں مومن دہلوی کے نواسے سیتاپور میں وکالت کرتے تھے۔ اگلے خط میں بھی ان کا نام آیا ہے۔ (ناظم سیتاپوری)

رہتے۔ خود بھی ایک آدھ بار ان کے ہاں جا کر دعوت کھانے کا اتفاق ہوا۔ اتنا ہوش اس وقت کہاں تھا کہ ان کے کلام وغیرہ کو کچھ بھی سمجھ سکتا!

صرف اتنا یاد ہے کہ ان کی نیکی خدا ترسی عبادت گزاری کی شہرت عام تھی۔ قد لانبا تھا، کثیر الاولاد تھے۔ چہرہ پر نورانیت تھی، ضعیفی کا زمانہ شروع ہو چکا تھا۔ داڑھی کے بال کھچڑی تھی۔

ان کے بڑے صاحبزادے نام حبیب غالباً ابھی زندہ ہیں۔ کسی ریاست (غالباً گوالیار) میں قیام تھا۔ وہی غالباً مومن خان کی صاحبزادی کے بطن سے تھے اور بعد کو سنا کہ شعر و شاعری کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔

جی ہاں، رئیس[1] صاحب کی بابت آخری اطلاع یہی تھی کہ اکتوبر ورنہ نومبر میں لکھنؤ آئیں گے۔ کوئٹہ میں تھے غالباً لاہور واپس آ گئے ہیں۔

جی ہاں، ماسٹر ایوب[2] صاحب کی عیادت کے لیے وزیر اعلیٰ صاحب کے جانے کی خبر اخبار میں پڑھی تھی، ایسی شرافت کی مثالیں اب کم یاب ہیں۔ والسلام

عبدالماجد

(۹)

۴ نومبر ۱۹۶۱ء

برادرم! وعلیکم السلام

۱۔ جی ہاں۔ بیویاں ایک سے زائد تو یقیناً تھیں۔ یاد ایسا پڑتا ہے کہ تین تھیں۔ اور اولاد تینوں سے تھی مرحوم (عبدالغنی) کی آمدنی وکالت سے کچھ ایسی کم نہ تھی۔ لیکن کثرت عیال سے زیر بار ہی رہا کرتے تھے۔

۲۔ جی ہاں۔ ایک کا نام عبدالمغنی تھا وہ سیتاپور ہی میں کسی عدالت (غالباً کلکٹری) میں کوئی اہلکار ہو گئے تھے۔

۳۔ مرحوم کے لڑکے پڑھے لکھے کچھ واجبی ہی سے تھے۔ ایک (؟) کا عبدالحی نسبتاً کچھ پڑھ لکھ گئے تھے۔ کوئی چھوٹا سا امتحان پنجاب سے پاس کیا تھا۔ وہی چھوٹا امتحان اس وقت بڑا سمجھا گیا PLAYER بھی اچھے تھے۔ ایک بھائی ان سے چھوٹے عبدالقیوم تھے جن میں مجھ سے کئی سال بڑے تھے پھر بھی چھوٹے

---

[1] رئیس احمد جعفری ندوی

[2] میرے محترم بزرگ۔ یوپی کے وزیر اعلیٰ سی۔ بی گپتا کے استاد، عرصے سے بیمار رہتے تھے۔ وزیر اعلیٰ جب سیتاپور کے سرکاری دورے پر آئے تو بلا کسی پروگرام کے ان کی عیادت کے لیے آئے تھے۔ (ناظم سیتاپوری)

درجہ میں میرے ساتھ ہی تھے۔ مدت دراز ہوئی انتقال ہو گیا۔

۴۔ ایک نواسہ کا نام احمد حسن تھا برانچ اسکول سیتاپور میں مجھ سے ایک سال آگے تھے انتقال وہیں کم سنی میں ہو گیا۔

۵۔ مرحوم کا کینٹین سال وفات ۱۹۴۳ء کہہ سکتا ہوں یقیناً ۱۹۰۱ء و ۱۹۱۰ء کے درمیان ہو گا۔

۶۔ جی ہاں۔ مرحوم کے نام کے ساتھ غازی پوری ہی سنتا اچھی طرح یاد ہے۔ غالباً زمانیہ (ضلع غازی پور) ہی کے تھے باقی بیویوں کی بابت کوئی علم نہیں۔ عجب نہیں کہ اپنے ہی وطن و خاندان کی ہوں۔

والسلام

عبدالماجد

(۱۰)

دریاباد۔ ۱۱ر اپریل ۱۹۶۳ء

برادرم! وعلیکم السلام

معاوضہ یومیہ تو کچھ ایسا گراں نہیں۔ کھانے کا انتظام تو ڈاک بنگلے کے آدمی ہی سے ہو جاتا ہو گا۔

مختار والے مکان میں بعد کو میری ہی برادری کے ایک صاحب مدتوں رہے تھے۔ شیخ مشتاق علی قدوائی مولوی محمود آباد کے مختار تھے۔

مرزا قاسم حسین قزلباش کورٹ انسپکٹر تھے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کا عہدہ اس وقت تک شاید تھا ہی نہیں! میرے والد کے خصوصی دوستوں میں سے تھے۔ ان کے بیٹے فیاض مرحوم کا میرا ساتھ کچھ دنوں رہا تھا۔ فٹ بال کے اچھے کھلاڑی تھے۔ پہلے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سیتاپور ——— بعد محمد تقی ہو کر آئے تھے۔

دوست محمد خاں کی بھی کچھ خبر ہے؟ زندہ ہیں؟ میرے زمانے میں فٹ بال میں بڑا نام پیدا کیے۔

۱؎ سیتاپور سے مولانا کو جو فطری اور روحانی لگاؤ ہے۔ اس اعتبار سے وہ سیتاپور کو اپنا وطن ثانی سمجھتے ہیں۔ مدتوں بعد ۱۹۶۱ء میں میری درخواست پر سیتاپور تشریف لائے تھے۔ غریب خانے ہی پر قیام فرمایا۔ ۱۹۶۲ء میں جب میں نے پھر استدعا کی تو اس شرط پر سیتاپور آنے کے لیے راضی ہوئے کہ قیام ڈاک بنگلے میں کریں گے۔ یہ کرایہ اسی ڈاک بنگلہ کا ہے ——— لیکن سارا پروگرام بنانے کے بعد عین وقت پر ملتوی کر دیا۔

۲؎ مرزا حاتم علی بیگ مہر کے بھتیجے۔

ہوئے تھے۔ عالم نگر میں رہتے تھے ان کے بہنوئی چھیدا خان دلیکون بیرسٹر کی محرری کرتے تھے اور بڑے عبادت گزار کہے جاتے تھے۔

والد مرحوم کے ایک خصوصی دوست سید رضی مرحوم آنریری مجسٹریٹ تھے۔ اب ان کی اولاد باقی ہے؟

آپ اس وقت لکھنؤ ہوں گے۔ اس لیے یہ خط وہیں کے پتے سے ہے۔

ہاں صاحب۔ اگر موقع دیکھیے گا تو گورنر صاحب کی خدمت میں صرف یہ مصرع میری طرف سے عرض کر دیجیے گا ؎

بھول جانا ہمارا یاد رہا۔

اور پورا قصہ سن لیجیے ——— ان کے آتے ہی خط لکھا ——— "یوپی کو ایک اردو نواز گورنر ملا۔ اردو والوں کی طرف سے خیر مقدم کرتا ہوں۔" جواب اردو میں آیا اور بڑے اخلاق کا ——— کہ آپ سے ملنے کی میں مسرت حاصل کروں گا۔ اس کے بعد سے آج کی تاریخ تک ایسی وقت ملاقات کے تعین کا منتظر ہی رہا۔ لطیف یاد دہانی، ایک نہیں، کم سے کم دو بار (عجب نہیں کہ تین بار) کی مطلق جواب تک نہ ملا۔ سعدی نے "در سیرت پادشاہان" جو کہا تھا کہ "گاہے بہ سلامے برنجند گاہے بہ دشنامے خلعت دہند" بس اسے یاد کر کے خاموش ہو گیا۔ اور اب تو موقع اتنا بھی نہ رہا کہ بار بار طلبی ہو سکے۔ والسلام

دعاگو!

عبدالماجد

(۱۱)

لکھنؤ

۱۷ر اپریل ۱۹۶۳ء

برادرم! وعلیکم السلام

اب خدا خدا کر کے اس قابل ہوا کہ کچھ لکھ پڑھ سکوں۔ آپ کی کتاب پر یہ چند سطریں لکھ دیں "غالب نام آورم" کے مرتب نے خود "نام آوری" کے زینے کی طرف پہلا قدم تو اٹھا ہی لیا ہے۔

ان کی یہ چھوٹی موٹی کتاب "ہر چہ بہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر" کا نمونہ اس قابل ہے کہ اسے درس غالبیات کی پہلی کتاب قرار دیا جائے۔

۱؎ سیتاپور کے عمائدین میں تھے۔ لسان القوم صفی لکھنوی کے بزرگ اعزہ تھے۔

تنقل واغلاق سے خالی، غلو واغراق سے بری، تنقید، تحقیق، اور آجکل کی اصطلاح میں تخلیق تینوں کا ایک ہلکا خوشگوار مجموعہ۔

عبدالماجد

جناب نادم سیتاپوری
بذریعہ سلطان حسین صاحب تاجر کتب
بندر روڈ۔ کراچی

(۱۳)

۲۳ اپریل ۶۴ء
دریاباد، بارہ بنکی

برادرم! وعلیکم السلام
خط بڑے وقت سے آگیا۔ ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ سے میں انتظار ہی کر رہا تھا، بلکہ خود لکھ دینا چاہتا تھا۔ اب مستقل شغل کیا رہتا ہے؟ اکبر کا وہ شعر تو یاد ہوگا!

اٹھا تو تھا ولولہ یہ دل میں کہ صرف یادِ خدا کریں گے
معاً مگر یہ خیال آیا ملی نہ روٹی تو کیا کریں گے

خیر خدا کرے ہر طرح خیریت ہو۔
مضمون سجاد حسین کی سنجیدہ ظرافت یوں تو خاصہ ہے، لیکن کچھ تاریخی بے ترتیبیاں نظر آئیں۔

(۱) دلگداز معرکہ گلزار نسیم سے پیشتر ہی نہیں بہت پیشتر ۱۸۸۸ء میں نکل چکا تھا۔ نکل کر بند ہو چکا تھا، بند ہو کر نکل چکا تھا۔ یہ معرکہ تو کہیں ۱۸۹۰ء یا ۱۸۹۱ء میں پیش آیا۔

(۲) "آزاد" شوق والا اصلاً سیاسی رنگ کا تھا۔ ادبی رنگ میں اودھ پنچ کا حریف و مد مقابل "اخبار تفریح" تھا۔ شرر صاحب کے اشارہ پر منشی نثار حسین کا نکالا ہوا۔

(۳) "خار زار نسیم" (شوق) کا علم مجھے پہلی بار ہوا، اور اس پر مجھے حیرت بھی ہے کہ اب تک

---

[1] مسٹر بی ڈاکٹر بی۔ راما کرشنا راؤ۔ حیدرآباد کی ایک ذی علم شخصیت۔ فارسی، اردو اور تلنگی زبانوں کے ماہر، میرے خصوصی مخلصین میں تھے۔ اپریل ۱۹۶۲ء میں یو۔پی کی گورنری سے ریٹائر ہوئے۔ ان کی اردو دوستی اور اردو نوازی آج بھی یو۔پی میں ضرب المثل ہے۔ [2] مطبوعہ نامہ لکھنؤ۔ (نادم سیتاپوری)

کیوں نہیں ہوا تھا۔ معرکہ کا زمانہ بھی ۱۸۹۲ء کے بعد کا ہے۔ اور اس وقت میں معرکہ کی بیشتر چیزوں کے پڑھنے کے قابل ہو گیا تھا۔ خارستان کے دیکھنے کا مشتاق ہوں۔

(۴) تپش کا سال وفات ۱۹۰۲ء کے بعد تو یقیناً ہے، عجب نہیں کہ ۱۹۰۳ء کے بھی بعد ہو۔ مرحوم کا آخری زمانہ بڑی عسرت کا گذرا۔ میرے والد مرحوم کے ان سے دیرینہ تعلقات تھے انہیں کبھی کبھی وہ اپنے مصائب لکھ بھیجتے تھے اور کم سے کم ایک بار تو سیتاپور ان کے پاس ضرور آئے تھے۔ اغلباً ۱۹۰۲ء میں۔

ہاں صاحب اس وقت سیتاپور میں قدوائی صاحب کون ہیں؟ یا تو کوئی وکیل ہیں یا کوئی عہدے دار۔ میرے ایک دور کے عزیز کا انتقال انہیں کے مکان پر ہوا۔ بس اس سے زیادہ معلوم نہیں۔ ان کے پورے نام کی تلاش ہے۔

آپ نے ہر جگہ "تپش" "ت" سے لکھا ہے۔ مجھے خیال پڑتا ہے کہ مرحوم اپنے کو "طپش" "ط" سے لکھتے تھے۔

والسلام
عبدالماجد

(۱۴)

دریاباد
۱۸ جون ۶۴ء

برادرم! السلام علیکم
آپ کا نام دیکھ کر ہمیشہ مضمون پڑھ لینے کا وقت نکال لیتا ہوں۔
تازہ مضمون "معارف" میں پڑھا حسب معمول اچھا ہے۔
صرف دو ایک جزئیات آئندہ کے لیے نوٹ کر لیجیے۔

۱۔ مولوی عبدالغنی مرحوم کے بڑے لڑکے جو بنتِ مومن کے بطن سے تھے ان کا نام نامی حبیب تھا دہلی کے مشہور خاندان سے تھے (نام نذیر وغیرہ کے رنگ کا) خوب لمبے چوڑے تھے اور ابھی کئی سال قبل تک زندہ تھے۔ گوالیار سے کہیں اور چلے گئے تھے۔ عبدالغنی کی ماں دوسری تھیں۔

---

[1] معارف اعظم گڑھ (جون ۱۹۶۴ء) میں میرا ایک مضمون سیتاپور کے کتب خانوں پر چھپا تھا۔
[2] مومن دہلوی کی صاحبزادی جو سیتاپور میں مولوی عبدالغنی وکیل کو بیاہی تھیں۔ (نادم سیتاپوری)

۲- لائبریری جہاں تک مجھے یاد ہے خود سید محمود ہی کی تھی۔ سید محمود نے سیتاپور میں پریکٹس ایک دن کے لیے نہیں کی ہائی کورٹ کے جج رہ کر، ادنا عدالتوں میں جاتے کیسے؟ اور بڑی بات یہ کہ وہ قابل پریکٹس ہی ان دنوں کب رہ گئے تھے — ہر وقت مخمور!۔

بیگم باغ، نہیں مدتوں سول لائن میں رہے تھے ہماری کوٹھی کے بالکل مقابل، بشرق کی طرف! پھوس والے بنگلے میں، بیگم باغ بالکل آخری زمانے میں اٹھ گئے تھے۔

۳- ٹھاکر جواہر سنگھ تو پڑھے لکھے نہ تھے۔ ان کے لڑکے سورج بخش سنگھ البتہ بڑے علم دوست تھے۔ انگریزی میں۔ اور فارسی سے بھی خوب واقف!

حسرت ہے کہ اختر الدولہ سے اپنے زمانہ قیام سیتاپور میں نہ واقف ہو پایا۔

والسلام

عبدالماجد

(۱۵)

دریاباد۔

۱۷ر اپریل ۱۹۶۶ء

بسم اللہ

برادرم! السلام علیکم

جی نہیں بھوشن، پدم بھوشن وغیرہ کا کوئی خطرہ نہیں۔ رقم سے متعلق بھی بڑا دھوکا پبلک کو دیا گیا ہے[1]

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

مفصل روداد خود اپنے قلم سے آئندہ ہفتے "صدق" میں دوں گا۔ آپ کانپور[2] خوب پہنچے سیاست وغیرہ سے تعلق ہو جاتے تو بہت خوب ہے۔

لیکن یہ قیام عطاق محل میں کیا معنی لاحول ولا قوۃ ایسا منحوس نام! "وصال منزل" ہوتا تو ایک بات بھی تھی۔

والسلام

عبدالماجد

(۱) یوپی گورنمنٹ کی اردو ہندی مشترک انعامی کمیٹی نے مولانا مرحوم کو ان کی اردو ادب کی خدمت کے سلسلے میں ہزار کا انعام دیا تھا جو اردو مصنفین کے لیے سب سے بڑا انعام تھا اس خط میں اسی کا ذکر ہے۔ (مرتب کرامت علوی)

(۲) اس زمانے میں نادم صاحب کانپور میں مقیم تھے۔

(۱۶)

بھائی کے انتقال پر مولانا نے یہ تعزیت نامہ تحریر فرمایا۔

دریاباد۔

۳۱ رمئی ۱۹۶۶ء

بسم اللہ

برادرم! السلام علیکم

کل سہ پہر کو حادثہ کی خبر قومی آواز میں پڑھی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

بھائی کا زخم والدین کے زخم سے بس کچھ ہی کم ہوتا ہے۔ اللہ ہر طرح توفیق صبر جمیل دے۔

والسلام، دعاگو

عبدالماجد

(۱۷)

کئی برس سے معمول کے مطابق مولانا مرحوم آخر ستمبر سے ۵، ۶ ہفتے لکھنؤ میں قیام رکھتے تھے۔

لکھنؤ۔

۱۶ر اکتوبر ۱۹۶۶ء

بسم اللہ

برادرم! وعلیکم السلام

آج کل دریاباد سے باہر ہوں اور یہ کارڈ لکھنؤ سے لکھ رہا ہوں۔

کوئی اور اگر یہ سوال میاں چرکین سے متعلق کرتا تو جواب میں صرف یہ لکھ بھیجتا چھی چھی لیکن آپ کی نفاست طبع کو یہ کیا سوجھی کہ خاک کو پاک کرنے کا ارادہ کر لیا۔

اور کچھ مجھے ان بزرگ سے متعلق معلوم نہیں سوا اس کے کہ ردولی ان کا وطن تھا دیوان کی سرسری زیارت صرف ایک بار ہوئی تھی دو ہی چار ورق الٹے تھے کہ متلی ہونے لگی میرے علم میں تو دیوان بھر میں شاید بس ایک آدھ ہی صاف شعر ہے دوسروں کے سامنے پڑھنے کے قابل؛ اس سے تو کہیں بہتر تھا آپ اپنا وقت جانی صاحب پر صرف کرتے کئی سال ہوئے خواجہ محمد شفیع دہلوی ان کے کلام پر کناڈا میں کام کر رہے تھے اور مجھ سے بھی الفاظ و محاورات کے بارے میں مراسلت جاری تھی۔ والسلام

عبدالماجد

(۱۸)

نادم صاحب اس زمانے میں پاکستان آگئے تھے اور فردوس کالونی، کراچی میں مقیم تھے۔

دریاباد۔

۱۸ر جون ۱۹۶۱ء — بسم اللہ

برادرم سلمہٗ اللہ! — وعلیکم السلام

"فردوس کالونی" کے بسانے والے کو اگر "فردوس مکان" یا "جنت نشان" نہ کہوں تو اور کیا کہوں ——

والسلام

عبدالماجد

جناب نادم سیتاپوری صاحب
۹۱۲۔ فردوس کالونی، کراچی

ڈاکٹر آفتاب احمد ردولوی (ڈھاکا)

(۱)

مکتوب الیہ کی تصنیف "گلہائے داغ" کی رسید کے طور پر یہ خط تحریر فرمایا۔ دوسرے خط میں بھی ان کی تصنیف "صہبائے مینائی" اور "شبلی" پر ان کی کتاب کا ذکر آیا ہے۔

دریاباد

۲۳ر مارچ ۱۹۵۸ء — بسم اللہ

عزیزم سلمہٗ! — السلام علیکم

"گلہائے داغ" کا پیکٹ کل دوپہر موصول ہوا۔ سرسری نظر اسی وقت کر گیا، دل خوش ہو گیا۔ مدت کے بعد اپنی زبان اور اپنے رنگ کی تحریر پر نظر پڑی ورنہ یونیورسٹی کے "دکاترہ" نے تو وہ زبان اردو؛ طرز تنقید نکالی ہے کہ میرے پلے تو کچھ پڑتا نہیں۔

کتاب کی رسید فوراً لکھے بھیجتا ہوں۔ صدق میں ذکر کرنے کی نوبت البتہ مہینوں بعد آئے گی اس سے قبل گنجائش نکلنے کا کوئی امکان نہیں لیکن پبلشر کے اس جرم کو ہرگز نہیں معاف کر سکتا ہوں کہ ظالم نے فہرست مضامین قسم کی کوئی چیز ہی نہ رکھی۔

والسلام، دعاگو،

عبدالماجد

(۲)

دریاباد

۱۸ر اپریل ۱۹۵۹ء

بسم اللہ

عزیزم سلمہٗ! — السلام علیکم

"صہبائے مینائی" کل موصول ہوئی، انشاء اللہ اسے وقت نکال کر پڑھوں گا اور ضرور پڑھوں گا، لیکن "آفتاب" کی یہ شاید پہلی "شعاع" ہے جو "گلہائے داغ" کے بعد اس "فن" کے نصیب میں آئی۔ "شبلی" کی زیارت کو تو آج تک آنکھیں ترستی ہیں۔

"لسان العصر" کا اشتہار دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی۔ — دعاگو:

عبدالماجد

(۳)

دریاباد ——

۱۰ر نومبر ۱۹۶۰ء — بسم اللہ

عزیز کرم! — وعلیکم السلام

"مہر نیمروز" نومبر نمبر اس ذرہ بے مقدار کی نظر سے بھی گزرا۔ پورا پڑھنے کی فرصت کہاں پھر بھی ایک نظر ایک شعر پر تو کر ہی گیا۔ خوب خوب گاؤزوریاں موافقت و مخالفت دونوں میں دیکھیں۔ ناگاہ نگاہ ص۲۱ کے وسط پر پہنچ کر رک گئی گویا من وعن اپنی تحریر سامنے تھی وہی تشبیب وہی گریز!

نظر جم گئی ایک ایک لفظ رک رک کر پڑھا۔ عقل نے لاحول پڑھی کہ بھلا یہ بھی کوئی پہلو داد و تحسین کا ہے۔

دل اندر ہی اندر کھل گیا کہ بری یا بھلی اپنی چیز اپنی ہی ہوتی ہے۔ اور اپنی چیز سے خوش کون نہیں ہوتا ——

دعاگو

عبدالماجد

سید علی عباس حسینی (لکھنؤ)

مکتوب الیہ نے مرزا محمد ہادی رسوا کی ایک کتاب "طلسم اسرار" مل جانے کی خوش خبری سنائی تھی مولانا کو انگریزی تفسیر کا ذکر کیا تھا اور صاحب کلام کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ نیز مولانا

سے تاریخ عرب قبل از اسلام لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ حبیب سے مراد مولانا کے بھتیجے
اور داماد ہیں جو یوپی سکریٹریٹ (لکھنؤ) میں ملازم تھے اور دریاباد ہر ہفتے آتے جاتے تھے۔
شیخ عنایت اللہ تاج کمپنی لمیٹڈ پاکستان کے منیجنگ ڈائرکٹر تھے۔

دریاباد
۱۵ رمئی ۱۹۵۸ء

بسم اللہ

برادرم! وعلیکم السلام

طلسم اسرار تک رسائی مبارک لیکن حضرت یہ تنہا خوری کیا معنی؟ میں تو شاید آپ سے
بھی زیادہ بھوکا تھا۔ بہر حال ایک نظر تو مجھے دکھا ہی دیجیے۔

اپنے پاس زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ رکھوں گا۔ حبیب سلمہٗ ایک ہفتے آئیں گے
اور دوسرے ہفتے واپس پہنچا دیں گے۔ جزاک اللہ!

انگریزی تفسیر لکھنے میں چار پانچ سال لگ گئے اور پھر نظر ثانی وغیرہ میں دو ایک سال
اور ۱۹۲۳ء میں شروع کی تھی ۱۹۴۰ء کے شروع میں مسودہ ناشر صاحب کے ہاتھوں میں پہنچ
گیا تھا۔ ان کی "عنایت" کہیے (منیجنگ ایجنٹ کا نام شیخ عنایت اللہ ہے) یا میری قسمت
کہ اتنی مدت میں اور پچاسوں تقاضوں کے بعد اب تک کل پہلی جلد نکل پائی ہے۔

سمجھا تھا جن کو پھول وہ نکلے شرار سنگ
شیشے مرے نصیب سے پتھر کے ہو گئے

اردو تفسیر اس کے بعد شروع کی تھی اس کا نصیب اس سے کچھ بہتر رہا۔ اب تک چار
جلدیں نکل چکی ہیں اور تین باقی ہیں۔

مزار سوا شرور تیار کیجیے اور کرائیے۔ ہر امکانی خدمت کے لیے حاضر ہوں۔ آپ کی
فرمائش ہے بڑی ضروری اور اہم لیکن پورا وقت اور پوری محنت چاہتی ہے۔ ایک سن ایسا
آ جاتا ہے کہ جب خود کوئی نیا مستقل کام شروع کرنے کے بجائے طبیعت دوسروں کی مدد
اور مشورہ دینے اور انہیں DIRECT کرنے پر زیادہ آمادہ رہتی ہے یہی صورت اس موضوع کے
لیے ہے۔ کوئی اور صاحب ہمت کریں تو ان کے ساتھ شریک ہو جانے پر حاضر ہوں۔ ہاں خوب
یاد آیا شررؔ مرحوم کی کتاب اس موضوع پر ضرور دیکھ ڈالیے کتاب کا نام بھی غالباً یہی ہے۔
تاریخ عرب قبل از اسلام۔ یہ جواب پہلی ڈاک سے جا رہا ہے ۱۲؍ کا عنایت نامہ ۱۴؍ کی

شام کو ملا۔

عبدالماجد

(۲)

حسینی صاحب مرحوم کے انتقال پر ان کے فرزندوں کے نام مولانا دریابادی کا تعزیتی مکتوب

دریاباد۔
۳۰ ستمبر ۱۹۶۹ء

بسم اللہ

عزیزان گرامی! السلام علیکم

حسینی مرحوم کی سناونی سننے میں آئی دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ انا للہ۔ میرے
قدیم مخلصوں میں تھے اور جوہر شرافت کے ایک پیکر مجسم تھے۔
تم لوگوں اور تمہاری والدہ پر جو کچھ گزر رہی ہو گی اس کا تجربہ ہر صاحب تجربہ کو ہے
بس اللہ ہی صبر اور برداشت کی قوت عطا کرے۔
آئندہ ہفتے انشاء اللہ اگر مرحوم کی تربت پر فاتحہ پڑھنے جاؤں گا اور اپنے اور ان
کے مشترک دوست سید مسعود حسن رضوی کو ہمراہ لے کر۔
اپنی والدہ کو ضرور میری طرف سے پیام تعزیت پہنچا دینا۔

والسلام عبدالماجد

شیخ قدیر الزماں (لکھنؤ)

ایک پرانے اور گھر پر ور دہ ملازم تبغ علی ناراض ہو کر گھر سے چلے گئے تھے، خاتون منزل
میں رہنے والے ایک دوسرے صاحب منشی دلیل اللہ جن سے اس خاندان کے عزیزانہ
تعلقات تھے، سمجھا بجھا کر انہیں واپس لے آتے۔ مولانا دریابادی کو معلوم ہوا تو انہوں
نے اپنے بھانجے اور داماد شیخ قدیر الزماں کو یہ خط لکھا۔

دریاباد
۹ راگست ۱۹۵۸ء

بسم اللہ

عزیزی سلمہٗ! السلام علیکم

اولیا را ہست قدرت از اِلٰہ
تیر جستہ باز گرداند ز راہ

یہ "ولیل اللہ" بھی اس سفلی عالم میں عالم علوی کے اولیاء اللہ سے کچھ کم نہ نکلے "تیغ بے نیام" کو خوب "نیام" میں کر کے لے آتے۔ انعام نہ سہی داد سے تو بہرحال انہیں مالا مال ہی کر دینا۔ ابھی ابھی یاد پڑا کہ ولیل اللہ کے والد کا نام ولی اللہ تھا۔ سبحان اللہ ایک ولی اللہ نام کے دوسرے کام کے۔ یوں بھی لڑکا ہوتا آخر کاہے کے لیے ہے۔ باپ کا نام روشن کرنے کے لیے۔ اس کے ادھورے کام پورا کرنے یا اگر پدر نتواند پسر تمام کند

فقط
عبدالماجد

ڈاکٹر یوسف حسین خاں (علی گڑھ)

(۱)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر بنائے جانے پہ مبارک باد کا خط۔

دریاباد
۱۸ اگست ۱۹۵۸ء

بسم اللہ

برادرم! السلام علیکم

یوسف گم گشتہ باز آید بہ کنعاں غم مخور

گم گشتہ نہ سہی علی گڑھ کے از دست رفتہ تو یہ یوسف بھی تھے۔ واپسی اور وہ بھی پرو وائس چانسلری پر۔ اللہ ہر طرح مبارک کرے۔ والسلام

دعاگو،
عبدالماجد

(۲)

مکتوب الیہ کے بڑے بھائی ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جمہوریہ ہند کے انتقال پر تعزیت نامہ

دریاباد۔
۵ مئی ۱۹۶۹ء

بسم اللہ

برادرم! السلام علیکم

تعزیت کا خط لکھنے تو بیٹھ گیا لیکن سوچ رہا ہوں کہ لکھوں تو کیا لکھوں۔ اور آپ سب لوگوں کو خاص کر تازہ بیوہ کی تسکین قلب کے لیے کون سے لفظ استعمال کروں۔

موت برحق اور ہر ایک کے لیے ہے اور خوف و ہراس کی چیز نہیں یہ تو بندہ کی حاضری اپنے نہایت شفیق مالک و مولا کے دربار میں ہے لیکن وہ غم نصیب کیا کہہ کر اپنے دل کو سمجھائے جس کا سہاگ دنوں اور گھنٹوں میں نہیں منٹوں میں لٹ گیا اور جس کی بادشاہی چشم زدن میں خاک میں مل گئی۔ ذرا سا بھی تیاری کا موقع تو اس بیچاری کو یا آپ لوگوں میں کسی کو نہ مل سکا۔

لیکن یقین کیجیے یہ سب ایک طریقہ اجر بڑھانے کا ہے۔ اجر بے حساب و ناقابل پیمائش اور اس کا جتنا زیادہ استحضار جس کسی کو ہوگا اسی نسبت سے اس کا دل سکون میں رہے گا بس اس کو دل کی گہرائیوں میں اتار لیجیے اور اپنا وقت زیادہ سے زیادہ مرحوم کے لیے دعائے خیر میں صرف کیجیے۔

میرا تعلق تو صرف مرحوم سے عزیزوں کا سا تھا بے شان و گمان یہ خبر پا کر دل پر جو کچھ گزری بالکل ظاہر ہے۔ معاً دعائے مغفرت کی، بار بار دعا بھی مختلف نمازوں کے بعد کیں اور دعا میں لڑکیاں بھی برابر شریک رہیں۔

بہرحال اللہ انہیں جنت نصیب فرمائے اور اب بس یہی ان کے کام آنے والی چیز ہے ———

والسلام
دعاگو، عبدالماجد

پروفیسر عبدالوہاب بخاری

دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) کے سفیر عزیز الٰہی حسن پوری کے تعارف میں۔

دریاباد
۲۴ نومبر ۱۹۵۸ء

بسم اللہ

مکرم محترم! السلام علیکم

اس عریضہ کے حامل ماسٹر عزیز الٰہی بی اے (علیگ) سفیر ندوہ کی حیثیت سے حاضر خدمت ہو رہے ہیں۔

علاوہ اپنی اس سرکاری حیثیت کے میرے مخلص خصوصی ہیں۔ نام کے "عزیز" ہیں لیکن مصر ندوہ کے "یوسف" سے کم نہیں۔ آپ کی نگاہ اعجاز ندوہ کی قدردانی کے لیے یقیناً کوئی "زلیخا" ڈھونڈ نکالے گی۔

والسلام
عبدالماجد

بابائے اردو مولوی عبدالحق (کراچی)

دریاباد
۸/اپریل ۱۹۵۹ء

(۱)

بسم اللہ

مخدوم و مکرم! السلام علیکم

"اردو" کا تازہ ڈبل نمبر کل موصول ہوا۔ دو ایک باتیں اس نمبر کے متعلق عرض کرنے کی ہیں، ملاحظہ ہوں:

(۱) صفحہ ۲۰۷ پر ذکر مرزا محمد ہادی رسوا لکھنوی کے منظوم ڈرامے "مرقع لیلیٰ و مجنوں" کا ہے اور لکھا ہے کہ ڈرامہ ۱۸۸۷ء میں الناظر پریس لکھنؤ میں طبع ہوا، ۷۰ صفحات میں۔

(الف) گزارش ہے کہ اول تو یہ تصنیف مرزا لکھنوی کی ہے نہ کہ "رسوا" کی۔ مرزا صاحب اس وقت تک محض مرزا تھے اور شاعری میں یہی تخلص آخر دم تک رکھا۔ "رسوا" کا لقب تو انہوں نے بہت بعد میں صرف ناول نگاری کے لیے اختیار کیا تھا۔ مرقع میں تخلص جہاں جہاں بھی آیا ہے مرزا ہی آیا ہے۔

(ب) سنہ طبع جو ۱۸۸۷ء درج کیا گیا ہے یقیناً صحیح ہوگا۔ پہلا ایڈیشن اسی سال نکلا ہوگا، لیکن الناظر پریس کا اس وقت کہیں وجود ہی نہ تھا۔ یہ تو کہیں اس کے ۲۰، ۲۲ سال بعد قائم ہوا ہے۔ میرے پاس جو نسخہ ہے وہ طبع ثانی ہے الناظر پریس کا چھپا ہوا لیکن اس پر سنہ کوئی درج نہیں ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ ۱۹۱۱ء کا ہوگا۔ اس کی ضخامت ۷۰ نہیں ۹۷ صفحہ ہے۔

(ج) کوئی ادیب مادر زاد ادیب نہیں ہوتا۔ پختگی آتے آتے ہی آتی ہے۔ یہ "مرقع" مرزا صاحب کی بالکل ابتدائی تصنیفوں میں سے ہے اسے اسی معیار سے دیکھنا چاہیے۔ "امراؤ جان ادا" اس کے بعد کی تصنیف ہے کم از کم بارہ سال بعد کی۔ اس وقت ان کا قلم خوب منجھ چکا تھا۔

(د) مرزا صاحب سے ۱۸۸۷ء میں اس کی توقع رکھنا کہ انہوں نے فن میں کوئی اصلاح و تجدید یا ترمیم کی ہوگی غلط ہے۔ ان کے پیش نظر اصلاح فن نہ اس وقت رہی نہ اس کے بعد وہ صرف زبان کے رسیا تھے اور زبان کی صحت، سلاست، لطافت اور نزاکت کے معیار سے دیکھا جائے تو اس مرقع اور اس کے معاصر دو ڈراموں کے درمیان نمایاں فرق نظر آتا ہے۔

(۲) شوکت سبزواری کے دونوں مضمون اور تیسرا مضمون "کلام اقبال کی زبان" تینوں بہت خوب ہیں۔ ہر طرح قابل داد البتہ ص ۳۹۵ پر وسط میں امیر مینائی کے سلسلہ میں جو یہ فقرہ درج

ہے کہ "ان کے کلام کا مجموعہ "صنم خانۂ عشق" کے نام سے شائع ہوا ہے" یہ فقرہ اگر یوں ہوتا تو صحیح تر ہو جاتا کہ "ان کے عاشقانہ کلام کا دوسرا مجموعہ "صنم خانۂ عشق" کے نام سے شائع ہوا ہے"۔

والسلام
دعاگو عبدالماجد

(۲)

دریاباد
۲۲/جون ۱۹۵۹ء

بسم اللہ

حضرت والا! السلام علیکم

تازہ "اردو" پیش نظر ہے۔ مقالۂ فاضلانہ "مقدمہ جدید اردو لغت" کا کیا کہنا۔ مقالہ نگار کی شان علم و مرتبۂ تحقیق کے مطابق۔

اجازت ہو تو دو ایک معروضات اپنی بساط کے مطابق پیش کروں۔

(۱) نفائس اللغات ہی کے طرز پر ایک اور لغت لکھنؤ میں تصنیف ہوا تھا۔ امجد علی شاہ کے زمانہ میں نام "انفس النفائس" مصنف میر حسن لکھنوی سال تصنیف و طبع ۱۲۶۴ ہجری ضخامت ۲۲۰ صفحہ مطبوعہ میر حسن رضوی ہر صفحہ دو کالمی۔ ہر کالم میں تین خانے۔ پہلا ہندی بہ معنی اردو لفظ کے، دوسرا فارسی اور تیسرا عربی کا۔

(۲) جلال لکھنوی کی سرمایۂ زبان اردو ۱۳۰۱ ہجری سید احمد دہلوی کی لغات النساء ۱۹۱۷ء خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی کی لغات اردو چار جلدوں میں ۱۹۲۲ء / ۱۹۲۴ اور خود انجمن ترقی اردو کی شائع کی ہوئی فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں قابل ذکر و قابل توجہ کتابیں ہیں۔

(۳) انجمن ہی کی شائع کی ہوئی قدیم فرہنگ مصطلحات اور جدید اصطلاحات جغرافیہ و فرہنگ اصطلاحات علم ہیئت سب ہی اہل لغت کے لیے ایک قیمتی مصدر و ماخذ کا کام دے سکتی ہیں۔

(۴) منیر لکھنوی کی بازاری زبان و اصطلاحات پیشہ وراں ۶۴ صفحہ مطبوعہ کانپور ۱۹۳۰ء بھی اہل لغت کے لیے کار آمد ہے اور اسی طرح میر کی محاورات ہند بھی۔

(۵) مہذب اللغات بجائے خود اچھی کتاب ہے، البتہ اس کی دو باتیں بڑی تکلیف دہ ہیں ایک ہندی کی بھرمار اور دوسرے اس کا مناظرانہ و تفوقانہ لب و لہجہ۔

خدا آپ کی عمر و صحت میں برکت دے، آپ کی نگرانی میں کتاب ان شاء اللہ قابل دید ہوگی۔

والسلام
عبدالماجد

احمد جمال پاشا (لکھنؤ)

مکتوب الیہ نے مولانا دریابادی سے چند سوالات کیے تھے۔ مولانا مرحوم نے ان سوالات کے سامنے جوابات تحریر فرمادیے۔

دریاباد

۲۹ / اپریل ۱۹۵۹ء بسم اللہ

سوال۔ (۱) آپ کے خیال میں انشائیہ کی وہ کیا خصوصیات ہیں جو اسے تمام ادبی مضامین سے الگ کرتی ہیں؟

(۲) سرسید، شبلی، آزاد، حالی میں کسے آپ انشائیہ نگار کی حیثیت سے زیادہ پسند کرتے ہیں؟

(۳) مہدی افادی کی انشائیہ نگاری کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب:

(۱) انشائیہ کی امتیازی خصوصیت حسن انشا، یہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے۔ انشائیہ وہ ہے جس میں بجائے مغز اور مضمون کے کامل توجہ حسن اور عبارت پر ہو۔

(۲) ان چاروں میں انشائیہ نگار صرف آزاد تھے۔ باقی تینوں اپنی اپنی جگہ اچھے لکھنے والے اور ماہر فن ادیب تھے لیکن انشا پردازی ان میں سے کسی کی مقصود اصلی نہ تھی۔

(۳) وقت اور ماحول و معیار کے لحاظ سے اچھے انشا پرداز تھے۔ عمر کم پائی۔ کچھ اور زندہ رہ جاتے تو کہیں بہتر نکلتے۔ والسلام

عبدالماجد

صدر مجلس استقبالیہ اردو کانفرنس (حیدرآباد۔ دکن)

دریاباد

۸ / جون ۱۹۵۹ء بسم اللہ

کرم گستر! وعلیکم السلام

اردو کانفرنس میں تقریریں تو بہت ہو چکیں۔ اپنی کانفرنس میں سب سے زیادہ زور عملی پہلو پر دیجیے۔ اردو کا سکہ کہیں نہ کہیں چلا کر دکھایئے۔ مثلاً یہ کہ اسکولوں اور کالجوں میں اردو چل جائے

جیسے کہ پہلے چلی ہوئی تھی۔ پارسل کے ٹکٹ پر، ڈاک کے ٹکٹ پر، بینکوں پر، کرنسی نوٹوں پر، دفتروں کچہریوں کی تختیوں پر اردو حروف از سر نو نظر آنے لگیں۔

کانفرنس کی اصل کامیابی کا معیار انہیں عملی پہلوؤں کو رکھیے۔

والسلام

عبدالماجد

مولانا جمال الدین عبدالوہاب فرنگی محلی (معروف بہ جمال میاں)

مولانا جمال میاں فرنگی محلی نے مولانا دریابادی کو کھدر کا کرتا پاجامہ تحفہ بھیجا تھا جو انہیں راجہ صاحب محمود آباد نے دیا تھا۔

دریاباد

۲۵ / جولائی ۱۹۵۹ء بسم اللہ

برادرم سلمہ! السلام علیکم

وہ خرقہ کل جمعہ کے وقت پہنا —— ماشاء اللہ و سبحان اللہ اتنا سبک، اتنا لطیف، اتنا نفیس کہ جسم معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ ملبوس ہے بھی! حلۂ بہشتی کا نمونہ —— جمال کا کمال!

اخلاص کا قائل پہلے ہی سے تھا کرامت کا معتقد اب ہونا پڑا۔ جزاک اللہ و بارک اللہ

دعاگو و دعاخواہ:

عبدالماجد

بیگم چودھری الطاف حسین (۱)

ایک اونچے سرکاری عہدہ دار (چودھری الطاف حسین) نے جو ہر طرح سلیم الطبع، حلیم المزاج اور پابند مذہب مسلمان تھے۔ اور ابھی سن بھی زیادہ نہ تھا، کسی فوری جنونی دورے میں مبتلا ہو کر بالکل یک بیک ۱۲/ اکتوبر ۱۹۵۹ء کو صبح ۸ بجے خودکشی کر لی، ذیل کا تعزیت نامہ اُن کی جوان بیوہ کو جو دور کی قرابت دار بھی ہوتی ہیں، لکھا گیا۔

دریاباد

۱۵/ اکتوبر ۱۹۵۹ء

عزیزہ مسلمہا! دعائیں

بادشاہت گئی اور آناً فاناً گئی، بجلی گری اور یک بیک گری! نازوں میں پلی ہوئی، شوہر کی ناز برداریوں میں بسی ہوئی، خوش نصیب، خوشحال سہاگن، دم کے دم میں رانڈ کیا ہو کر رہ گئیں۔

آزمائش کڑی آزمائش ہر بیوہ کی ہوتی ہے، تمہاری آزمائش اتنی بڑی اتنی کڑی ہوئی کہ عجب نہیں جو فرشتوں کے بھی دل ہل گئے ہوں۔

خود تمہارے ماں باپ پر بھی ہزاروں میل دور بیٹھے کیا گذری ہوگی! ایمان اور عقیدہ کے امتحان کا اصل وقت یہی ہے۔ تسکین کا سہارا، تسلی کا خزانہ بھی ایمان ہی تو ہے۔ یہ نہ بھولنے پائے کہ جس نے یہ وقت دکھلایا ہے، وہ سب سے زیادہ رحمدل ہے، اُس کے یہاں سے کسی ظلم کا امکان ہی نہیں، خدا جانے اسے کیا کیا درجے تمہیں دینا منظور ہیں۔ آج ان مرتبوں کا کوئی اندازہ بھی نہیں ہو سکتا۔ جس طرح ابھی کل تک کوئی انسانی دماغ اس حادثہ کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔

مرحوم کے ساتھ معاملہ جو کچھ بھی ہو تم تو بہرحال بے قصور و بے گناہ مظلوم ہی مظلوم ہو اور حشر میں جب مظلومیت کی سفید چادر اوڑھے بیکسی کے آنسوؤں اور سسکیوں کے ساتھ فریادی بن کر پیش ہوگی تو دیکھنا کہ کیسے کیسے انعاموں سے سرفرازی ہوتی ہے کیسی کیسی دولتوں سے جو آج تمہارے تصور میں بھی نہیں آسکتیں، تمہیں مالا مال کیا جاتا ہے۔

یقیناً تمہارا ظرف بہت اونچا سمجھا گیا جب ہی اتنا بڑا بار تم پر ڈالا گیا، یہ مرتبہ ہر ایک کو نصیب نہیں ہوا کرتا۔

آج لوگ تمہارے اوپر ترس کھاتے ہیں کل سب رشک کریں گے انشاءاللہ۔ زخم کا مرہم بس یہی عقیدہ اور ایمان ہے اس دنیائے فانی کی بڑی سی بڑی بھی لذتیں گنے دن کی! راحتیں اور لذتیں تو بس آخرت ہی میں ہیں۔ جس کی طرف ہم سب کیا بوڑھے کیا جوان دوڑتے لپکتے ہوئے چل رہے ہیں۔

کل شام کو جب اخبار میں خبر پڑھی تو پہلے تو مجھے خود ہی یقین نہ آیا۔ اور پھر جب لڑکیوں اور اُن کی والدہ کو سنائی تو سب گویا سکتے میں آگئیں۔ مگر بجلی ہی ایسی ہے اتنی سخت کہ اپنے تو اپنے بیگانوں کے بھی دل لرز گئے۔

دُعاگو:

عبدالماجد

خفائی

"ہماری زبان" علی گڑھ میں ایک مضمون پڑھ کر اسی اخبار کی معرفت

دریاباد

۱۷ اکتوبر ۱۹۵۹ء بسم اللہ

کرم گستر! السلام علیکم

آپ "خفائی" ہوں یا شدت ظہور سے "ظہوری" بہرحال اُردو پر لکھنے کا حق ادا کر دیا۔ مدت کے بعد اردو کے حق میں اتنا گہرا، پُرمغز اور حقیقت پسندانہ مضمون دیکھنے میں آیا اور قلم بیساختہ داد دینے پر مجبور ہو گیا۔

آپ شاگرد رشید "جس کسی کے بھی ہوں ماشاءاللہ اپنے فن میں اُستاد ہیں۔

والسلام

عبدالماجد

سید مصباح الدین (لکھنؤ)

مکتوب الیہ نے اپنی بیٹی کی شادی میں مولانا دریابادی کو شرکت کی دعوت دی تھی۔

دریاباد

۲۹ دسمبر ۱۹۵۹ء بسم اللہ

کرم گستر! السلام علیکم

"نور نظر" کی رخصتی خدا کرے "مصباح" کی نظر میں نور مزید پیدا کرے اور فرض کی انجام دہی دلہن کے دل میں سرور اور آنکھوں میں نور کا باعث ہو۔

اَللّٰھُمَّ اَلِّفْ بَیْنَھُمَا کی دعا میں سے پڑھے دیتا ہوں۔

دُعاگو:

عبدالماجد

سید نظامی (ایڈیٹر نوائے وقت لاہور) (۱)

دریاباد

۷ جنوری ۱۹۶۰ء بسم اللہ

برادرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

اس خط کے حامل ماسٹر عزیز الٰہی بی اے ہیں جنہیں ہم لوگ اپنی صحبتوں میں یادالٰہی کے نام سے یاد کرتے ہیں، میرے مخلص خصوصی ہیں اور اس وقت سفیرِ ندوہ کی حیثیت سے لاہور میں مقیم ہیں۔

ان کے خط سے معلوم ہوا کہ وہاں کام صرف آپ ہی کی معاونت و توجہ سے تمام ہو سکتا ہے، مجھے ذاتی طور پر اس سے بڑی غیرت آتی ہے کہ لکھنؤ لاہور کے آگے دستِ احتیاج پھیلائے لیکن ارباب ندوہ اخوتِ دینی کے نشہ میں سرشار جغرافیائی و سیاسی من و تو کے قائل نہیں۔

خیر خدا کرے اس تعارف نامہ کے بعد سفارت ندوہ میں کامیاب لوٹے اور نوائے وقت "نوائے ملت" ثابت ہو۔

دعاگو و دعا خواہ،

عبدالماجد

(۲)

حمید نظامی مرحوم کے انتقال پر ایڈیٹر نوائے وقت (مجید نظامی) کے نام مولانا کا تعزیتی مکتوب

دریاباد

۲۶ فروری ۱۹۶۲ء بسم اللہ

تعزیت نامہ لکھنے بیٹھا ہوں مگر تعزیت کروں تو کس سے کروں؟ صرف مرحوم کے اعزہ سے؟ صرف دفتر نوائے وقت لاہور سے؟

تعزیت کا مستحق سارے پاکستان کا پریس ہے، سارا پاکستان ہے، پاکستان کا ہر طبقہ ہے بلکہ یہ کہنا بھی داخل مبالغہ نہیں کہ سارا عالم اسلامی ہے۔

ایسا اخلاص اب عنقا ہے، ایسا پیکرِ شرافت و مجسمۂ انسانیت اب ڈھونڈھنے سے کہاں ملے گا؟

صبح کام کرنے میز پر بیٹھا ہی تھا کہ قیامت خیز تار کل دو بجے دوپہر کا چلا ہوا ملا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ رات ایک خواب پریشان کن و تکلیف دہ دیکھا تھا تعبیر کتنی جلد مل گئی، مرحوم میرے تو خصوصی مخلص و محسن تھے۔ اللہ بال بال مغفرت کرے، کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ عین رمضان اور وہ بھی اس کے عشرہ دوم کے ختم پر لقائے رب اولیں خوش نصیبی ہے۔ مرحوم کے اعزہ یقین رکھیں آسمان تنہا انہیں پر نہیں ٹوٹ پڑا ہے، ان کے غم، دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھنے والے اور ان ہی کی طرح سوگ منانے والے ابھی بہت سے ہیں اور انہیں میں یہ دور افتادہ بھی ہے۔

ان سطور کی تحریر کے وقت تدفین بھی ہو چکی ہوگی۔ کیسا دل بے خبر بھر آ کر رہا کہ کاش اڑ کر پہنچ سکتا۔ اور اس

جوہر و کفن پوش کا آخری نظارہ اس عالم ناسوت میں کر سکتا۔ جا جنت کا مسافر اور اپنی خدمات کا صلہ جلد سے جلد پا!

والسلام

سوگوار و دعاگو: عبدالماجد

<u>صدقِ جائس سے (رسائے بریلی)</u> (۱)

مکتوب الیہ کا ایک سلسلۂ مضمون پرنس معظم جاہ جو تیسرے پرنس حیدرآباد دکن ہیں کے درباری حالات کے بارے میں ساقی کراچی میں نکل رہا تھا۔ بعد میں یہ سلسلہ "دربار در دربار" کے نام سے مسعود حسن رضوی نے لکھنؤ سے شائع کر دیا تھا۔ اس کا دوسرا حصہ پاکستان سے شائع ہوا۔ "تازہ قسط ساقی" سے اشارہ اسی سلسلے کی طرف ہے۔ ناظم رامپوری سے مراد نواب یوسف علی خان والئ رامپور ہیں۔

دریاباد

۱۳ جنوری ۱۹۶۰ء بسم اللہ

تازہ قسط ساقی میں پڑھ کر

"طلاق" لکھنؤ کی عام زبان میں تو جیسا آپ نے لکھا مونث ہی ہے لیکن مرزا محمد ہادی رسوا فرماتے تھے کہ میری زبان پر تو مذکر ہے اور سند میں اس ضرب المثل کو پیش کرتے تھے کہ جمعہ کا نکاح اور ہفتہ کا طلاق۔ نور اللغات میں ایک شعر بھی وزیر کا خلاف جمہور درج کیا ہے، دوسرا مصرع ہے ع

دنیا کو طلاق اپنے بزرگوں نے دیا ہے

ناظم رامپوری کی وہ مشہور غزل عجب نہیں کہ غالب کی ہو۔ تخیل و زبان دونوں پر رنگ غالب ہی غالب ہے مولانا شبلی فرماتے تھے کہ کلام ناظم کا خاصہ غالب ہی کا کہا ہوا ہے، تضمین بھی غزل ہی کی کہہ کے کی ہے۔

والسلام

عبدالماجد

(۲)

جس کتاب کی تیاری کا ذکر کیا ہے، اس سے مراد "دربار در دربار" ہے جو مسعود حسن رضوی اپنے مکتبے سے شائع کر رہے ہیں۔

دریاباد

۱۲ مارچ ۱۹۶۲ء بسم اللہ

کرم گستر! وعلیکم السلام

مسعود صاحب کا خط تو خود اس وقت پہنچ چکا ہوگا۔ انہوں نے کئی دن ہوئے تحریر فرمایا تھا کہ براہ راست بھیج رہے ہیں، کتاب اس وقت ان کے دعوے کے مطابق تیار ہو گئی ہوگی۔

صدق "نیرنگِ خیال" کے تبادلے میں جاری ہو چکا ہے۔

اس لفظ کا املا مدت سے مختلف فیہ چلا آرہا ہے۔ جلال (لکھنوی) فرہنگ آصفیہ، نور اللغات "اش اش" کی تائید میں ہیں (اور) ان کے نزدیک یہ لفظ اشاش بروزن تلاش کا مخفف ہے، لیکن میں نے اکثر ادیبوں کے قلم سے "عش عش" دیکھا ہے اور صاحب فرہنگ اثر پوری طرح اس کی تائید میں ہیں۔

میری زبان و قلم پر بھی یہی املا ہے۔

قولِ فیصل یہ ہے کہ دونوں صورتیں پوری طرح جائز ہیں۔

والسلام مع دعاگو،

عبد الماجد

(۳)

صدق جدید کے پرانے رکن کی بیٹی کے نام مولانا دریابادی کا تعزیت نامہ

دریاباد

۱۱ رجنوری ۱۹۶۶ء بسم اللہ

عزیزہ سلمہا! دعائیں

مرحوم کی خبر وفات دفعۃً پاکر دل دھک سے رہ گیا۔ اناللہ۔ اللہ پاک بال بال مغفرت فرمائے۔ میرے پرانے مخلص تھے۔

مغفوریت کی یہ دلیل کافی ہے کہ ماہ مبارک (رمضان) وفات کے لیے پایا اور اس کا بھی آخری عشرہ جو مغفرت کے لیے مخصوص ہے۔ صدق میں انشاءاللہ خبر شائع کردوں گا۔

"دربار دُربار کے دوسرے حصے کا مسودہ خدا معلوم کس منزل میں ہے۔

غم و صدمہ جب میں محسوس کر رہا ہوں تو ظاہر ہے کہ بیٹی کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی، اللہ ہی صبر دے گا۔

والدعا،

عبد الماجد

(۱)

ایڈیٹر روزنامہ رہنمائے دکن، حیدرآباد (دکن)

دریاباد

یکم فروری سنہ ۱۹۶۰ء بسم اللہ

جناب من! السلام علیکم

آپ کے روزنامہ میں حال میں ایک صاحب نے لکھا ہے کہ بہن کو ہمشیرہ کہنا از روئے لغت غلط ہے۔ لیکن فارسی میں خود ایک قاعدہ آخر میں ہائے زائد بڑھا دینے کا ہے جس کی ایک مثال "ہمسایہ" اسے مؤید الفضلاء اور غیاث وغیرہ نے درج کیا ہے، اسی پر قیاس ہمشیرہ کا کیا جائے اسے اردو اہل لغت نے بے تکلف استعمال کیا ہے۔

ہمشیر۔ ہمشیرہ : بہن (لغات سعیدی ص ۱۳۱)

ہمشیرہ (ف) مؤنث : خواہر، بہن (نور اللغات ص ۹۹۸)

فرہنگِ آصفیہ کی جلد ۴ اس وقت سامنے نہیں ہے لیکن جلد اول ص ۲۴۴ پر جہاں لفظ بہن درج ہے وہاں اس کے آگے دیا ہے "ماجائی"، "ہمشیرہ" اسی طرح اس کی جلد ۲ ص ۲۱۵ میں خواہر کا ایک مترادف ہمشیرہ بھی دیا ہے۔ فارسی لغت "بہار عجم" میں ایک مستقل لفظ ہمشیرہ و ہمگوہر دیا ہے اور سند میں ایک شعر بھی لکھا ہے ص ۲۹۰

والسلام

عبد الماجد

(۱)

<u>غلام محمد (کراچی)</u>

دریاباد

۵ مارچ ۱۹۶۰ء

۸ رمضان ۱۳۷۹ھ

عزیز محترم! السلام علیکم

سید صاحبؒ پر ایک کتاب میں جو نہایت رکیک، گندہ، دلآزار حملہ ہوا ہے، مجھ سے نہ پڑھا گیا تو آپ لوگوں کے لیے قابلِ برداشت کیسے ہوگا۔

کیسے کیسے خبیث القلم اور سیاہ باطن دنیا میں پڑے ہوئے ہیں جیسے مولانا ابوالکلام کی منقصت کا تراشش لیا گیا ہے۔

انتقام کے لیے منتقمِ حقیقی کافی ہے، اور ہم کو آپ کو صبر دے۔[1]

خیریت مدت سے دریافت نہیں ہوئی تھی، ایک تقریب یہی دریافتِ خیریت کی نکل آئی۔

دعاگو و دعاخواہ:

عبدالماجد

---

[1] اس خط پر مولانا غلام محمد صاحب نے مندرجہ ذیل حاشیہ تحریر کیا ہے۔

"ہوا یہ کہ ماہر صاحب نے ایک مضمون اپنے ماہنامہ فاران میں "اب پردہ اٹھتا ہے" کے زیر عنوان لکھا تھا جس میں مولانا ابوالکلام آزاد پر کھل کھلا گرفت تھی، اس پر مولانا آزاد کے معتقدین کا برہم ہونا ظاہر تھا، کسی نے جوابی کارروائی کے طور پر ماہر صاحب کے علاوہ مستقلاً حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی اس گمان سے کہ ماہر صاحب کو مولانا آزاد کی یہ ساری تفصیلات علامہ ہی سے ملی ہوں گی، یہ کتاب ہندوستان میں چھپی تھی اس لیے میری نگاہ اس کے مطالعہ سے آلودہ نہیں ہوئی۔ باقی اس کی رکاکت اور اتہام تراشی کی شدت کا اندازہ مکتوبِ بالا سے پوری طرح ہو جاتا ہے۔"

مولانا دریابادی کے خط میں مولانا عبدالرزاق ندوی ملیح آبادی کی کتاب "ذکرِ آزاد" میں حضرت سید سلیمان ندویؒ کے تذکرے کی طرف اشارہ ہے، جاہلانہ حقیقت کی کیسی عمدہ مثال ہے۔ غلام محمد صاحب نے کتاب نہیں دیکھی اور اپنے ممدوح کی ہمنوائی میں ان سے آگے بڑھ گئے۔ فاران کے تعلق سے جو بات موصوف نے اختراع فرمائی ہے وہ حسنِ ظن کی مثال ہے، حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

(۲)

مکتوب الیہ کی سب سے چھوٹی بیٹی نفیسہ کے بعمر ۵ سال انتقال پر

دریاباد:

۱۸ اکتوبر ۱۹۶۱ء

عزیزی سلمہ اللہ تعالیٰ! السلام علیکم

الم نامہ پہنچا، ماں کو خصوصی صدمہ تو امرِ طبعی ہے، ہونا ہی چاہیے لیکن عقلاً تو انہیں پوری تسکین انشاء اللہ اس حقیقت کے استحضار سے ہو جائے گی کہ معصوم بچہ کی وفات والدین کے حق میں جنت کی بشارت ہے۔

اور یہ بشارت دینے والا دنیا کا اصدق الصادقین ہے۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)

عزیزہ تو خود ہی ماشاء اللہ صاحبِ علم و صاحبِ فہم ہوں گی۔ ہجومِ غم طبعی میں اچھے اچھوں کے نورِ بصیرت پر غبار چھا جاتا ہے، لیکن کسی کے یاد دلا دینے سے معاً وہ بادل چھٹ بھی جاتا ہے۔

معصوم بچوں کا جانا تو والدین کے حق میں ایک وثیقۂ جنت ہے اور پھر ایک اضطراری اتباعِ سنت بھی۔ اس صدمہ کے تجربے سے تو خود سید المرسلینؐ کو بھی گزرنا پڑا۔

والسلام، دعاگو و دعاخواہ

عبدالماجد

(۱)

<u>مولانا شاہ وصی اللہ (الہ آباد)</u>

مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفۂ مجاز مولانا شاہ وصی اللہ کی دو جوان بیٹیوں کے انتقال پر تعزیت نامہ

دریاباد۔ بارہ بنکی

۱۵ اپریل ۱۹۶۰ء

مولانا! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے ابتلاءِ عظیم کا حال آپ کے ایک مسترشد کے خط سے ابھی علم میں آیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ اللہ آپ کے مرتبے زیادہ سے زیادہ بلند کرے، یہ سب سامان اسی کا ہو رہا ہے۔

ایک ہی لختِ جگر کی وفات کیا کم تھی یہ جائیکہ دو کی۔ وہ بھی دو ہفتے کے اندر، اس سے بڑا اور کڑا امتحان اور کیا ہوگا؟

لیکن درحقیقت آپ قابلِ مبارکباد ہیں کہ آپ کا ظرف اتنا بلند سمجھا گیا جب ہی تو امتحان اتنا سخت لیا گیا۔
کوئی لقمان کو حکمت کیا پڑھائے گا، آپ خود ہی دوسروں کو تلقین کرتے ہیں کوئی دوسرا آپ کو تلقینِ صبر کیا کرے گا، ہاں آپ کی مثال اور آپ کا نمونہ دیکھ کر کم ہمتوں کی ہمت کسی درجہ میں بندھ جائے گی۔
اللہ آپ کو لطفِ بیکراں سے نوازے اور صاحبزادیوں کو کروٹ کروٹ جنت فردوس نصیب فرمائے۔
اور آپ سب کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ والسلام ، دعاگو و دعاخواہ :

عبدالماجد

جناب ظفرالحسن [illegible] (مئوناتھ بھنجن، اعظم گڑھ) (۱)

دریاباد
۲ ستمبر ۱۹۶۰ء
وعلیکم السلام

"شریف زادہ" شریف کی اولاد کے معنی میں بالکل صحیح ہے۔ مجازاً "شریف لڑکا" پر بھی اطلاق ہو سکتا ہے۔
(۲) "تقریب" خوشی کا موقع اور ہر جشن کو شامل ہے۔ (۳) "بلا شرط خدمت" نوکری کی پابندی کے معنی میں صحیح ہے۔ "وظیفہ" (در اصطلاح حیدرآباد) میں پنشن کے معنی لیے جا سکتے ہیں۔ "تعمیر شدہ" صحیح ہے۔ "تعمیر کردہ" بھی ترکیب اضافی میں صحیح ہو سکتا ہے، مثلاً تعمیر کردۂ فلاں۔

والسلام
عبدالماجد

ڈاکٹر رام کرشن راؤ (گورنر اتر پردیش)

دریاباد
۱۲ ستمبر ۱۹۶۰ء
بسم اللہ

والا مناقب!
غالب اگرچہ فرما گئے ہیں ؎

ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے
یار کا دروازہ پائیں گر کھلا

لیکن بزرگوں سے یہ بھی سننے میں آیا ہے ؎

بلبل ز ادب پا نہ نہد در چمن گل
تا گل بہ طلب گوشۂ لب نکشاید

میرے حقیقی بھائی پنشنر ڈپٹی کلکٹر لکھنؤ میں رہتے ہیں۔ گورنمنٹ ہاؤس کی کسی تازہ پارٹی میں باریابی ان کی بھی ہوئی تھی۔ اس ہفتہ دریاباد آئے تو محترم میزبان کے لطف و کرم کے گن گاتے ہوئے انہیں کی زبانی معلوم ہوا کہ

اس موقع پر یاد فرمائی اس گمنام گوشہ نشین کی بھی ہوئی تھی۔ آگے حدِ ادب۔
نیاز کیش :
عبدالماجد

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (لکھنؤ) (۱)

یہ خط مولانا علی میاں کے بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبدالعلی ناظم ندوۃ العلماء کے انتقال پر لکھا تھا، مرحوم پہلے ذکر مولانا دریابادی نے اپنے بڑے بھائی عبدالمجید کا کیا جن کا انتقال ۲۰ دسمبر ۱۹۲۶ء کو ہوا تھا۔ مولانا علی میاں کے بچپن ہی میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا، لہٰذا ڈاکٹر صاحب مرحوم نے ان کی پرورش کی تھی۔ آگے ذکر خط میں ڈاکٹر صاحب کے صاحبزادے کا آیا ہے ان کا نام محمد الحسنی تھا۔ "البعث الاسلامی" (عربی ماہنامہ) کے ایڈیٹر تھے، انتقال ۱۹۷۹ء میں ہو گیا۔ "خاتون منزل" کا نام اس مجموعے میں کئی جگہ آیا ہے، یہ وہ تاریخی عمارت ہے جس میں ندوۃ العلماء کا قیام عمل میں آیا تھا، مدتوں درس و تدریس کا عمل جاری رہا، بعد میں یہ عمارت مولانا دریابادی کی خانہ زاد بہن نے خرید لی تھی اور اس طرح یہ عمارت مولانا کے خاندان کا مسکن بن گئی۔ "خاتون منزل" نام اسی بعد کے زمانے کا مولانا مرحوم کا رکھا ہوا ہے۔ مولانا علی میاں سے مولانا دریابادی کے بہت قریبی تعلقات تھے اور ڈاکٹر صاحب مرحوم تو اس خاندان کے گویا فیملی ڈاکٹر تھے۔

دریاباد
۹ مئی ۱۹۶۱ء
بسم اللہ

برادرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مرگِ سوزاں کی حقیقت مجھ سے زیادہ آپ پر روشن ہے اس لیے تعزیت میں آپ سے کچھ عرض کرنا لقمان کو حکمت کا درس دینا ہے ـــــ لیکن معرفت کی جس منزل پر بھی اللہ آپ کو پہنچا دے بہرحال انسان ہی ہیں جیسا کہ میں انسان ہوں اور اپنے بھائی کے غم کا تجربہ حال میں اٹھا چکا ہوں۔
گوشت پوست کا بنا ہوا دل کیسے ممکن ہے کہ پتھر کا بن جائے اور جو صدمہ طبعی ہوتا ہے اس کی انتہائی تلخی اور چبھن محسوس نہ کرے۔
مدتوں اور برسوں نہیں، کہنا چاہیے کہ ابھی دنوں کی بات ہے کہ آپ نے میرے بڑے بھائی کی تعزیت مجھ سے کی تھی، آج بجنسہٖ اسی منزل پر آپ خود آ گئے۔

مرحوم آپ کے لیے بھائی کی سی نہیں باپ کی سی شفقت رکھتے تھے اس کا مجھے علم ہے۔ آج سب کے دلوں پر جو کچھ گزر رہی ہوگی وہ آپ ہی جانتے ہوں گے، امتحان واقعی سخت ہوتا ہے لیکن آپ تو ظرف بھی اسی قدر عالی رکھتے ہیں انشاء اللہ پوری طرح صبر ہی نہیں مقام تسلیم و رضا پر ثابت رہیں گے اور آپ خود اپنی ذات سے مرحوم کی بچیوں اور صاحبزادے کے لیے نمونہ استقامت کا کام دیں گے۔ مرحوم کا آپ سے تو خیر خون کا رشتہ تھا میرے لیے بھی بھائی سے کم نہ تھے اور اس میں شاید کچھ مبالغہ ہو کہ جس طرح آج آپ اپنے والد مرحوم کی وفات دوبارہ محسوس کر رہے ہوں گے میں بھی اپنے بھائی مرحوم کی وفات کا صدمہ از سر نو محسوس کر رہا ہوں۔

بہر حال جس کی حکمت نے یہ وقت ڈالا ہے اسی کی رحمت اسے کاٹ بھی دے گی۔ اور میں اپنی کیا کہوں ایک بہترین و شفیق ترین معالجے سے میں اکیلا نہیں، سارا "خاتون منزل" کیا بڑے کیا چھوٹے سب ہی محروم ہوگیا اور آپ کی خانگی ذمہ داریاں بھی دفعۃً کتنی بڑھ گئیں۔

جو چھوٹا تھا وہی سب سے بڑا بنا دیا گیا اور اسی کو اب خاندان کا افسر بن کر رہنا ہے۔ رہیں مرحوم کے دینی و ملی خدمات تو ع

سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے!

انشاء اللہ اسی ہفتہ کے اندر اصالۃً بھی حاضر ہو کر شرکت غم کروں گا۔

جن بچیوں کو ابھی ماں کا داغ تازہ تھا ان پر کتنی جلدی یہ دوسرا پہاڑ صدمہ و غم کا آپڑا۔

والسلام، دعاگو

عبد الماجد

(۲)

مولانا ملیح آبادی نے بعض لفظوں اور محاوروں کے بارے میں استفسار فرمایا تھا۔

دریاباد

یکم جنوری ۱۹۶۳ء

بسم اللہ

برادرم! وعلیکم السلام

۱۔ سوکھے دھانوں پانی پڑا، بالکل صحیح۔

۲۔ میرے قلم پر تو "اکتفا کیا" ہی ہے لیکن دوسروں کے ہاں "اکتفا کی" بھی پڑھا ہے، لغت میں غالباً مؤنث لکھا ہے، بہر حال صحیح دونوں ہیں۔

۳۔ مورد کی آواز کے لیے جھنکار (نون غنہ کے ساتھ) بروزن نثار آتا ہے، ہندی لفظ میں غنہ نہیں نون

کا اعلان ہے۔ ع

ندیا کنارے مورا جھنگا رے

جھنگار کے علاوہ "کوک" بھی کہہ سکتے ہیں۔

والسلام، دعاگو و دعاخواہ:

عبد الماجد

(۳)

پہلی سطر میں مکتوب الیہ کے والد مولانا عبد الحی مرحوم کی سوانح حیات میں ان کی تازہ تالیف کا ذکر ہے اور آخر میں جماعت اشراف انصاری کے ناول "لہو کے پھول" کا نام آیا ہے جو پانچ جلدوں میں ہے۔

دریاباد

۱۲ جنوری ۱۹۷۱ء

بسم اللہ

برادرم! السلام علیکم

مصنف حیات عبد الحی زندہ باد۔ خوب کیا جو کتاب چھپتے ہی بھیج دی میں نے بھی سارے کام چھوڑ کر وہی پڑھنا شروع کر دی۔ جزاک اللہ و سبحان اللہ و ماشاء اللہ

اسی وقت چند سطریں گھسیٹ بھی ڈالیں۔ اب گنجائش "صدق" میں جب بھی نکل سکے۔ عزیزوں دوستوں کی جیتی جاگتی تصویریں چلتی پھرتی نظر آگئیں گویا کتاب نہیں سامنے بائیسکوپ کھلا ہوا ہے۔

"کتاب مغفرۃ ذکر کرم" کی ایک نئی تفسیر۔

شاید کہ "لہو کے پھول" کا ذکر بھی "صدق" میں پڑھ لیا ہو۔

والسلام، دعاگو و دعاخواہ:

عبد الماجد

(۱)

محمد احسن خان (لاہور)

محمد حسن خان صاحب کے نام خطوط پر حواشی خان صاحب موصوف ہی کے قلم سے ہیں۔ آخری خط مکتوبات ماجدیہ سے ماخوذ ہے۔

۔ مارچ ۱۹۶۷ء دریاباد۔ ضلع بارہ بنکی

مکرم محترم! وعلیکم السلام

ان دونوں سے جامع تر کتاب[1] میرے علم میں نہیں۔ گو اُردو میں بھی مقاصد القرآن، تبویب القرآن وغیرہ اپنی جگہ پر اچھی ہیں ۔۔۔۔۔ ان دونوں کو ایک نظر خود دیکھ کر فیصلہ کیجیے۔ ہر شخص کا معیار، مذاق، مقصد الگ الگ ہوتا ہے۔

والسلام

عبدالماجد

(۲)

۲۹ اکتوبر ۱۹۶۱ء دریاباد۔ ضلع بارہ بنکی

مکرم گستر! وعلیکم السلام

آپ کا کارڈ، جس پر نہ لکھنؤ کا پتا درج تھا، نہ دریاباد کا، بلکہ محض میرا نام تھا، قدرتاً لاہور کے مردہ خانۂ خطوط میں گیا، خیر وہاں سے معجزانہ طور پر زندہ ہو کر میرے پاس آگیا ۔۔۔۔۔ جوابات عرض ہیں،

(۱) جی ہاں نظرثانی[2] تقریباً پوری ہو چکی ہے، مگر اب بھی برابر کوئی نہ کوئی نیا مضمون ہر روز ملتا رہتا ہے۔

(۲) و (۳) جی نہیں، ان پرانے ناشر کی طرف اب کیسے رُخ کیا جا سکتا ہے، اب کی تو ہندوستان ہی میں چھپوانے کا خیال ہے۔ دارالمصنفین کے پاس اتنا سرمایہ نہیں کہ اتنی ضخیم کتاب میں لگا سکے، بمبئی کے ایک آدھ پرانے پبلشر کی طرف خیال جا رہا ہے۔

(۴) جلد اشاعت کا تو کوئی امکان نہیں معلوم ہوتا، جب کہ مسودہ نہ اب تک پریس میں گیا، نہ کسی پبلشر سے معاملہ ہی طے ہوا ہے۔

(۵) "سیرۂ نبوی قرآنی"[3] ابھی الگ چھپنے کی نوبت ہی کہاں آئی ہے۔ مدراس میں ایک انجمن کی فرمائش پر چند لیکچر اس موضوع پر ۱۹۵۸ء میں دیے تھے، اور وہ لیکچر "صدق" میں نکل گئے تھے۔ مسودہ قانوناً اُسی انجمن کی ملک ہے، وہ لوگ آج تک اپنا وعدہ ایفا نہ کر سکے۔ افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق مرحوم بڑے مستعد و کارگزار شخص تھے، اُن کی اندوہناک موت نے اس معاملہ کو بھی کھٹائی میں ڈال دیا۔

والسلام

عبدالماجد

---

[1] (۱) المعجم لالفاظ القرآن الکریم (محمد فواد عبدالباقی)
(۲) المرشد الی آیات القرآن الکریم وکلماتہ (محمد فارس)

[2] ظاہر ہے ذکر "تفسیر ماجدی" طبع دوم کا ہے۔

[3] اب تو یہ کتاب شائع ہو چکی ہے۔

(۳)

۲۴ فروری ۱۹۶۲ء دریاباد ضلع بارہ بنکی (یو۔پی)

مکرم گستر! وعلیکم السلام

(۱) ادیب صاحب یقیناً مستند ادیب ہیں لیکن "مظلوم" نہیں، وہ فہرست[1] صرف مظلوموں کی تھی۔

(۲) ادیب صاحب میرے ہم جماعت نہیں، مجھ سے دو چار سال جونیر رہے ہوں گے۔

(۳) "آوارہ" کا نام آپ نے صحیح لکھا: سید آل عبا مارہروی۔ اُن کے مکان کا پتا ذہن میں نہیں، تلاش میں وقت لگے گا، ملک سے بواسطہ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی کافی ہو جائے گا۔ اُن کا ذاتی پتہ رجسٹروں میں تلاش کے بعد مل گیا۔ پوسٹ بکس نمبر ۵۰۰ نئی دہلی

آپ کا ایک آدھ سوال اور بھی ہے۔ تلاش اور جواب دونوں میں وقت لگے گا۔ اس لیے بالکل معافی چاہتا ہوں۔

والسلام

عبدالماجد

(۴)

مورخہ ۱۱ راکتوبر ۱۹۶۲ء دریاباد ضلع بارہ بنکی

مہربانِ بندہ! وعلیکم السلام

(۱) بے شک عام دستور تو یہی ہے کہ کھانے کی چیزوں کے لیے خور آتا ہے اور پینے کی چیزوں کیلئے "خوار" لیکن کلیہ نہیں، جیسے نمک خوار۔

(۲) اتنا عرصے کے اتنے پرانے مضمون اب کہاں یاد رہ سکتے ہیں۔

(۳) جس وقت پڑھی تھیں "بابائے اردو" اور "فرہاد صاحب" دونوں کی گرامریں پسند آئی تھیں، اب از سر نو پڑھے بغیر موازنہ و محاکمہ ممکن نہیں۔

(۴) زمانہ کے اتنے پرانے مضمون نگار اب ذہن میں کہاں۔

---

[1] ماہ اپریل ۱۹۶۲ء کے "معارف" اعظم گڑھ میں مولانا کا ایک مضمون "اردو کے مظلوم ادیب" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اس میں انہوں نے چند ادیبوں (مثلاً محمد مقتدیٰ خاں شیروانی، شاہ معین الدین ندوی، آوارہ، ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی وغیرہ) کا ذکر کیا تھا۔ یہ لوگ مولانا کے خیال میں ان معنوں میں مظلوم تھے کہ انہیں اُن کے استحقاق کے مطابق شہرت نصیب نہیں ہوئی۔ ادیب سے مراد مسعود حسن رضوی ادیب ہیں۔

(۵) زندہ زبان دانوں کی فہرست خاصی طویل ہے، دو چار نام بطور نمونہ:

(الف) اختر لکھنوی، خواجہ شفیع دہلوی لاہوری، جوش ملیح آبادی، بیخود دہلوی کراچوی، شاہد دہلوی کراچوی، سید آلِ عبا، مشہور نام "آوارہ" دہلی۔ ریڈیو

(ب) گراموفون والوں کے نام برجستہ یاد نہ آئے، بجز شوکت بیزاری کے۔ کتابیں سامنے ہوتیں جب البتہ کچھ عرض کرنا ممکن ہے۔

ایک صاحب رشید حسن خاں شاہجہانپوری تھے دہلوی اور یاد پڑتے ہیں..... (الف)، (ب) دونوں میں جگہ پا سکتے ہیں۔

والسلام

عبد الماجد

(۵)

مورخہ ۲۳ مارچ ۱۹۶۷ء — دریاباد۔ ضلع بارہ بنکی

کرم گسترا! وعلیکم السلام

(۱) آپ نے کتب فروش کا نام مصنف سے لینا چاہا۔ آپ کے شہر میں شیخ اشرف کے ہاں بہترین ذخیرہ انگریزی اسلامی کتابوں کا موجود ہے، وہاں آپ خود جا کر انتخاب کر سکتے ہیں۔

عربی کتابوں میں سیوطیؒ کی "الاتقان فی علوم القرآن" اچھی ہے، اردو ترجمہ بھی اسی نام سے نور محمد نے کراچی سے حال ہی میں شائع کیا ہے۔

(۲) "کلیدِ خزائنِ قرآن" کے نام سے جو کتاب عربی سے ترجمہ ہو کر "وطن پریس" لاہور میں عرصہ ہوا چھپی تھی، اچھی ہے۔

(۳) تبرا الفاظ "ملائے کتبی" کتا (ملا) نہیں، الفاظ میں خفیف پہلو ذم و ہجو کا ہے یعنی ملائے محض، جو ادبی نزاکتوں اور لطافتوں سے ناواقف محض خشک کتابیں رٹے ہوئے ہوں۔

(۴) ان لفظوں کے باریک فرق، مختصر خط میں ادا کرنا مشکل ہے۔ مستند ادیبوں کے بکثرت مطالعہ سے ان شاء اللہ خود ذہن میں آ جائے گا۔

(۵) "ڈھیر سارا" صحیح ہے، بے تکلف اور بلا تامل۔ "ڈھیر سارا" کے لیے بھی گنجائش نکل سکتی ہے۔

والسلام، دعاگو و دعا خواہ:

عبد الماجد

(۶)

دریاباد

۱۰ اگست ۱۹۶۷ء — بسم اللہ

مہربان بندہ! وعلیکم السلام

جوابات حاضر ہیں:

(۱) "ڈگی ہوان" میرے علم میں نہیں۔ "ڈگی ہونا" ہوتے ہیں۔

(۲) "تھیٹر" عوام کی زبان ہے بوسیدہ (ناکارہ) کے معنی ہیں۔

(۳) "حاشیہ بردار" میرے علم میں نہیں، ایک ملتا جلتا لفظ "غاشیہ بردار" ہے، یعنی رکاب تھام کر چلنے والا، تابع، غلام۔

(۴) "سخن گسترانہ" معنی لغوی کے لحاظ سے نہ کہ شخصی، ذاتی۔ مثلاً وہ سوال تو محض سخن گسترانہ زبان پر آ گیا تھا کوئی شخصی توہین مقصود نہ تھی۔

(۵) "وفیات" وفات نامہ۔ وفات کی جمع کے طور پر استعمال ہونے لگا ہے۔

(۶) "نکاس" اور "نکاسی" دونوں بجائے خود صحیح ہیں۔ پانی کے لیے نکاس ہی آئے گا۔ مال، سامانِ تجارت کے لیے نکاسی و فروخت یا برآمد۔

(۷) "تاک لگی رہنا" سنا نہیں، ممکن ہے کہیں مستعمل ہو۔

(۸) خاصۃ الورود "کو حسین ہی سمجھیے۔ ہمہ گیر مذاق علمی جو کسی مخصوص فن یا موضوع تک محدود نہیں۔

(۹) نفسِ مضمون یعنی اصل مضمون اس کے متعلقات یا ملحقات نہیں۔

آپ کے ملک میں کراچی میں اردو بورڈ کے ماتحت بڑا ضخیم و جامع مبسوط لغت مرتب ہو رہا ہے، اردو میں اب تک اس کی نظیر نہیں وہاں سے آپ سب کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔

میری مصروفیت کا آپ کو اندازہ نہیں قریب آدھ گھنٹے کا وقت اس جواب کی نذر ہو گیا۔

والسلام

عبد الماجد

جمیل اللہ انصاری (ایڈیٹر روزنامہ "قومی آواز" لکھنؤ)

(۱)

یہ خط بطور مراسلہ "قومی آواز" میں درج ہوا۔ پھر مولانا نے اسے صدقِ جدید (۹ جون ۱۹۶۲ء) میں نقل کیا، بعدہٗ مکتوباتِ ماجدی میں شامل کیا گیا۔

مکرمی!

"گنڈا" اور "غنڈہ" کی بحث اگرچہ آپ کے ہاں ختم ہو چکی ہے لیکن اگر مناسب سمجھیے تو کسی موقع سے یہ اطلاع بھی اپنے ناظرین کے سامنے لے آئیے کہ ابھی لاہور میں اردو کا ایک تازہ اور مستند لغت 'ایک لکھنوی، ایک نیم لکھنوی' اور ایک دہلوی، تین صاحبوں کا مرتب کیا ہوا اور ڈبل کالم ۲۰۸ صفحے کی ضخامت کا جدید نسیم اللغات اردو کے نام سے نکلا ہے، اس کے صفحہ ۳۰۸ پر کالم ۲ میں نہ صرف گنڈا ہی بمعنی لچا، بدمعاش، بدچلن درج ہے بلکہ "گنڈنی" کا لفظ بھی بمعنی آوارہ عورت موجود ہے۔

اس کے ساتھ "صدق" کے ایک معتبر مراسلہ نگار نے ۱۹۱۱ء کی چھپی ہوئی کسی اردو انگریزی ڈکشنری کا حوالہ لکھ کر بھیجا ہے جس میں "گنڈا" ہی درج ہے۔

والسلام

عبدالماجد

(۲)

"قومی آواز" میں بعض الفاظ کے غلط استعمال پر مولانا دریابادی نے انصاری صاحب کو توجہ دلائی تھی۔ اتر پردیش میں اردو کا جائزہ لینے کے لیے مسٹر سی۔ بی۔ گپتا وزیر اعلیٰ اتر پردیش نے اجاریہ کرپلانی کی صدارت میں جو کمیٹی تشکیل دی تھی مولانا مرحوم اس کے ممبر مقرر ہوئے تھے لیکن اس قسم کے کاموں سے طبیعت کی عدم مناسبت کی وجہ سے الگ رہتے تھے۔ اشارہ اسی طرف ہے، بعد میں کمیٹی سے مولانا مرحوم نے استعفا بھی دے دیا تھا۔

دریاباد

۱۵ اگست ۱۹۶۱ء

بسم اللہ

برادرم! السلام علیکم

"بازارِ حسن" تو خدا کے لیے اپنے کالموں سے فوراً ہٹوائیے۔ چکلہ، قحبہ خانہ، بازارِ عصمت فروشی یا بازار

سلوک بھی آپ کے ہاں برابر چل رہا ہے۔ دست درازی، بدفعلی، حرام کاری، منہ کالا کرنا، سب کو چھوڑے ہوئے ہیں۔[1] اب مجھے کمیٹی کے سامنے شہادت کے لیے نہ بلوائیے گا۔

والسلام

عبدالماجد

(۳)

قومی آواز میں انگریزی کے ان دونوں لفظوں کا ترجمہ "بدسلوکی" استعمال ہو رہا تھا۔ مولانا دریابادی نے اس سے پہلے خط میں بھی توجہ دلائی تھی، اب پھر دلایا۔

دریاباد

۲ رجون ۱۹۶۲ء

بسم اللہ

برادرم! السلام علیکم

---

[1] اسی قسم کے بعض الفاظ کے استعمال کے بارے میں مولانا دریابادی نے "صدق جدید" کے ایک شذرے میں بھی اظہار خیال کیا تھا۔ موضوع کی مناسبت کا تقاضا ہے کہ اسے یہاں نقل کر دیا جائے۔

الفاظ کا نقاب :- اردو اخباروں میں ایک نیا لفظ بعض انگریزی خبروں اور مضمونوں کے ترجمہ میں آپ پڑھ رہے ہوں گے "ہم جنسی"۔ لفظ فی نفسہٖ نیا نہیں۔ لیکن اب تک بالکل ہی دوسرے معنی میں آتا تھا۔ "ہم جنس" اور "غیر جنس" ایک دوسرے کے مقابل لفظ تھے۔ اور "اشتراکِ قسم" اور "اختلافِ قسم" کے مفہوم میں خاص و عام کی زبان پر چڑھے ہوئے تھے، اس کے سوا اور کوئی مفہوم ان کا اردو میں نہ تھا ——— اب بعض اخباری دفتریوں کے مترجموں نے لفظ کو ([illegible]) کے مترادف سمجھ لیا ہے اور اپنی اس غلط فہمی کو اخباروں میں پھیلا دیا ہے۔ اردو میں اب تک اس کے لیے الفاظ اغلام و لواطت، امرد پرستی وغیرہ رائج تھے اور بالکل صحیح تھے۔ بلکہ فرنگی ذہن و دماغ نے عرصے سے اپنا ایک طریقہ یہ بھی رکھا کہ جرائم اور بدکرداریوں کے جو لفظ اب تک چلے آ رہے تھے، ان سب کی جگہ نرم اور معصومانہ لفظ چلا دیے جائیں تاکہ لغت و ادب کی راہ سے بھی خود ان جرموں اور گناہوں کے لیے راہ ہموار ہوتی جائے اور ان کی طرف سے دلوں میں ناگواری و بیزاری کے اثرات جاتے رہیں۔ منہ کالا کرنے، حرام کاری، زنا کاری کے بجائے [illegible] (آزاد محبت) منع حمل کے بجائے "خاندانی منصوبہ بندی" اوباشی اور بدمعاشی کے بجائے محض "بداخلاقی" یہ سب مثالیں اسی نوعیت کی ہیں۔ مغرب اپنی شیطانی ذہانت سے کام لے کر برابر نئے نرم خوشنما الفاظ کا جال پھیلاتا جاتا ہے اور بھولا بھالا سادہ دل مشرق برابر اس جال میں پھنستا چلا جاتا اور جرم و معصیت میں گرفتاری کے لیے راستہ صاف کرتا جاتا ہے۔ اس خاص مفہوم کے لیے جو لفظ اب تک اردو میں چلے ہوئے تھے وہی بالکل ٹھیک تھے لیکن اگر انہیں کریہہ سمجھ کر کوئی نیا لفظ انگریزی لفظ کے مقابل رکھنا ہی ہے تو وہ "ہم جنس بازی" ہو سکتا ہے۔ اس میں لفظ ([illegible]) کے اظہار کے لیے "ہم جنسی" اس موقع کے لیے تامتر مہمل ہے۔ (۱۹ اگست ۱۹۶۱ء ص ۳)

دریاباد

۱۴ دسمبر ۱۹۶۵ء

بسم اللہ

برادرم! السلام علیکم

آمد دریاباد کی افواہی روایت کی تصدیق و تحقیق کہیں کل شام کو جا کر ہوئی!

ع ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے

میری مشرقیت اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ میں موجود اور میزبانی کسی دوسرے کے حصہ میں جائے!

ع ہم سے پردہ رہا غیروں سے ملاقات رہی

ابن مرحوم کا قریب ترین عزیز بزرگ میں ہی تھا اور مجھ ہی سے یہ بیگانہ وشی و بے التفاتی سے

شبلی کا گھر بھی خانۂ دشمن کے پاس ہے
محشر خرام اور بھی دو اک قدم سہی

بیگانہ وشی کا ریکارڈ قائم کرنا اسی کو کہتے ہیں!

ع بھول جانا ہمارا یاد رہے

والسلام

عبدالماجد

(۸)

"قوس آواز" کے ایک کالم میں ایک لکھنوی شاعر کا مذاق اڑایا گیا تھا جس نے شعری قینچی سے کبوتر کے پر کاٹے تھے۔ اس سلسلے میں مولانا نے انصاری صاحب کو یہ خط تحریر فرمایا۔

دریاباد

۲۲ جولائی ۱۹۶۶ء

بسم اللہ

کرم گسترا! السلام علیکم

"قینچی" معماروں کی اصطلاح میں لوہے کی ان آڑی سلاخوں کو کہتے ہیں جو بطور جنگلے کے کسی عمارت پر حفاظت کے لیے لگا دی جاتی ہیں۔ کھپریل کا ٹھاٹھر جس پر رکھا جاتا ہے، اسے بھی کہتے ہیں، لیکن لکھنوی شاعر نے اسے پہلے معنی میں استعمال کیا ہے اور چونکہ رعایت لفظی کا مارا ہوا ہے، قصداً اس کا ذہن لفظ قینچی سے مقراض کی طرف منتقل ہوا اور اس سے اس نے کبوتر کے پر قینچی کر دیے۔ اللہ اس غریب کو غریق رحمت کرے، بات اس نے بے پر کی نہیں اڑائی۔

عبدالماجد

مولانا شاہ معین الدین ندوی (اعظم گڑھ) (۱)

مکتوب الیہ کے والد کے انتقال پر مولانا دریابادی کا تعزیتی مکتوب۔

دریاباد

۱۸ جون ۱۹۶۰ء

بسم اللہ

برادرم! السلام علیکم

پرسوں لکھنؤ میں تھا، سانحۂ ارتحال کی خبر وہیں معلوم ہوئی، کل دوپہر کو دریاباد آیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم بیچارے نیم معذور سے تھے۔ اللہ تعالیٰ ہر طرح غریق رحمت فرمائے۔ باپ کیسے ہی ہوں اور سن کچھ بھی آ جائے بہر حال باپ ہوتے ہیں، ایسی نعمت جس کا کوئی بدل اس دنیا میں ممکن نہیں۔

والسلام

عبدالماجد

(۲)

مولانا دریابادی دار المصنفین کے ورکنگ پریسیڈنٹ تھے، جلسۂ انتظامیہ میں شرکت کے لیے اعظم گڑھ تشریف لے گئے تھے۔ چونکہ اس موقع پر بعض دیگر مہمانانِ گرامی بھی موجود تھے، اس لیے شاہ معین الدین ناظم اور سید صباح الدین عبدالرحمن ناظم مالیات مولانا پر پوری توجہ نہ دے سکے۔ بعض ایسی تکالیف بھی پہنچیں جن کا تعلق مولانا کے ان نیاز مندوں سے بالکل نہ تھا، بعض باتیں طبعاً مولانا دریابادی پسند نہ فرماتے تھے۔ ایسی کوئی بات نہ تھی کہ مولانا کے ساتھ بے التفاتی کی جاتی تھی۔

دریاباد

۵ جنوری ۱۹۶۶ء

بسم اللہ

مکرم بندہ! وعلیکم السلام

ع خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے
ع قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم

شاہ گنج اسٹیشن پر جو حکم سفر سارے میر کا ملاوہ حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھا، اسے بہر حال میں میرا بھی ذہن اپنے حق میں ظلم سمجھا، چہ جائیکہ اس وقت تو بیماری کی ایک تکلیف میں مبتلا تھا۔ اعظم گڑھ پہنچ کر عالم ہی دوسرا نظر آیا۔

ع مشتعل میں تیری اتحاد کے کاشانوں پر

ردولی کی ضرب المثل مہمان نوازی اور اس سے بھی کہیں بڑھ کر دیسنہ کی میزبانی کا گوشۂ چشم دوسروں کے

لیے وقت اچانک مولانا یک طرف مسکین گدایان یک طرف۔ فجر کی چائے جب اشراق تک منزل تو دست قبض شدید پیدا ہو گیا جس کی تکلیف کئی دن تک رہی۔

واپسی میں جب اسٹیشن گیا تو ٹکٹ تو سید صاحب کہاں ملتا، گونڈا آکر بکا۔ پلیٹ فارم کے زمین دوز پٹری پر رہ گئی، اب سطح زمین سے اچک کر سوار ہونے کی اور کیا صورت تھی، آدمی نے جو ساتھ تھا، کے اندر سے دستگیری کی اور مولوی نعیم نے پیچھے سے سہارا دیا جب جا کر مشکل آسان ہوئی۔

خیر جو کچھ ہوا تقدیر تھا ہو کر رہا، اس شکوہ کے "جواب شکوہ" کی ہرگز ضرورت نہیں، نہ گرم نہ نرم! درخواست صرف آئندہ کے بارے میں ہے۔

سید صاحب کے زمانے میں مہمان خانے کا کمرہ خصوصی میرے لیے مخصوص رہتا تھا اب اس کی بحالی پھر کر دی جائے سوا اس کے کہ ڈاکٹر محمود صاحب آجائیں۔

ملازم ان شاء اللہ ساتھ لایا کروں گا اور راتہ ہی تقریباً [illegible] بس۔ چائے رات میں بند کر کے اس میں رکھ لیا کروں گا۔

ایسے اجتماع عام کے وقت پر حاضری سے بالکل ہی معافی چاہتا ہوں۔

لیجیے ایک معاملہ ذکر کرنے سے رہ ہی گیا، آپ تو رخصت ہو چکے تھے، میری روانگی سے کوئی پون گھنٹہ قبل مدرسہ بلیریا گنج کے کوئی پچاس طلبہ کا گروہ ایک مدرس کی قیادت میں حملہ آور ہوا، فرداً فرداً دست بوسی، متعدد کاپیوں پر دستخط، تقریر پر اصرار وغیرہ، غرض ہر وہ فرمائش جو ہجوم اپنے لیڈروں سے کرتا رہتا ہے۔ ع   دیے دماغ نے امتحان کیسے کیسے

والسلام

عبدالماجد

<u>ڈاکٹر خورشید احمد (کراچی)</u>

(۱)

خورشید صاحب کے نام مولانا دریابادی کے تین خط ہیں۔ پہلا خط دوران سفر میں دہلی میں، ان کی والدہ کے اچانک انتقال پر ہے، اس زمانے میں وہ "چراغ راہ" کے ایڈیٹر تھے، ساتھ ہی "مشعل راہ" ان کی بھی ایڈٹ کرتے تھے، تیسرا خط بھی "چراغ راہ" پانے کی رسید ہے۔

دریاباد

۲۲ جولائی سنہ ۱۹۶۱ء   بسم اللہ

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ دنیا کی نعمتوں میں شاید سب سے بڑی نعمت ماں ہی ہے اس کی مفارقت اور پھر بالکل اچانک مفارقت پر صبر کر جانا بڑی ہمت اور ظرف والوں کا کام ہے۔ لیکن اجر و انعام بھی تو اسی حساب سے و مناسبت سے ہے، بے حساب و بے نہایت۔

آپ ماشاء اللہ دیندار ہیں اور دین کی قدر تو ایسے ہی موقعوں پر ہوتی ہے، جذبات کی دنیا جتنی بھی تہ و بالا ہو جائے پھر بھی عقل سلیم کا ایک سہارا اپنی جگہ پر یقیناً قائم ہے کہ جس نے یہ وقتی صدمہ دیا ہے وہ ماں سے بھی کہیں بڑھ کر شفیق و مہربان ہے، ماں کی شفقت تو محض اس کی رحمت و شفقت کا پرتو تھی! خدا معلوم یہ کھو کر کیا کچھ ملے گا! اس ایک انسانی اور وقتی زخم کے بہانے کیسی نعمتوں اور نوازشوں کی بارش ہوگی۔

اور پھر مسافر کی موت مغفوریت کی خود ایک روشن علامت۔ بچے کا دہ، تحمل مستوفہ کر لیجیے کہ وطن سے پردیس تک مسلسل رحمتوں کا نزول کر دیا جاتا ہے۔

مفارقت کے دن! ہم سب آپ ہی کیسی تیزی سے اسی ایک ہی منزل کی طرف رواں دواں ہیں! بس دعاؤں میں لگے رہیے، صبر رفتہ رفتہ آ جائے گا۔   والسلام، دعاگو: عبدالماجد

(۲)

دریاباد

۲۷ اگست سنہ ۱۹۶۱ء   بسم اللہ

برادرم سلمہ تعالیٰ! وعلیکم السلام

"چراغ" کا بدل آپ کو "مشعل" خوب ہاتھ آگیا۔ بدل کیوں "نعم البدل" کہیے اور آپ تو خود بھی

مطلع انوار خورشید   ع   ایں خانہ تمام آفتاب است

مشعل کی روشنی تو ابھی یہاں تک پہنچی نہیں صرف آپ کے خط سے اطلاع پا کر یہ ایک لفظی پھلجھڑی تیار ہو گئی۔

والسلام، دعاگو:

عبدالماجد

(۳)

دریاباد

۵ جولائی سنہ ۱۹۶۵ء   بسم اللہ

برادرم! وعلیکم السلام

"چراغ راہ" کی روشنی آج پہلی بار اس "ظلمت کدہ" تک پہنچی بواسطہ "خورشید"

والسلام، دعاگو و دعا:

عبدالماجد

شان الحق حقی (کراچی)

(۱)

حقی صاحب کے نام مولانا دریابادی کے تمام خطوط اُس وقت کے ہیں جب حقی صاحب ترقی اردو بورڈ (کراچی) کے سکریٹری اور ماہنامہ اردو نامہ کے ایڈیٹر تھے۔ تمام خطوط میں لغات، تحقیق الفاظ اور لسانیات کے مختلف مسائل زیر بحث آتے ہیں، کہیں تائید ہے، کہیں تردید، کہیں وضاحت ہے اور کہیں ترجیح۔ تمام خطوط اردو نامہ میں چھپتے رہے تھے۔ جس خط پر تاریخ درج نہ پائی وہاں رسالے کی اشاعت کا حوالہ بڑھا دیا ہے، تاکہ تحریر خط کی صحیح تاریخ سمجھنے کا تقریباً اندازہ ہو جائے۔

درج ذیل خط اردو نامہ بابت اکتوبر ۱۹۶۱ء سے ماخوذ ہے جس تحریر میں ذکر محمد ہادی کے تخلص "مرزا" اور لقب "رسوا" کا آیا ہے۔

مکرم بندہ السلام علیکم

"اردو نامہ" نمبر ۴ پیش نظر ہے۔ صفحہ ۶ پر اور اس کے بعد بھی جہاں جہاں حوالہ "گل رعنا" کا ہے، اس کے مصنف کو مولانا عبدالحی فرنگی محلی کر کے لکھا ہے۔ حالانکہ یہ بالکل دوسرے شخص تھے۔ ان کا سال وفات ۱۸۸۲ء ہے۔ بڑے پایہ کے عالم دین تھے۔ اردو شاعری و تذکرہ نویسی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ گل رعنا کے مصنف مولوی حکیم سید عبدالحی رائے بریلوی ثم لکھنوی تھے۔ لکھنؤ میں مطب کرتے تھے، ندوہ کے نائب ناظم ہو گئے تھے۔ سال وفات غالباً ۱۹۲۳ء ہے۔ اُن کے اِن کے زمانے میں کہنا چاہیے کہ نصف صدی کا فاصلہ حائل ہے۔

والسلام

دریاباد ضلع بارہ بنکی — عبدالماجد

مکرر:

نمبر ۵ بھی نظر سے گزرا۔ ص ۶۹۔ مرزا صاحب کا تخلص آخر وقت تک مرزا ہی رہا۔ شاعری کو مرزا صاحب ہنر سمجھتے تھے اور ناول نگاری کو عیب۔ اس عیب سے اپنے کو چھپانے کے لیے نقاب رسوا کا ایجاد کر لیا تھا۔ جب مالی ضرورت کے دباؤ سے ناول لکھ کر (صحیح یہ ہے کہ گھسیٹ کر) کبھی آدھے پونے کسی ناشر کے حوالے کرتے تو اپنی ثقہ شخصیت کو بچانے کے لیے رسوا کے نام سے۔

(۲)

سبزواری صاحب سے مراد مشہور محقق اور ماہر لسانیات ڈاکٹر شوکت سبزواری ہیں

دریاباد
۱۹ مارچ ۱۹۶۳ء

صاحب من! السلام علیکم

نمبر ۲ پہنچا۔ اب تو ہر پرچہ پڑھنے کے قابل ہونے لگا ہے۔ یہ نمبر بھی خوب ہے۔ کیفیت و کمیت کے اعتبار سے۔

"جیسا" کی بحث تو آپ ختم ہی کر چکے، لیکن اتنا عرض کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ میرے بچپن تک فصحا عموماً اس موقع پر "سا" یا "سی" ہی لاتے تھے۔ اور اس حد تک جوش صاحب کا خیال صحیح ہے۔ پھر بھی یہ نہ تھا کہ "جیسا" کا استعمال سرے سے معدوم ہو۔ آخر سبزواری صاحب نے اس دور سے بھی سندیں ڈھونڈھ نکالی ہیں۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے دوسرے درجے کے ادیبوں (خصوصاً اخبار نویسوں) نے "جیسا" اور "جیسی" کی بھرمار کر دی۔ اور اس لیے صف اول کے بھی بعض ادیبوں کو متاثر ہونا ہی پڑا۔

اجازت ہو تو اپنے استفادے کے لیے دو سوال بھی عرض کر دوں۔

۱۔ صفحہ ۶۲، کالم ۲، وسط کے بعد "خامہ فرسائی" کیا اپنے صحیح محل پر استعمال ہوا ہے؟ میں سمجھتا تھا کہ اس میں ذم و تحقیر کا پہلو شامل رہتا ہے۔

۲۔ صفحہ ۲۷ الخ۔ لفظ "املا" کیا مونث ہے؟

والسلام

عبدالماجد دریابادی

اس خط پر نمبر ۱ کے سلسلے میں مکتوب الیہ نے تحریر فرمایا "آپ نے بجا فرمایا" نمبر ۲ کے سلسلے میں انھوں نے لکھا کہ "اس میں اختلاف ہے" (اردو نامہ کراچی۔ اپریل ۱۹۶۲ء)

(۳)

دریاباد
۴ مئی ۱۹۶۳ء

کرم گستر! السلام علیکم

تازہ "اردو نامہ" حسب معمول سب سے زیادہ دلچسپی اور شوق سے نمونۂ لغت پڑھا۔ نظر کی وسعت و عمق دونوں کا کیا کہنا۔ البتہ یہ کھٹک کئی بار محسوس ہوئی کہ معانی کی تعداد میں

خواہ مخواہ کتنے تکلف سے کام لیا گیا ہے۔ مثلاً اس قسط میں اپاہج کے چھ معنی الگ الگ دیے گئے ہیں اور عمداً تکرار کو کام میں لیا گیا ہے۔ یہ چھ کل کے اندر بخوبی سمٹ کر آسکتے تھے: حشو، نظم کی طرح نثر میں بھی تو بچنے کی چیز ہے۔

لفظ اپ ٹو ڈیٹ اردو میں بطور طنز کے بھی تو آتا ہے۔ جنٹلمین کی طرح اور اپ ٹو ڈیٹ طلب پوری طرح اردو بن چکا گیا اس طرح کی کوئی عبارت بڑھا دینا مناسب ہوگا۔

طنزیہ موقع پر جنٹلمین طنز کے مترادف ہے۔ اس فقرے میں سوٹ بوٹ سے لیس پورے جنٹلمین ہر طرح اپ ٹو ڈیٹ۔

اور اسی طنزیہ مفہوم میں ہر جگہ تو نہیں لیکن کہیں کہیں چھیلا سے بھی اس کا ربط بہت قریب کا ہو جائے گا جیسے اس فقرے میں "وہ گبھرو جوان چھیلا بنا ہوا، انداز دل ربائی میں ہر طرح اپ ٹو ڈیٹ"

افسانے پڑھنے کی اب کہاں فرصت۔

والسلام

عبدالماجد

(۴)

کرم گستر! السلام علیکم

اب کے فتتاحیہ تو آپ نے بڑے بانکپن سے لکھا۔ دلچسپ بھی اور نمازیانہ و مجاہدانہ بھی۔ ماشاءاللہ ...... ہمارے سید مسعود حسن صاحب کا مکتوب بھی خوب رہا۔ باموقع بھی، ضروری بھی۔ ہماری آپ کی قوم کا بھی عجیب حال ہے۔ عقیدت ہوئی تو نوبت پرستش کی پہنچا دی۔ ابھی تو بس بدتمیزی پر اتر آئی۔ آزاد مظلوم کی تحقیق میں اگر کچھ غلطیاں رہ گئیں تو غلطیوں سے محفوظ آج تک کون رہا ہے۔ کس محقق کی تحقیق کو حرف آخر کا درجہ دیا جا سکتا ہے؟ لغزشوں کی نشان دہی ضرور کیجیے لیکن اپنے فرق مراتب کا لحاظ کر کے اور شائستگی زبان و متانت بیان کے ساتھ۔۔۔ ادب میں بے ادبی کیسی؟

حصہ لغت ہمیشہ بڑی دلچسپی سے پڑھتا ہوں چنانچہ اب کے بھی۔ آپ آخر میں حوالہ جو دیتے ہیں اس میں پہلے نام تصنیف کا دیتے ہیں اور پھر مصنف کا۔ لیکن کہیں اس کے برعکس بھی ہو گیا ہے۔ مثلاً صفحہ ۱۵۹، کالم ۲، وسط، جہاں "رسوا" پہلے آ گیا اور "خورشید" بعد کو۔ اس بے ترتیبی کی کچھ مزید مثالیں صفحہ ۱۶۱ کالم ۲، کے وسط میں نظر پڑیں۔ صفحہ ۱۶۱، کالم ۱، وسط میں ایک حوالہ "سائنس و فلسفہ" کا دیکھا، خیال نہ آیا کس کی کتاب ہے۔ مگر اس کو حتماً، فدا طبیعت کو کھٹکا۔

رسوا کے نام پر یاد آیا کہ وہ خورشید بہو، نام کی کوئی کتاب ان کی زندگی میں تو منظر عام پر نہ آئی تھی، بعد کو خدا معلوم کن لوگوں نے اسے ان کی جانب منسوب کر دیا۔

دریاباد عبدالماجد دریابادی

اس خط پر شان الحق حقی صاحب نے یہ "توضیح" درج فرمائی:

حوالے کے اندراج کی بابت ممکن ہے بعض اور اصحاب کو بھی یہی بات کھٹکی ہو، لہٰذا مکرر وضاحت کی جاتی ہے کہ اگر سنہ تصنیف دریافت ہو تو کتاب کا نام پہلے دیا جاتا ہے، ورنہ مصنف کا نام مقدم ہوتا ہے اور تصنیف کا مؤخر۔ داہنی طرف جو سنہ درج ہوتا ہے وہ پہلی صورت میں سال تصنیف شمار ہوگا، اور دوسری صورت میں مصنف کا سال وفات مثلاً۔

۱۸۵۱ء (وفات) ۔ مومن، کلیات

(مصنف کا نام مقدم ہے)

۱۸۷۸ء (سال طباعت) ۔ گلزار داغ

(تصنیف کا نام مقدم ہے)

۱۸۰۱ء (سال تصنیف) ۔ آرائش محفل، حیدری

(تصنیف کا نام مقدم ہے)

چونکہ ذی حیات مصنفین کی تصانیف کا سنہ طباعت یا سنہ تصنیف عام طور پر معلوم ہوتا ہے، اس لیے تصنیف کا نام پہلے نظر آئے گا اور مصنف کا (اگر ضروری ہوا) تو بعد میں مثلاً:

۱۹۴۴ء ۔ مضامین، عبدالماجد دریابادی

(ماخوذ از اردو نامہ، کراچی۔ اپریل ۱۹۶۳ء)

(۵)

(ماخوذ از اردو نامہ، کراچی۔ جولائی ۱۹۶۴ء)

کرم گستر! السلام علیکم

"اردو نامہ" نمبر ۱۶ سولہ منٹ ہوتے موصول ہوا۔ میری بدخطی ہر جگہ رنگ لاتی ہے اپنی تحریر جب کہیں چھپی ہوئی دیکھتا ہوں غلطیوں پر بس سر پیٹ کر رہ جاتا ہوں اور یہی صورت

اب کی بھی میرے چھپے ہوتے عریضے میں پیش آئی۔ مرض لاعلاج ہے اور صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

مولوی اسمٰعیل میرٹھی مرحوم کی گلشن اردو آپ نے خوب چھاپ دی۔ جزاک اللہ بیچارے اب گمنام سے ہوگئے ہیں۔ اُردو کے تاریخ نویسوں نے بھی ان پر بڑا ظلم کیا ہے ان کا شمار تو اردو کے خصوصی محسنوں میں ہوتا تھا۔ تصویر پر بھی کیا نورانیت، کیا معصومیت برستی ہے تصویر کے جواز و عدم کی بحث الگ ہے لیکن بہرحال اگر چھپتی ہے تو بس ایسے ہی نورانیوں کی چھپے!

'مکتوب غالب' اور 'کلام آزردہ' یہ دونوں بھی قابل قدر ٹکڑے ہیں۔ لغت کی قسط حسب معمول اب کی بھی خوب تھی۔

صفحہ ۸۶ (حاشیہ) میاں سرسید کے جی "قریبی عزیز" سید احمد مرحوم کا ذکر ہے وہ سرسید کے حقیقی بھتیجے تھے۔ مجھے ان کے بیرسٹر ہونے اور لکھنؤ میں پریکٹس کرنے کا علم نہیں۔ سب ججی کے عہدے سے ریٹائر ہوکر سیتاپور ہی میں رہ پڑے تھے۔ لکھنؤ میں بیرسٹری ان کے چچازاد بھائی سید محمود (فرزند سرسید) نے البتہ کی تھی۔

اب ایک بات اور سن لیجیے۔ لغت کے حصے کو رسالہ سے الگ مستقل کتابی صورت میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس کی کوئی صورت بلا دقت و زحمت ممکن ہے؟ والسلام

(صدق جدید) - دریاباد عبدالماجد

(۶)

یہ خط مکتوبات ماجدی سے ماخوذ ہے لیکن اس کا مضمون، بعد والے خط کے آخری پیراگراف کے طور پر بھی شامل ہے۔ شاید ادارہ "اردونامہ" نے دو خطوں کے مضمون کو ملاکر ایک کردیا ہو۔

دریاباد

۱۹ر نومبر ۱۹۶۴ء بسم اللہ

عزیز مکرم! السلام علیکم

آپ کے ہاں "املا" کو برابر مونث لکھا جارہا ہے۔ یہ تانیث ذرا کھٹک رہی ہے حصۂ لغت میں "اترانا" کی تحقیق آپ نے خوب ہی تفصیل سے درج کی ہے مگر "اتر آنے"

(ایک استعمال مجھے نظر نہ پڑا مثلاً اس فقرے میں کہ "آپ تو ذاتیات پر اتر آئے" "اترنا" عوامی زبان میں ایک فحش معنی میں بھی آتا ہے "چڑھنے" ہی کی طرح۔ والسلام

دعاگو و دعاخواہ!

عبدالماجد

(۷)

(ماخوذ از اردونامہ، کراچی۔ جنوری ۱۹۶۵ء)

عزیز مکرم! السلام علیکم

مولوی احتشام الدین حقی مرحوم سے میری ملاقات دفتر ہمدرد میں ہوئی تھی جب وہ اس کے سینیر اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے، ماہ اواخر ۱۴ء میں۔ بلکہ صورت آشنائی تو اس سے بھی کئی سال پیشتر ہوچکی تھی۔ ۱۹۱۳ء میں جب میں علی گڑھ میں ایم۔ اے کا طالب علم تھا وہ مرحوم لٹن لائبریری کے نئے نئے اسسٹنٹ لائبریرین ہوئے تھے۔ خیر پھر ایک مدت کے بعد ان کی لغت کا مسودہ دفتر انجمن ترقی اردو میں دیکھا اور اسے دیکھ کر عش عش کر اٹھا۔ خیال میں بھی نہ تھا کہ کوئی فرد واحد محض اپنی دیدہ ریزی کے زور سے اس درجہ ثبوت تحقیق و جامعیت کے دے سکتا ہے۔

تازہ اردو نامے میں شیکسپیئر کے اردو تراجم پر مضمون اچھا ہے اور خوب مفصل صفحہ ۲۷ کالم (۱) میں یہ بات شاید لکھنے سے رہ گئی کہ جوالا پرشاد برق نے ہی رومیو جولیٹ کو بالکل مسلمان اور نوابی دور کے لکھنوی مسلمان کرکے پیش کیا ہے۔ غفورالدولہ، ظہورالدولہ الماس وغیرہ بول چال میں ٹھیٹھ لکھنوی۔

صفحہ ۳۱ کالم ۲ ذکر تراجم ہیملٹ، میری نظر سے اپنے بچپن میں جو ترجمہ جہانگیر کے نام سے گزرا ہے وہ منشی امتیاز علی بی۔ اے فیض آبادی ایڈوکیٹ کا کیا ہوا تھا، اور اس وقت اس کی زبان بھی بہت پسند آئی تھی۔ بعد کو مرزا عسکری لکھنوی سے اس زبان کی ہجو بھی سنی اور خود پھر پڑھنے کا اتفاق نہ ہوا۔ آپ کے ہاں "امراؤ علی" کہیں چھاپے کی غلطی تو نہیں۔

آپ کے ہاں "املا" کو برابر مونث لکھا جارہا ہے۔ یہ تانیث ذرا کھٹک رہی ہے۔ حصۂ لغت میں "اترانا" کی تحقیق آپ نے خوب ہی تفصیل سے درج کی ہے مگر "اتر آنے" کا ایک استعمال مجھے نظر نہ پڑا مثلاً اس فقرے میں کہ "آپ تو ذاتیات پر اتر آئے" "اترنا"

عوامی زبان میں ایک خاص معنی میں بھی آتا ہے، "چڑھنے" کی طرح۔ والسلام

دریاباد عبدالماجد

(۸)

(ماخوذ از اردو نامہ کراچی۔ جولائی ۱۹۶۵ء)

کرم گستر! السلام علیکم

تازہ نمبر میں آپ نے خوب کیا جو اپنے زمانے کی ایک مشہور نظم "جان بیٹا خلافت پہ دے دو" شائع کر کے محفوظ کر دی۔ یہ نظم ۱۹۲۲ء میں ایک جیبی چو ورقے پر "صدائے خاتون" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی اور دو پیسے کی بکتی تھی۔ بازار میں مدت سے نایاب ہے۔ میرے پاس موجود تھی، اب جو ڈھونڈھا تو نہ ملی۔ ہو نہ ہو دیمک کی نذر ہو گئی۔

میری کتاب "محمد علی کی ذاتی ڈائری" جلد اول ۱۹۲۵ء میں نظم کا ذکر مع چند شعر کے موجود ہے۔ آپ کے ہاں چھپی ہوئی نظم میں دو ایک غلطیاں محسوس ہوئیں۔ مثلاً صفحہ ۲ داہنے کالم کے آخری شعر کا پہلا مصرع یہ یاد پڑتا ہے۔

کالے پانی خوشی ہو کے جا!

اسی طرح بائیں کالم کے آخری شعر کے دونوں مصرعوں میں بجائے "تجھ" کے "تم" تھا۔

اہم ترین غلطی، نظم کے سب سے آخری شعر میں۔ صحیح مصرع یوں تھا۔

چین یاسین ہم نے نہ پایا

یاسین تخلص گمنام شاعر کا تھا۔

افسوس ہے کہ اس وقت کچھ خیال نہ آیا اور دس بارہ سال ہوتے خیال آیا تو شاعر کا پتا بہت کچھ چلانا چاہا کہ کون تھے، کیا تھے، کچھ پتا ہی نہ چل پایا۔ انہیں کی ایک دوسری نظم بھی اس وقت خوب چلی ہوئی تھی، یہی بحر، یہی موضوع۔ پہلا شعر تھا:

کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی
ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

علی برادران کا جو مقدمہ کراچی میں ہوا، اس ننھے منے چو ورقے کا عنوان تھا:
"ندائے مظلوم"

دریاباد، ضلع بارہ بنکی۔ عبدالماجد

(۹)

مولانا دریابادی نے اپنے خط میں "اجازہ" اور "اجارہ" دو لفظوں کے بارے میں لکھا تھا لیکن اردو نامہ (شمارہ ۲۳) میں خط چھپا تو "اجازہ" بھی "اجارہ" ہی بن گیا۔ اس سے شدید الجھن پیدا ہوئی۔ ۳۰ جون ۱۹۶۶ء کے خط میں مولانا نے اس پر توجہ دلائی ہے۔

دریاباد

۲۷ مارچ ۱۹۶۶ء بسم اللہ

کرم گستر! السلام علیکم

مدت دراز کے بعد بحمداللہ "اردو نامہ" پھر دیکھنے کو ملا۔ ۲۱ و ۲۲ ایک ساتھ ملے۔ پیاسے کو پانی نصیب ہوا۔

شوکت سبزواری صاحب "اشتقاقیات" پر جب اور جو کچھ لکھتے ہیں اچھا ہی لکھتے ہیں۔

ممتاز حسن کا مضمون مرتضیٰ حسین ادیب پر بھی اچھا ہے۔

بانگرو بولی پر ایک دہلوی خاتون نے خوب لکھ دیا۔ ایک چھوٹا سا لغت اس نمونے پر اودھ کی بھی دیہاتی بولی کا تیار کیا جا سکتا ہے اور اس کے لیے خود جوش صاحب بالکل کافی ہیں۔

صحت الفاظ کے معیار پر جن صاحب نے قلم اٹھایا ہے، وہ قابل مبارکباد ہیں۔ معیار صحت ظاہر ہے کہ صرف اہل زبان کا استعمال و تصرف ہے، انگریزی اصطلاح میں USAGE۔ قاموس الاغلاط [illegible] اللہ اس کے مرحوم مصنف کو غریق رحمت فرمائے، بجائے خود مجموعہ اغلاط ہے۔ لیکن ملا نے کسی کو ادھر توجہ فرمانے کی ضرورت کیا تھی۔ خواہ مخواہ اردو بول چال کے سیکڑوں الفاظ کو عربی قواعد کی چھری سے ذبح کر ڈالا ہے۔

حصۂ لغت کو حسب معمول بڑے شوق سے پڑھا اور مستفید ہوا۔ صرف دو لفظوں سے متعلق ہلکی سی کھٹک رہی۔ اجازہ کے تحت میں اگر بعض علوم کا "اجازت نامہ" بھی بڑھا دیا جاتے تو کیسا ہے؟ مثلاً فن طب میں اجازہ مسیح الملک سے حاصل کیا۔ فن حدیث میں اجازہ علمائے حرمین سے جا کر لائے۔ جلیل کا ایک مصرع ہے:

دین اللہ کی ہے اس میں اجارہ کیا ہے

اس "اجارہ" کو آپ واضح طور پر کس معنی کے تحت میں لائیں گے۔ والسلام

دعا گو، عبدالماجد

(۱۰)

کرم گسترا   السلام علیکم

تیئیسواں نمبر لا "بنیادی اردو" پر تبصرہ بہت ہی اچھا ہے۔ اصل کتاب کے مطالعہ سے اس نے مستغنی کر دیا۔ حصۂ لغت سے بھی مستفید ہوا۔ دو باتیں عرض کرنے کی ہیں :

صفحہ ۲۱۱ آخری سطر: جو حوالہ دیا گیا ہے وہ کہاں تک بامحل ہے۔ یعنی کیا مصنف خود بھی اس لفظ کا مفہوم صحیح سمجھتا ہے؟ عبارت سے تو ایسا نہیں معلوم ہوتا۔ سند میں تو ہمیشہ ایسی عبارت ہونا چاہیے جو لفظ کا صحیح مفہوم ظاہر کر رہی ہو۔

صفحہ ۲۳۲ کالم ۱، وسط: "اُجڑایا" شبہ اس میں ہے کہ یہ لفظ کہیں مستقلاً بھی آیا ہے یا محض بطور تابع مہمل جیسا کہ مصرعِ منقولہ میں ہے مستقل کی مثال تو اس قسم کا جملہ ہو گا "میں نے وہ گھر اُجڑایا" (اُجاڑ دیا نہیں)۔ سند ایسی ہونا چاہیے جو اپنی دلالت میں قطعی ہو، مبہم یا مشتبہ نہ ہو۔

دریا باد   عبدالماجد

۱۲/ اپریل ۱۹۶۶ء

مولانا دریا بادی کے دونوں معروضات پر ایڈیٹر اردو نامہ جناب شان الحق حقی نے یہ نوٹ تحریر کیا :

۱۔ صفحہ ۲۲۱، یہ سند حالی کی ہے "ایک شخص کا سپاہی اور عالم ہونا گویا اجتماعِ ضدین سمجھا جاتا ہے"۔ یہاں لفظ "گویا" قابل لحاظ ہے۔

۲۔ صفحہ ۲۳۲، "اُجڑایا" سے پہلے جو ڈیش ہے وہ اجڑا کا قائم مقام اور اس بات کی علامت ہے کہ یہ لفظ اُجڑا کے تابعات میں ہے، اسے "اُجڑا اجڑایا" پڑھا جاتا ہے۔ قارئین اس بات کو ہر جگہ ملحوظ خاطر رکھیں۔

(ماخوذ از اردو نامہ کراچی۔ ستمبر ۱۹۶۶ء)

(۱۱)

دریا باد

۳۰/ جون ۱۹۶۶ء

کرم فرما   السلام علیکم

آپ کا نمبر ۲۲ پہنچا۔ اپنا مراسلہ اس میں پڑھ کر سر پیٹ لیا۔ "اجازہ" میں 'ز' کے نقطے کو اُڑا کر اسے "اجارہ" بنا دینا آپ کے کاتب کا کمالِ فن ہے۔ کیا انھوں نے مجھ

[بے] نقطہ سنانے کی ٹھان لی ہے۔ میں نے "اجازہ" اور "اجارہ" دونوں لفظوں [پر] الگ الگ عرض خیال کیا تھا۔ انہوں نے دونوں کو ملا کر دونوں لفظ ایک کر دیے۔ پڑھنے [والوں] نے میرے متعلق کیا رائے قائم کی ہوگی۔ اپنی بدخطی کا میں خود بہت زیادہ قائل ہوں، لیکن اس سے اس درجہ رسوائی کم ہی میرے نصیب میں آئی ہوگی۔

صفحہ ۲۵ کالم ا کے آخر اور کالم ۲ کی پہلی سطر میں "اجازہ" (ز سے منقوطہ کے ساتھ) [ج]یسے بمعنی اجازت نامہ۔ اس کے بعد کالم ۲ کی سطر ۳ و ۴ میں "اجارہ" ہے دیکھیے یہ تصحیح [ا]ب کس صورت میں چھپ کر سامنے آتی ہے۔

اب کی قسط لغت میں بعض لفظ بہت نامانوس سے نظر آتے مثلاً اجنوں، اجومن، [...]ت (۱) اجمنوں، اجھوں، اُج۔ کیوں نہ ان سب کے آگے "متروک" بڑھا دیا جائے کہ [...]ز ان کے آگے آپ نے خود بڑھا دیا ہے۔

اس نمبر میں ہاشمی فرید آبادی مرحوم کے خطوط خوب ہیں۔ پُرلطف بھی اور پُرمعلومات [بھ]ی۔ اور جوش صاحب کے مضمون کا تو کہنا ہی کیا۔ "برات" انھوں نے خوب ہی سجا کر نکالی [ہے]۔ اس کا سہرا انھیں کے سر ہے اور وہی اس برات کے نوشہ۔

عطیہ خلیل عرب کے مراسلے کے سلسلے میں ایک شعر اور یاد پڑ گیا ہے۔ اسی مشہور [غز]ل کا مطلع ہے۔

از مذہب من گبر و مسلماں گلہ دارد   وز پنجۂ من چاک گریباں گلہ دارد

یہ اس لیے لکھ دیا کہ شاید شاعر کے نام کی تلاش میں اس سے کچھ اور مدد مل جائے۔

والسلام

دعاگو عبدالماجد

اس خط پر جناب حقی صاحب نے مندرجِ ذیل نوٹ تحریر فرمایا۔ اس میں معذرت بھی ہے اور وضاحت بھی :

اردو نامہ کراچی :

"غلطی کا نہایت افسوس ہے، لیکن اس سے غلط فہمی شاید ہی کسی کو پیدا ہوئی ہو، پھر آپ کے بات ہیں! "عاقلاں پیروِ نقطہ شوند"، ہماری قدیم تحریروں میں تو نقطے کی کم ہی پروا کی جاتی تھی بلکہ سطروں کی سطریں "بے نقطہ" ہوتی تھیں۔ بہرحال

ہم اس کا آئندہ بہت خیال رکھیں گے۔ اسی شمارے میں شمس الاسلام صاحب کے خط میں خجستہ سالی کی جگہ خستہ سالی اور حسرت کی جگہ حیرت چھپ گیا ہے جس کے لیے ہم نہایت شرمندہ ہیں۔

تشریح میں "اجازہ" کے تحت لکھا تھا کہ "اجازت (یعنی اجازت کی طرف رجوع کریں) وہاں وہ معنی بھی درج ہیں جن کی طرف آپ نے توجہ دلائی ہے۔

لفظ "متروک" کا اضافہ اس صورت میں کہ صرف قدیم مثالیں دی گئی ہوں، مناسب ہوتا ہے۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کب سے متروک؟ اس قسم کی صراحت متداول لغتوں میں تو ٹھیک ہے مگر ایسی لغت میں جو زبان کے سارے ادوار پر حاوی ہو قابل ترک ہے۔ نہ معلوم آگے اور کون سے لفظ متروک ہو جائیں۔ پھر کوئی لفظ ایک دم متروک نہیں ہوتا، بعض لوگ عرصے تک بولتے رہتے ہیں۔

(ماخوذ از اردو نامہ، کراچی۔ ستمبر ۱۹۶۶ء)

<u>ضیاء علی خاں (بدایوں)</u>

(۱)

دریاباد

۱۳۔ جنوری ۱۹۶۲ء

بسم اللہ

کرم گستر! وعلیکم السلام

(۱) "ستائش" عوام میں چل گیا ہے۔ فصحا اب تک احتیاط کرتے ہیں (۲) "جانے پہچانے" فصحا کے نزدیک تو نہیں البتہ عوام لکھنؤ کے نزدیک۔ "پہلوٹے ذم لیے ہوئے ہے (۳) "آج کل" کا استعمال بالکل صحیح ہے (۴) دونوں مختلف فیہ ہیں، میں "غدر" کی تذکیر کو صحیح سمجھتا ہوں۔

والسلام

عبدالماجد

<u>فراق گورکھپوری (الہ آباد)</u>

(۱)

دریاباد

۲۰۔ جنوری ۱۹۶۲ء

بسم اللہ

کرم گستر! تسلیم

بڑی عنایت ہوگی اگر وہ دو شعر اپنے تحریر فرما دیں[۱]

ایک تو ...... نگاہ اڑ ہیں نکلی، والا

دوسرا ...... حسن اداس اداس سا، والا

نیاز کیش، عبدالماجد

<u>پروفیسر احتشام حسین (الہ آباد)</u>

(۱)

"ہماری زبان" علی گڑھ میں امیر خسرو کی "خالق باری" مرتبہ حافظ محمود خاں شیرانی کے کسی شعر کے مفہوم پر احتشام صاحب کا کوئی مضمون نکلا تھا۔

دریاباد

۲۶ جنوری ۱۹۶۰ء

بسم اللہ

برادرم سلمہ! السلام علیکم

تازہ "ہماری زبان" میں "خالق باری" کے شعر پر مضمون پڑھ کر بڑی ہی عبرت ہوئی۔ شیرانی جیسا محقق اور صاحب نظر فاضل اور ایک معمولی سا شعر سمجھنے میں ایسی فاحش غلطی! مجھ جیسا بھی دنگ رہ گیا۔ سچ ہے فوق کل ذی علم علیم

انسان اپنے کس ہنر پر ناز کرے کل اس کی یہ بساط ہے۔

والسلام

عبدالماجد

(بقیہ حاشیہ صفحہ) [۱] مولانا دریابادی نے جو شعر دریافت فرمائے تھے، یہ ہیں:

(۱) وہ نیری نرم دوشیزہ نگاہی دل نہیں بھولا ۔۔۔ بڑی جب جب نظر تیری، نگاہ اولیں نکلی

(۲) شام بھی تھی دھواں دھواں، حسن بھی تھا اداس اداس ۔۔۔ دل کو کئی کہانیاں، یاد سی آکے رہ گئیں

علامہ نیاز فتح پوری (لکھنو) (۱)

مکتوب الیہ کو "پدم بھوشن" کا خطاب ملنے کی خبر پڑھ کر مبارکباد کا خط۔

دریاباد

۲۷ جنوری ۱۹۶۲ء بسم اللہ

خطاب کی خبر پڑھ کر

"نیاز" "مقام" "ناز" میں — خیر کسی اردو والے کی تو قدر ہوئی۔

تہنیت گزار:

عبدالماجد

نارش علی شاہ (سیالکوٹ)

دریاباد

۱۰ مارچ ۱۹۶۲ء بسم اللہ

کرم گستر! وعلیکم السلام

"چھان بین" بے شک قلیل الاستعمال ہے مگر ایسا بھی نہیں کہ اس پر اطلاق الشاذ کالمعدوم کا ہو۔

مولوی سید احمد دہلوی کی لغات النساء میں بھی نہ ملا۔

یہ چھان بین ہی کی ایک شکل ہو یا خود کوئی مستقل محاورہ ہو تو محض ایک ظن و تخمین کی چیز ہے۔ مثل،

استعمال پر اس کا کیا اثر ہوگا مگر میں ذاتی طور پر ترجیح اس کو دوں گا کہ یہ مستقل محاورہ ہے۔

والسلام، دعاگو:

عبدالماجد

مرزا عبدالظفر چغتائی (گورکھپور یونیورسٹی، حال مسلم یونیورسٹی علیگڑھ)

مصحفی پر لکھنے کی فرمایش کے جواب میں بہت پہلے مولانا نے مصحفی کی مثنوی "بحر المحبت" مرتب

بھی کی تھی۔

دریاباد

۱۹ اگست ۱۹۶۲ء

عزیزم سلمہٗ! وعلیکم السلام

جی ہاں خدمت "مصحفی" کے بعد اللہ کی ذرہ نوازی سے اب خود اپنے ظرف و بساط کے مطابق

"مصحفی" ہو رہا ہوں۔ بیچارے مصحفی شاعر بیچارہ کی طرف اب کیا توجہ کروں ؎

قافیہ اندیشم و دلدارِ من

گویدم مندیش جز دیدارِ من

البتہ ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب جو کچھ بھی عنایت فرمائیں اُن کا عین کرم سمجھوں گا۔ اللہ انہیں بھی

لفظ و عبارت کی منزلوں سے گزار کر جلد عالمِ معانی تک پہنچا دے۔

دعاگو،

عبدالماجد

نادر جاوید (حیدرآباد دکن) (۱)

دریاباد

۱۱ مارچ ۱۹۶۳ء بسم اللہ

برادرم! وعلیکم السلام

صحیح تلفظ جاوید Javaid بروزن بید، مجید

صحیح تلفظ شہلا SHAHLA بروزن کلا، حملہ

اردو میں صحیح و مستند تلفظ وہی ہوگا جو اردو زبانوں پر چڑھا ہوا ہے اور اس زبان کے تلفظ سے

متعلق بحث نہ ہوگی جس زبان سے وہ لفظ اردو میں آیا ہے، لالٹین کو اردو میں لالٹین ہی کہیں گے لین ٹرن

کہنا غلط ہوگا۔

ٹکٹ کو اردو میں ٹکٹ (بہ فتحہ کاف) کہیں گے، ٹکِٹ (بکسرِ کاف) کہنا غلط ہوگا۔

والسلام

عبدالماجد

<u>ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی (لکھنؤ)</u> (۱)

دریاباد

۱۲ مئی ۱۹۶۳ء — بسم اللہ

عزیزم سلمہ! — السلام علیکم

اردو زبان و ادب کے سلسلہ میں بعض عنوان مدت ہوئے ذہن میں آئے تھے لیکن ان پر لکھنے لکھانے کے لیے وقت کہاں سے لاؤں، کوئی ہونہار جونیر توجہ کرے تو البتہ شاید موجاجائے۔

(۱) ایک عنوان "اردو میں تابع مہمل" ہے کچھ تابع مہمل سماعی ہیں، ان کی فہرست، بعض ذرا زیادہ تر قیاسی ہیں، ان کے قاعدے ضابطے۔

(۲) دوسرا عنوان اردو کے "مردہ و نیم مردہ" الفاظ ہوسکتا ہے۔ ایسے لفظ جو استعمال میں تھے مگر دیکھتے دیکھتے متروک ہوگئے، مثلاً "برقرار" "تلملا"، "رامشگر" "نارکی ترجما"، "ماصیل" (ماما کے معنی میں) "ڈرونا" (خدمتگار کے مفہوم میں) "مرہا" (رعایا کے معنی میں) "کلنگ" (اب مستعمل صرف کلنگ کا ٹیکہ ہے) "اچل" (بمعنی پستان) وغیرہ سیکڑوں الفاظ ایسے مل جائیں گے۔ نیم مردہ سے مراد وہ لفظ ہیں جو اب شاذ و نادر ہی استعمال میں آتے ہیں۔

اس ضمن میں وہ غلط الفاظ اور ترکیبیں بھی آسکتی ہیں جو عموماً ناقص ترجمیں کی بدولت اردو میں گھس آئی ہیں مثلاً "معافی مانگنا" Apology کا ترجمہ ہر جگہ معذرت ہے کرنا، حالانکہ بہت سے موقعوں پر اس کا اردو مفہوم "دفاع" یا "صفائی" سے ادا ہوتا ہے Misconduct یا Misbehaviour کا ترجمہ ہر جگہ "بدسلوکی" سے کرنا حالانکہ بہت جگہ صحیح مفہوم "بدفعلی" سے ادا ہوگا۔ COMMUNALISM کا ترجمہ "فرقہ پرستی" سے کرنا حالانکہ یہ ترجمہ SECTARIANISM کا ہے۔ کمیونلزم کے لیے ہمارے یہاں چلا ہوا لفظ مذہبی تعصب ہے Free fight کا ترجمہ "آزادانہ لڑائی" سے کرنا وغیرہ۔

(۳) یہ عنوان تو خالص ادبی و لسانی ہوئے باقی ایک عنوان نیم مذہبی و ادبی ہے "نذیر احمد کا ترجمۂ قرآن — اردو ادب کی حیثیت سے" اس پر خود ہی لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں مگر دیکھیے کہ مہلت ملے یہی۔

عزیزی نور الحسن ہاشمی بھی اگر یہ خط پڑھ لیں تو بہتر ہے۔

والسلام، دعاگو و دعاخواہ،

عبدالماجد

(۲)

ڈاکٹر صاحب کے والد کے انتقال پر مولانا کا تعزیت نامہ۔ اس خط میں مخاطب ڈاکٹر صاحب کے چھوٹے بھائی شجاعت علی سندیلوی بھی ہیں۔

دریاباد

۶ جنوری ۱۹۶۶ء — بسم اللہ

عزیزم! — السلام علیکم

میں اگرچہ مرحوم سے واقف نہ تھا لیکن عین ماہ رمضان میں اور اس کے بھی دوسرے عشرہ کے شروع میں وفات خود ایک دلیل مغفوریت کی ہے، اللہ ہر طرح رحمت و مغفرت نصیب کرے۔

اولاد کا سن کچھ بھی ہو جائے باپ کا وجود باعث برکات ہی رہتا ہے اور اس سائے کا سر سے ہٹ جانا اولاد کو بے سہارا بنا دیتا ہے۔ اللہ آپ سب کو صبر جمیل کی توفیق عطا کرے۔

والسلام، دعاگو،

عبدالماجد

<u>سید عبدالرحمٰن (آگرہ)</u>

دریاباد

۲۷ جون ۱۹۶۳ء — بسم اللہ

مہربان بندہ! — وعلیکم السلام

میں اپنے لیے زیر بحث، وہم وا پسیں ہر گز خود ان میں اطلاق نوح جائز نہیں سمجھتا، بہ نسبت و یقین میں جائز سمجھتا ہوں۔

"زیر کمان" کی ترکیب عام قاعدے سے الگ اور مستقل گفتگو کی محتاج ہے۔ "رنگ و روپ" سے "و" حذف کرکے میں محض "رنگ روپ" استعمال کرتا ہوں۔ باقی میں کیا اور میری رائے ہی کیا۔

والسلام، دعاگو،

عبدالماجد

خلیق الرحمٰن قدوائی (بڑاگاؤں، بارہ بنکی)

قدوائی صاحب نے یاقوتی آموں کی دو قلمیں بھیجی تھیں۔ میاں قیوم سے مراد مولانا کے ماموں زاد بھائی کے بڑے صاحبزادے اور مولانا کے مخلص کارگزار ہیں۔

دریاباد

۲۶ جولائی ۱۹۶۳ء

عزیزم سلمہٗ! وعلیکم السلام

قلموں کی خبر نے دل باغ باغ کر دیا، جزاک اللہ و ماشاء اللہ۔ آم کا تحفہ یوں بھی کیا لذیذ اور رسیلا ہوتا ہے چہ جائے کہ جب اخلاص کی تہ میں ڈوبا ہوا ہو۔

سہ پہر کو کارڈ ملا اور شام کو میاں قیوم نے قلمیں پہنچا بھی دیں۔ تحفہ چونکہ بے سان و گمان نصیب ہوا اس لیے نعمت غیر مترقبہ کا پورا مصداق۔

دعا گو:

عبدالماجد

حبیب انصاری (ڈھاکہ) (۱)

مولانا عنایت اللہ شہید فرنگی محلی کے منجھلے صاحبزادے کے ذاتی مکان کی تعمیر پر مبارکباد کا خط۔

دریاباد

۱۶۔۱۰ اگست ۱۹۶۳ء بسم اللہ

عزیز مکرم!

شاعر نے تو "جہان" سے بے نیاز ہو کر صرف "جانِ جہان" کی مانگی تھی اور کہہ ڈالا تھا ؎

مکیں کی خیر ہو یارب مکاں رہے نہ رہے

میں یہ بے نیازی کہاں سے لا سکتا ہوں، مکان کی مبارکباد مکین کو دیتا ہوں اور خیر مکین و مکان دونوں کی "لامکان" سے مانگتا ہوں۔

والسلام، دعاگو،

عبدالماجد

شیخ نصیر الدین قدوائی (بڑاگاؤں، بارہ بنکی) (۱)

جھبر لال نامی ایک مستحق انصاف کی سفارش۔ مکتوب الیہ ضلع گنا فیڈریشن کے صدر منتخب ہوئے تھے

مولانا سے قرابت داری بھی تھی۔

دریاباد

۱۳ ستمبر ۱۹۶۳ء بسم اللہ

برادرم سلمہٗ! السلام علیکم

آں عزیز کے صدر ضلع شکر کمیٹی ہونے کی خبر ابھی معلوم ہوئی ـــــ اخلاص و اخلاق کی شیرینی پر اس رسیلی کمیٹی کی صدارت کا اضافہ مبارک ہو اور اللہ دنیا و آخرت میں شیریں ہی کام رکھے۔

• اس خط کے حامل جھبر لال دریاباد کے قریب ہی کے گاؤں کے رہنے والے ہیں، ان کا بیان ہے کہ وہ ایک مدت دراز سے یعنی دس سال سے یہاں کی گنا یونین میں موسمی عہدیدار ہیں اور موسم کے ختم ہونے پر انہیں جواب مل جاتا ہے، آرزومند ہیں کہ خدمت کا موقع انہیں مسلسل ملتا رہے۔ خدا معلوم محکمہ میں ملازمت کے قاعدے کیا ہیں۔ بہرحال اگر قاعدہ میں کوئی گنجائش نکلتی ہو تو کیا عجب ہے کہ نعم المولیٰ و نعم النصیر کا ورد کرتے ہوئے وہ اپنی آرزو میں کامیاب ہو جائیں گے۔

والسلام، دعاگو،

عبدالماجد

مولوی محمد ہاشم انصاری فرنگی محلی (لکھنؤ)

مکتوب الیہ کے تحفہ "پنیر" (CHEESE) کے جواب میں۔

دریاباد

۱۴ نومبر ۱۹۶۳ء بسم اللہ

عزیزم سلمہٗ! السلام علیکم

سبحان اللہ کیا چیز (Cheese) آپ اس ناچیز کے لیے لے آئے۔ جزاک اللہ

والسلام

عبدالماجد

ڈاکٹر شوکت سبزواری (کراچی)

جامع لغت سے اشارہ ترقی اردو بورڈ کراچی کے زیر اہتمام تیار ہونے والے لغت کی طرف ہے اس لغت کی اب تک چھ جلدیں شائع ہو چکی ہیں، تکمیل تقریباً بیس جلدوں میں ہوگی۔ اب اس عالمانہ کام [illegible] [illegible]

۱۱ جنوری ۱۹۶۴ء

کرم گستر! السلام علیکم

نقوش "آپ بیتی نمبر" صفحہ ۱۱۵۸ وسط، آپ نے اپنے جس مقالے کا ذکر کیا ہے، وہ کہاں دیکھنے کو ملے گا؟

اُردو کے اس جامع لغت کا کام افسوس ہے کہ اب جا کر شروع ہوا۔ کاش میری ایسی عمر میں شروع ہوا ہوتا کہ اپنی زندگی میں اس کے دیکھنے کی مسرت حاصل کر سکتا۔

والسلام، دعاگو و دعاخواہ،

عبدالماجد

رئیس احمد جعفری ندوی (لاہور)

"رند پارسا" سے مراد رئیس احمد جعفری مرحوم کے ناول یاسمین خیرآبادی کی طرف اشارہ ہے۔

دریاباد

۱۴ جنوری ۱۹۶۴ء بسم اللہ

برادرم! وعلیکم السلام

کل نفیس اکیڈیمی سے ایک بجا جیسا پارسل وصول ہوا، کھولا تو ترجمہ زاد المعاد کی چار جلدوں پر نظر پڑی۔ ابھی کتاب کو کھولا تک نہیں پڑھنے کا کیا ذکر مگر نام ہی سے طبیعت بحال ہو گئی، دل شگفتہ ہو گیا ——

ناول نویسی کے بعد زاد المعاد —— کسبِ دنیا کے بعد توشۂ آخرت، فکرِ معاش کے بعد فکرِ معاد! ——

صنم کدے منزلِ راہ اور کعبہ منزلِ مقصود۔ ع

رند پارسا کا لخت جگر خود ایک رند پارسا

مطبوعات ثقافت میں انتظار ان کتابوں کا رہے گا۔

الغزالی، اسلام اور رواداری، ملفوظات رومی، پیغمبر انسانیت، اسلام اجتہاد، سیاست نامہ۔

دعاگو و دعاخواہ،

عبدالماجد

نثار حسین لیدی (لاہور)

مولانا دریابادی کی قلمی تحریر کے لیے درخواست کے جواب میں۔

دریاباد

۱۶ مئی ۱۹۶۴ء بسم اللہ

مہربان بندہ! السلام علیکم

مجھ سے بدخط سے، جس کی بدخطی ضرب المثل کی حد تک پہنچی ہے، قلمی تحریر کی فرمائش کی خوب رہی۔ یہ آخر آپ کو میری رسوائی کی سوجھی کیا!

مومن خاں فن نجوم یا جوتش میں بھی دخل رکھتے تھے، فرما گئے ہیں ؎

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس

آسماں بھی کیا ستم ایجاد کیا ہے

اس "بہ قلم خود" کا حکم دینے کے بعد آپ بھی ستم ظریفی میں آسمان سے کچھ کم نہ رہے! اب اپنے آئینہ خانہ کو بنائیے یا بگاڑیے اس کی ذمہ داری آپ ہی پر ہے۔ بندے نے تعمیلِ ارشاد کر دی۔

دعاگو و دعاخواہ: عبدالماجد

مولانا عبدالرؤف جھنڈے نگری (رام دت گنج ضلع بستی)

آموں کے تحفے کے جواب میں شکریے کا خط۔

دریاباد

۱۱ جولائی ۱۹۶۴ء بسم اللہ

کرم گستر! السلام علیکم

آم "ڈھیر کے ڈھیر" آپ کے بھیجے ہوئے کھانے میں اب آئے، جزاک اللہ۔ اتنے میٹھے اور رسیلے کہ حدِ تعریف سے باہر سبحان اللہ —— کہیں آپ نے اخلاص کا رس تو ان میں نہیں گھول دیا تھا۔

والسلام دعاگو و دعاخواہ:

عبدالماجد

مولانا امین احسن اصلاحی (لاہور)

دریاباد ضلع بارہ بنکی

۱۳ اگست ۱۹۶۴ء

برادرم سلمہ اللہ! السلام علیکم

دل خوشی ہوئی یہ پڑھ کر کہ "میثاق" انشاء اللہ جاری رہے گا اور تفسیر انشاء اللہ کتابی صورت میں شائع ہو گی۔

خدمتِ قرآن کے بیسیوں ڈھنگ ہیں اور سب اپنی اپنی جگہ مقبول و قابلِ قدر و احترام رہیے

زمخشری اپنی جگہ اور ابن کثیر اپنے مقام پر، تو آپ کی تفسیر بھی اپنی نوعیت کی منفرد ہے اور یہ سعادت آپ ہی کا حصہ ہے، اللہ مبارک کرے۔ رسالہ میں قسط وار اشاعت اور یکجائی کتابی صورت میں اشاعت میں بڑا فرق ہے۔

اب اگر اجازت ہو تو اپنے سن کی بڑائی سے فائدہ اٹھاکر دو باتیں بے تکلف عرض کردوں۔

(۱) عربی الفاظ کے محلِ استعمال اُردو میں اکثر بہت جگہ بدل گئے ہیں۔ اس کا خیال اچھے اچھے علماء کو نہیں رہتا حالانکہ اس کا خیال رکھنا لازمی ہے۔ مثلاً ایک لفظ "تاویل" ہے۔ عربی میں بالکل بے عیب، لیکن اردو میں آکر ایک شائبہ ذم کا بھی اس میں شامل ہوگیا ہے۔ "میں نے اس قول کی تاویل کی" کے معنی اردو میں یہ ہوں گے کہ "میں نے یوں بات بنائی"۔

یہی حال لفظ "کذب" کا ہے، لوگ ہر جگہ اس کا ترجمہ جھوٹ کردیتے ہیں۔ حالانکہ عربی میں اس میں بڑی وسعت ہے۔ اور بارہا محض "خلافِ واقعہ" کے معنی میں آیا ہے۔ جو کسی درجہ میں بھی کوئی اخلاقی جرم نہیں۔

اس قسم کے "فروق" کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے ——— اب آگے لقمان کو حکمت کیا پڑھاؤں۔

(۲) دوسری بات اور یاد پڑ گئی۔ لفظ "پُرکاری" صحیح اردو میں اچھے مفہوم میں نہیں آتا بلکہ "عیاری" کے مترادف ہے۔ "سادگی و پُرکاری" کی ترکیب جو اس کثرت سے رائج ہوگئی ہے، خواص اہلِ قلم کے لیے احتیاط کے قابل ہے کہیں کہیں عطف کے ساتھ بھی درست ہے۔ لیکن غالبؔ نے بلا عطف بھی استعمال کیا ہے ؎

سادہ پُرکار ہیں خوباں غالبؔ   ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

(سادہ بمعنی سادہ لوح، پُرکار بمعنی عیار۔ یعنی ان عیاروں کی یہ سادہ لوحی دیکھو کہ وفا کا یقین ہم جیسے پہلے سے پرزوروں کو دلاتے ہیں!)

والسلام

دُعا گو و دُعا خواہ:

عبدالماجد

اپنی تفسیر اُردو کے دوسرے ایڈیشن کی فکر میں عرصے سے مُبتلا ہوں، نظرثانی بڑی تفصیل سے کی ہے اپنی غلطیوں، کوتاہیوں، نافہمیوں پر نظر کچھ تو خود ہی پڑی اور کچھ دوسروں کے بتانے سے۔ لیکن چھپے کیونکر؟ ۶۰،۰۰۰ ہزار یکمشت لگانے کا دم ہندوستان میں اب کس پبلشر میں ہے۔ اور لاہور، کراچی کا رُخ کرنے کی دشواریاں ظاہر ہی ہیں، غرض اپنی زندگی میں تو یہ آرزو (اور اب کہنا چاہیے کہ زندگی کی سب سے بڑی آرزو) پوری ہوتی نظر نہیں آتی[1]

[1] تفسیر ماجدی کی جلد اول (نظرثانی شدہ) کوئی دس برس قبل بھارت سے شائع ہوگئی تھی، غالباً باقی جلدیں بھی وہیں سے شائع ہوگئی ہوں گی۔ (یہ خط بہ شکریہ جناب محمد احسن خاں درج کیا گیا ہے)

ہاں "اسالیبِ قرآن" کو بھی کتابی صورت میں لائیے۔

غرائب القرآن پر بھی کوئی اچھی کتاب اردو میں موجود نہیں، اردو میں کیا معنی عربی میں بھی میری نظر سے نہیں گزری۔ عکبری کی مشہور و متداول کتاب مختصر و ناکافی ہے۔

پنڈت آنند نرائن ملّا دلکش

"پرسکار سمیتی" — یو۔پی گورنمنٹ کی مقرر کردہ کمیٹی ہے جو اردو، ہندی، سنسکرت کی کتابوں پر انعام دیتی ہے۔ اس کے صدر اس زمانے میں ڈاکٹر سمپورنانند گورنر راجستھان تھے۔ لاٹ صاحب سے اشارہ انہی کی طرف ہے۔ چار درویش سے مراد کمیٹی کے چار موجود ممبروں کی طرف ہے جنہوں نے ملّا صاحب کے مجموعہ کلام "حدیثِ عمرِ گریزاں" کے متعلق بہ قابلِ انعام ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ "باغ و بہار" میرامّن کی کتاب کا استعارہ اسی کے لیے لائے۔

دریاباد

۲۴ دسمبر ۱۹۶۳ء

کرم فرمائے گرامی! تسلیم

۱۹ کو لکھنؤ گورنمنٹ ہاؤس میں پرسکار سمیتی کی میٹنگ تھی۔ اردو کے ممبر صرف چار تھے۔ صدر صاحب (لاٹ صاحب راجستھان) عین وقت پر بے چارے بیمار ہوگئے، جلسہ میں نہ آسکے۔ صدارت کا بار مجھ دیہاتی کے دوشِ ناتواں کو اٹھانا پڑا۔ آپ کی "حدیثِ عمرِ گریزاں" ہم چار درویش کی ٹولی کے لیے "باغ و بہار" ثابت ہوئی۔ انعامِ اوّل پر ہم سب متفق رہے اور اس فیصلے نے شاعر کی نہیں بلکہ فیصلہ کرنے والوں کی عزت میں اضافہ کیا۔

سرکاری اطلاع خدا معلوم آپ کو کب پہنچے، مبارکباد میں سبقت کرنے کی مسرت سے میں اپنے کو کیوں محروم رکھوں۔

نیاز کیش:

عبدالماجد

ڈاکٹر سید معین الرحمن (لاہور)

(۱)

پہلے خط میں کتاب پہنچنے سے اشارہ بابائے اردو (احوال و افکار) کی طرف ہے جسے سید معین الرحمن نے تالیف کیا تھا اور مولانا دریابادی کو تبصرے کے لیے بھیجی تھی، اور مولانا نے ۱۹ مارچ ۱۹۶۵ء کے شمارہ "صدق جدید" میں تبصرہ کر بھی دیا تھا۔ مکتوب الیہ پہلے دو مکتوب کی آمد کے وقت گورنمنٹ ڈگری کالج بہاولنگر میں شعبہ اردو سے وابستہ تھے۔ (اطلاع بشکریہ مکتوب الیہ)

دریاباد

۱۲ مارچ ۱۹۶۵ء

برادرم معین الرحمن! وعلیکم السلام

کتاب پہنچ گئی۔ ان شاء اللہ شوق و دلچسپی سے پڑھوں گا اور ایک آدھ سطر "صدق" میں لکھ بھی ضرور دوں گا۔ زیادہ کی گنجائش ہی نہیں نکلتی۔ ہر وقت آئی ہوئی کتابوں کا ایک انبار لگا رہتا ہے۔

"قومی زبان" میں اسے دلچسپی کے ساتھ پڑھنا یاد ہے اور خیال تو یہ بھی آتا ہے کہ اُس وقت ہی کچھ لکھ دیا تھا۔

والسلام

دعاگو و دعاخواہ:

عبدالماجد

(۲)

دریاباد

۷ جولائی ۱۹۶۵ء

برادرم! وعلیکم السلام

بڑی ہی حیرت ہوئی کہ اس مضمون پر اظہارِ خیال رہ کیسے گیا! ایسا کبھی ہوتا نہیں، خدا معلوم کیا بھول پڑ گیا اور حیرت سے بڑھ کر ندامت اور ندامت سے بڑھ کر معذرت واجب ہو گئی۔

"نقوش" کے آخری نمبر میں ذکرِ عبدالحق پڑھا۔ میں ہوتا تو عنوان رکھتا "عبدالحق بزبان عبدالحق" ——— یہ خلاقی تو اللہ میاں کی سنت تھی کہ حشر میں جسم کے ایک ایک ٹکڑے پرزے کو جوڑ کر جسم کو پھر سے پیدا کر دیں گے اور نیست کو ہست کر دیں گے ——— بندے کے لیے یہ صناعی بھی کچھ کم نہیں کہ اس نے جا بجا کی سطروں سے صیغۂ غائب کو صیغۂ متکلم میں تبدیل و تحویل کر دیا۔ مشتِ خاک نے آخر کچھ تو حق احسن الخالقین کی نیابت کا ادا ہی کر دیا۔ نہ ہوا شاعر

ہر طرف سے صدائیں مرحبا و سبحان اللہ کی آنے لگیں۔

بہرحال میں تو قائل آپ کی دیدہ ریزی، ذہانت، ذوقِ صحیح، غرض ایک لفظ میں آپ کی صنعت گری کا ہو ہی گیا۔

والسلام، عبدالماجد

(۳)

مکتوب الیہ نے "صدق جدید" کا کوئی پرانا پرچہ طلب کیا تھا۔

دریاباد

۲۵ اپریل ۱۹۶۶ء

کرم گسترا! وعلیکم السلام

میرا پتا دریاباد کا رہتا ہے اور ہر ہفتے صدق کی پیشانی پر چھپا رہتا ہے۔ صدق کا صرف دفتر لکھنؤ میں ہے۔ آپ نے پتے پر لکھنؤ لکھا، خط وہیں گیا اور دفتر کا خط سمجھ کر وہیں پڑھ بھی لیا گیا اور جواب بھی لکھ دیا گیا۔ اتفاق ہے وہ پرچہ دفتر میں بھی موجود نہیں۔

میرے پاس وہ خط اب پہنچا اور یہ اس کی محض رسید ہے۔

والسلام، دعاگو:

عبدالماجد

(۴)

مکتوب الیہ نے سجاد حیدر یلدرم کی "خیالستان" کو نئی ترتیب اور مقدمے کے ساتھ شائع کیا تھا اور مولانا دریابادی سے اس پر کچھ لکھنے کی فرمائش کی تھی، یہ خط اسی فرمائش کا جواب ہے۔

۱۷ اگست ۱۹۶۹ء

مکرم! وعلیکم السلام

"صدق" میں بار بار اپنی معذوریاں عرض کر چکا ہوں، یہاں تک لکھ چکا ہوں کہ بصارت اب ۷۵، ۸۰ فی صدی رخصت ہو چکی ہے صرف ۲۰ - ۲۵ فی صدی باقی رہ گئی ہے۔ اپنے ہی کام خدا معلوم کس طرح لشتم پشتم چلے جا رہے ہیں، دوسروں کی خدمت کا کیا امکان ——— لیکن آپ کے سے قدردان حضرات، یہ سب سُنی اَن سُنی کر رہے ہیں، بس اپنی کہے اور فرمائشیں کیے چلے جا رہے ہیں۔

فرمائشیں کرنے والوں کو اگر ظالم نہ کہوں، تو کیا اہلِ فرمائش کو بھی غیر شعوری یا اضطراری ظلم نہ کہوں؟

والسلام، عفو خواہ: عبدالماجد

قاضی محمد اطہر مبارک پوری (بمبئی)

(۱)

قاضی صاحب نے اپنی کتاب "رجال السند والہند" تبصرے کے لیے بھیجی تھی۔ اسی کی طرف اشارہ ہے نیز قاضی صاحب نے ایک مضمون "حضرت امام محمد کی کتاب الآثار" کے تعارف میں بھیجا تھا، اسکے لیے گنجائش نکالنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

بسم اللہ

مورخہ ۱۴ جولائی ۱۹۶۹ء

دریاباد۔ ضلع لکھنؤ

کرم گستر! وعلیکم السلام

جزاک اللہ، انشاءاللہ گنجائش نکلتے ہی وہ تبصرہ درج ہو جائے گا، بلکہ اگر مزید مفصل معلومات اس سلسلے میں آجائیں تو ان کے لیے بھی گنجائش نکالنے کی کوشش ضرور کی جائے گی۔

والسلام، دعاگو:

عبدالماجد

(۲)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۴ اکتوبر ۱۹۶۹ء

دریاباد۔ ضلع لکھنؤ

مکرمی! السلام علیکم

آپ کے شہر (بمبئی) میں جو تاجر بنگلور والی کتابوں کا ہے، اس کی فہرست میں ایک نام درج ہے "الدعوۃ الاسلامیہ الی اہل السنۃ والامامیہ" دو جلد قیمت ۳۶ مصنف کا نام ندارد۔ آپ کی نظر سے گزری ہے یا آپ کہیں سے اس کے متعلق معلومات فراہم کر سکتے ہیں؟ زیادہ تفصیل کی زحمت نہیں دینا چاہتا، بس خلاصہ در خلاصہ دو چار سطروں میں کافی ہوگا، سیکنڈ ہینڈ مل سکتی تو میں خود منگا لیتا۔

والسلام، دعاگو:

عبدالماجد

(۳)

قاضی صاحب نے "الدعوۃ الاسلامیہ الی اہل السنۃ والامامیہ" تلاش کی لیکن اس دوران میں وہ فروخت ہو چکی تھی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۲۹ اکتوبر ۱۹۶۹ء

دریاباد، ضلع بارہ بنکی

مکرم بندہ! السلام علیکم

"الدعوۃ الاسلامیہ" کے متعلق جواب مل گیا، خدا کرے جلد ہی آپ کو اس کے متعلق معلومات حاصل ہو جائیں۔ ایک اور بات جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کی تصنیفات و مقالات عربی زبان میں کون کون ہیں، اور ادب علم و فن سے متعلق اردو زبان میں کون کونسی ہیں، جواب پاکر شکرگزار ہوں گا۔

والسلام، دعاگو و دعاخواہ:

عبدالماجد

(۴)

مولانا دریابادی نے کویت کی مطبوعات کے لیے اپنے طور پر کوشش کی تھی وہاں سے جواب آیا کہ اس سلسلے میں قاضی صاحب ہی ان کے مشیرِ خاص ہیں، مولانا نے یہی اطلاع قاضی صاحب کو دی۔

بسم اللہ

۲۰ نومبر ۱۹۷۲ء

مخدوم و مکرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مطبوعاتِ کویت سے اپنے کو مسلسل محروم پاکر میں نے کویت اپنے خاص مخلص کو خط لکھا، کل ان کا جواب آیا کہ "میں آپ کے لیے پوری کوشش کروں گا، لیکن ہندوستان کے لیے کتابوں کے مشیرِ خاص قاضی اطہر مبارک پوری ہیں، آپ ان کو لکھیے تو امید ہے کہ تعمیل جلد ہو جائے۔"

مجھے اس جواب کے باصواب ہونے کا پورا یقین تو نہیں، لیکن بہرحال ان کا یہ جواب نقل کیے دیتا ہوں۔ لغت، تاریخ و تفسیر کی کتابوں کی تلاش خاص طور پر رہتی ہے۔

والسلام، دعاگو و دعاخواہ:

عبدالماجد

سید صباح الدین عبدالرحمٰن (اعظم گڑھ)

دریاباد

۲۱ر اپریل ۱۹۶۶ء

بسم اللہ

عزیزم ! وعلیکم السلام

جون میں بمشورہ ڈاکٹر صاحب میٹنگ ضرور ہو، شاہ صاحب کا پروگرام معلوم ہوگیا، اب کی "معارف" میں زرث کرنے کے قابل کئی باتیں نظر آئیں اور بڑی بات یہ کہ اس کے لیے وقت مل گیا۔

(۱) مناقب الاصفیاء پر بحث خواہ مخواہ بڑھتی جا رہی ہے، موضوع سے دلچسپی رکھنے والا گروہ بہت ہی محدود ہوگا۔

(۲) صفحہ ۲۴۵ شروع کی سطر ۳ اعراف اس معنی میں اردو کے لیے بالکل نامانوس ہے، عرف ہی جو کا کام دیتا ہے۔

(۳) املا بہت سی جگہ اس طرح کا نظر آیا۔ کیسلیے کیجاتی ہے، ملکر، لیکر یہ سب بدلنے کے قابل ہے۔

(۴) صفحہ ۳۴۰ خامہ فرسائی غلط موقع پر استعمال ہوا ہے۔

"وہ رند بلانوش بھی تھے اور زاہد باصفا بھی" اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ یہ دونوں باتیں ایک ہی وقت میں تھیں اور آخر وقت تک رہیں، اسے یوں لکھا جا سکتا ہے "اگرچہ اب ان کا شمار زاہدانِ باصفا میں تھا لیکن کبھی رند بلانوش بھی رہ چکے تھے"! اس کے بعد والا فقرہ بھی ایسا ہی ہے۔

یہ خط جوابی نہیں صرف اطلاعی ہے۔ والسلام

دُعاگو : عبد الماجد

حبیب اللہ صدیقی (الٰہ آباد)

مولانا آزاد سے مراد مولانا ابوالکلام آزاد ہیں۔

دریاباد

۱۴ر فروری ۱۹۶۷ء

بسم اللہ

مخلص نواز ! وعلیکم السلام

"میرا جی" کا لفظ مجھے تو نہ کسی اردو لغت میں ملا نہ کسی ادیب کی تحریر میں، ہاں بعض عوام کو بولتے سنتا ہے۔ مولانا آزاد نے اگر استعمال کیا تو بے خیالی میں ہی کر گئے ہوں گے، بڑے سے بڑے ادیب سے بھی بے التفاتی اور سہو تو ہو ہی جاتی ہے۔

والسلام ، دُعاگو و دُعا خواہ :

شاہ غلام حسنین (پھلواری شریف)

(۱)

۱۵ر فروری ۱۹۶۷ء

بسم اللہ

برادر محترم ! وعلیکم السلام

آپ کا ایک فتویٰ درباۂ طلاق کسی رسالہ میں سال میں نظر سے گزرا تھا، وہ اس درجہ پسند آیا کہ رسالہ سے وہ ورق کاٹ کر اپنے فقہی لفافے میں محفوظ کر لیا۔ ماشاء اللہ وجزاک اللہ

مکتوب گرامی بھی اُسی فکر کا نکلا، میرے خیالات کا ہو بہو عکس و نقش۔ انشاء اللہ پورا مکتوب مع "صدق" کے تائیدی نوٹ کے نکل جائے گا۔ البتہ ہر پرچہ بہت قبل سے تیار کرنا ہوتا ہے اس لیے فوری اشاعت ممکن نہیں ہوتی تاخیر ہو ہی جاتی ہے۔ نمبر ۹ مرتب ہو کر کل جا چکا، اب یہ کہیں نمبر ۱۰ میں ہی نکل سکے گا۔

گھر میں علیل بہت زیادہ رہنے لگی ہیں بیچ بیچ میں حالت خطرناک ہو جایا کرتی ہے۔ دعاؤں کا مستدعی ہوں۔

والسلام ، دُعاگو و دُعا خواہ :

عبدالماجد

(۲)

مکتوب الیہ نے "شمس المعارف" کا تحفہ بھیجا تھا۔ "سلیمان" سے مراد مکتوب الیہ کے والد مولانا شاہ سلیمان پھلواری ہیں۔

دریاباد

۱۴ر جنوری ۱۹۷۱ء

بسم اللہ

برادرم ! وعلیکم السلام

(۱) تحفہ شمس المعارف پہنچا۔ سبحان اللہ

(۲) جلوۂ سلیمان نظروں میں پھر گیا۔ ماشاء اللہ

(۳) "صدق" میں چند سطریں نکلتے ہی نکلیں گی۔ انشاء اللہ

(۴) والا نامہ پہنچا۔ بارک اللہ

(۵) خبرِ صحت و خیریت بھی دریافت ہو گئی۔ الحمدللہ

والسلام ، دُعاگو و دُعا خواہ :

عبدالماجد

فرحت انوار صاحبہ (کراچی)

دریاباد

۱۰ مارچ سنہ ۱۹۶۷ء

بسم اللہ

عزیزہ سلیبا! وعلیکم السلام

ہوم نرسنگ وغیرہ میں کامیابی خوب رہی۔ اللہ ہر طرح سے مبارک کرے۔

فطرت کی اس شاعری پر دل کھول کر داد دینے کو جی چاہتا ہے جو خود ہی دائم المرض ہو اور بیماریوں میں غرق اسی کو تیمارداری میں برق بنا دیا! ہائے مومن ؎

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس   آسماں بھی کیا ستم ایجاد ہے

پر بھی اس کی قدرت سے کچھ بعید نہیں کہ اسی تیمارداری کے طفیل میں اب خود تیماردار کی بیماری کھو دے اور اسے بیمار سے تندرست و توانا بنا دے "مصدق" اگر کبھی یہ خبر دیتا تو لکھتا کہ ایک خاتون کی ہمت مردانہ نے بیس بیس جوان مردوں کے چھکے چھڑا دیے۔ مریم زمانی کہنا گستاخی ہو تو کنیز مریم کہنے میں شک کی گنجائش نہیں۔

جن ڈاکٹر صاحب نے یہ کہا کہ مرض الموت فلاں بیماری ہوگی انہوں نے زنہر احمری زبان میں اجنگ ماری۔ موت کا حال کوئی بندہ جان سکتا ہے۔ ڈاکٹر کی رسائی تو بس مرض تک ہے۔ زندگی و ختم زندگی کا سوال اس سے بالکل الگ ہے

دعا گو و دعا خواہ:

عبدالماجد

نامعلوم

۱۲ر جون سنہ ۱۹۶۷ء   دریاباد ضلع بارہ بنکی

گرم گستر! وعلیکم السلام

ہدیۂ گرامی موصول ہو گیا۔ جزاک اللہ۔

تیل اور سرمہ کا عطیہ سر آنکھوں پر۔

شافی برحق ساری دواؤں میں شفا بخشے۔ والسلام

دعا گو و دعا خواہ: عبدالماجد

عبدالصمد (سہوان ضلع بدایوں)

دریاباد

۴ر جولائی سنہ ۱۹۶۷ء

بسم اللہ

مہربان بندہ! وعلیکم السلام

محاورہ واقعی سر پر احسان کرنے کا ہے۔ دل پر احسان خلاف محاورہ ہے۔ البتہ میں اسے غلط نہ قرار دوں گا صرف غیر فصیح کہوں گا۔

والسلام، دعا گو:

عبدالماجد

غلام السیدین (نئی دہلی)

سیدین مرحوم کے والد خواجہ غلام الثقلین لکھنؤ سے "عصر جدید" نکالتے تھے۔ اس خط میں ان کے بڑے بھائی غلام الحسنین (سیدین کے بڑے چچا) اور چھوٹے بھائی غلام السبطین (سیدین کے چھوٹے چچا) کا ذکر بھی آیا ہے۔ آئی، ڈی، ٹی مخفف ہے، انڈین ڈیلی ٹیلیگراف کا، جو مہاراجہ محمود آباد کی ملکیت تھا۔ خواجہ غلام الثقلین مرحوم شیعہ سنی اتحاد کے زبردست مبلغ تھے اور شیعہ کانفرنس کے غلو سے شدید اختلاف کرتے ہوئے کانفرنس سے نکل آئے۔ مولانا دریابادی کا اشارہ ان کی سیرت کی اسی خوبی کی طرف ہے۔

دریاباد

۸ر جولائی سنہ ۱۹۶۷ء

بسم اللہ

عزیز مکرم! وعلیکم السلام

شاعر تو سخن شناس کی داد پر پھولا نہیں سماتا۔ اس بے ہنر کو ایک ہنر شناس کی داد و تحسین پر الٹی اور شرمندگی ہی ہوئی۔ اللہ نے کس غضب کا حسن ظن بعض دلوں اور دماغوں میں رکھ دیا ہے۔

آپ کو علم نہیں اپنی زندگی کے ایک دور میں آپ کے والد ماجد کا حلقہ مرید رہ چکا ہوں۔ سیتاپور ہائی اسکول میں پڑھتا تھا غالباً آٹھویں درجے میں، اور وہ لکھنؤ میں پریکٹس کیا کرتے تھے "عصر جدید" بھی نکالتے تھے۔ خاص انہی کی زیارت کے لیے سفر لکھنؤ کا کیا، بعد کو تو اس افراط و غلو میں اعتدال پیدا ہو گیا پھر بھی خاصی گہری عقیدت ان کے دم آخر تک رہی اور جب ان کی وفات کی خبر اچانک لکھنؤ کے انگریزی روزنامہ I.D.T. سے معلوم ہوئی تو ایسا معلوم ہوا کہ کوئی بزرگ خاندان و عزیز اٹھ گیا ——— تو اس

رشتے سے تو آپ میرے مرشد زادے، پیر زادے، مخدوم زادے ہوئے۔

۱۹۱۴ء میں میری عقلیت RATIONALISM اور لاادریت کا دورِ شباب تھا اُس وقت مرحوم کی کوئی خدمت دعا و ایصالِ ثواب سے نہ کر سکا۔ آپ کے بڑے چچا کی تحریروں کا بھی بڑا مداح اور شیدائی رہا، پھر ان کی آخر عمر میں علی گڑھ میں ان سے نیاز حاصل رہا۔ کورٹ کی ممبری کے سلسلہ میں آپ کے چھوٹے چچا سے بھی دِلی میں ملاقات رہی جب وہ ہندوستانی دواخانہ میں تھے۔

پچھلے دنوں سنا تھا کہ آپ شیعہ کانفرنس کے صدر ہوئے ہیں بڑا اشتیاق رہا آپ کے خطبۂ صدارت دیکھنے کا۔ اور حافظہ کے سامنے ۴۰ سال قبل کا منظر آگیا جب اس شیعہ کانفرنس سے آپ کے والد کو باہر نکل آنا پڑا تھا۔ ابھی کئی دن ہوئے آپ کا "سفرِ ارتقاء" نظر سے گذرا، ماشاء اللہ کچھ اور بھی لکھتا مگر وہ بات "من ترا حاجی بگویم" کی یاد پڑ گئی۔ والسلام، دُعاگو،

عبدالماجد

حکم چند نیر (بنارس)

نیر صاحب نے بنارس ہندو یونیورسٹی میں اردو فارسی کے عمدہ انتظام کی تفصیل تحریر کی تھی مولانا ان کے خط کو "صدقِ جدید" میں چھاپنا چاہتے تھے۔

دریاباد

۱۲ستمبر ۱۹۶۷ء بسم اللہ

بندہ نواز! تسلیم

آپ تو بڑی چیز نکلے ــــ زندہ باشی!

اتنے بہتر، اتنے مفصل، اتنے جان دار بلکہ جان بخش خط کی تو میں توقع ہی نہیں کر سکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ خیال کیے ہوئے تھا کہ چند سطری ضابطے کا جواب آجائے گا۔ اِس کا بیشتر حصہ چھپنے کے قابل ہے۔ بہت ہی خوشگوار حقیقتیں اس "شعاعِ نیر" سے روشن ہو جائیں گی۔

آپ اجازت دیتے ہیں نہ؟ اگر روکنا ہو تو لکھ دیجیے گا۔ ورنہ آپ کی خاموشی کو نیم رضا نہیں بلکہ کامل رضا سمجھوں گا۔

نیاز کیش،
عبدالماجد

مرزا جمیل احمد ایڈوکیٹ (حیدرآباد دکن) (۱)

دریاباد

۴ستمبر ۱۹۶۶ء بسم اللہ

عزیزم! وعلیکم السلام

(۱) مشکور بمعنی ممنون اصلاً یعنی عربی قاعدے سے غلط ہے لیکن اردو میں کثرت سے استعمال ہونے لگا ہے۔ اور عوام ہی نہیں بعض خواص بھی یہی بولنے اور لکھنے لگے ہیں اس لیے زیادہ سختی اب صحیح نہیں، خاص کر جب اس کا عطف ممنون کے ساتھ ہو۔

اصلاً صحیح لفظ شاکر یا متشکر ہے اور سلیس اردو میں شکر گزار۔

(۲) جی نہیں صحیح املا اقلیت ہی ہے بے تشدید۔

جی ہاں افسوس ہے کہ لکھنؤ آپ کی راہ میں نہیں پڑتا ورنہ جو تاریخیں آپ نے لکھی تھیں وہ زمانہ میرے قیام لکھنؤ کا ہے اگر گاڑی ادھر سے گزرتی بھی ہوتی تو اترنے کی صورت ہی نہ تھی، اسٹیشن ہی پر آپ سے مل لیتا۔ والسلام دُعاگو و دُعا خواہ،

عبدالماجد

(۲)

دریاباد

۸نومبر ۱۹۷۱ء بسم اللہ

عزیز مکرم! وعلیکم السلام

سوال کے جواب میں گزارش ہے کہ میرے محدود علم میں "مشکور" اس موقع پر عربی قاعدے سے صحیح نہیں، لیکن اردو میں اس کثرت سے استعمال ہو گیا ہے کہ اب اسے غلط کہنا بھی آسان نہیں رہا۔ بہر حال خلاف احتیاط ضرور ہے، میں اس موقع پر "شکر گزار" لاتا ہوں۔

اور اگر کوئی "مشکور" کا عطف ممنون کے ساتھ سے آئے اب چونکہ غلط فہمی باقی نہیں رہتی اس لیے اس کے لیے بھی گنجائش نکل سکتی ہے لُغت سے مقدم اہل زبان کا روزمرہ محاورہ ہے۔ ہاں عرب یاد آیا "شاکر" اور "شکر گزار" کا متبادل و مترادف ایک لفظ "متشکر" بھی ہے۔

والسلام، ہیچمداں، عبدالماجد

(۳)

دریاباد

۳۰جنوری ۱۹۶۹ء بسم اللہ

برادرم! وعلیکم السلام

کل صبح آپ کے بھائی صاحب کے سلسلے میں عیادت نامہ بھیج چکا تھا کہ شام کی ڈاک سے وہ خط ملا جس نے تعزیت نامہ کو واجب کر دیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

بھائی کی چوٹ بھی بڑی سخت چوٹ ہوتی ہے اس کا ذاتی تجربہ بھی رکھتا ہوں۔ ہر مسلمان کی موت یوں بھی مبارک ہوتی ہے۔ بہرحال ان کے آخر وقت کے حالات جو آپ نے لکھے ہیں، اللہ بال بال رحمت فرمائے۔ دمہ کا مرض مشابہ سکرات ہوتا ہے۔ کتنے گناہ اس موذی مرض سے دُھل گئے ہوں گے۔ میرے مرحوم بھائی کو بھی یہی مرض عمر بھر رہا تھا۔

والسلام، دُعاگو؛

عبدالماجد

شفاء الملک حکیم عبداللطیف (لکھنؤ) (۱)

حکیم صاحب کے بڑے بھائی حکیم عبدالمعید کے انتقال پر مکتوب تعزیت۔ حکیم صاحب مرحوم نے والد کے انتقال کے بعد شفاء الملک کی مثل اولاد کے پرورش کی تھی اور تعلیم و تربیت کی نگہداشت کی تھی۔

طبیب ابن طبیب کی مراجعت وطن حقیقی پر ہدیۂ تعزیت قبول ہو۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ جو خدمتِ خلق کرتے کرتے بڑھا ہو گیا وہ بالآخر اس شافی برحق کے دربار میں پہنچ گیا جہاں آگے پیچھے ہم سب ہی پہنچ رہے ہیں۔

موئے سفید، بیٹ کا مرض اور عشرہ مبارک ذی الحجہ، بے شمار مریضوں کی دعائیں سب کی سب شافع برحق کی قیادت میں ارحم الرّاحمین کی طلب رحمت کو موجود فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ کا مژدہ کانوں تک کب کا پہنچ چکا ہوگا۔

بھائی کا رشتہ خود کیا کم ہوتا ہے اور آپ کے حق میں تو وہ مرحوم بمنزلہ والد کے تھے۔ طبعی غم و صدمہ جتنا بھی ہو بجا ہے۔

وَالسَّلام، دُعاگو؛

عبدالماجد

(۲)

دریاباد
یکم اپریل ۱۹۶۸ء

بسم اللہ

کرم گستر! اَلسَّلام علیکم

"العلم" کراچی والے سید الطاف علی کا عیادت نامہ آیا! خط کے آخر میں لکھتے ہیں "آپ کے معالج حکیم عبداللطیف سے مجھے بھی نیازمندی حاصل تھی میرا سلام قبول فرمائیں وہ ضرور اپنے کمالات لطیف کا

پورا حصہ آپ کے علاج میں صرف فرمائیں گے۔"

جواب میں انہیں لکھ بھیجوں گا کہ "فن لطیف" بہ نظر اگرچہ "الطاف" کی بھی نہ پڑے گی تو کس کی پڑے گی۔

وَالسَّلام، دُعاگو و دُعاخواہ؛

عبدالماجد

وفا ملک پوری (پٹنہ) (۱)

دریاباد
۱۴ اپریل ۱۹۶۶ء

برادرم! وعلیکم السلام

شاعر تو یہاں تک کہہ گیا ہے ع

مکیں کی خیر ہو یارب مکاں رہے نہ رہے

اور "کاشانۂ وفا" تو شاعری کی دنیا میں جلنے اور برباد ہونے کے لیے تعمیر ہوتا ہے۔ خیر ہم سوختہ دل یہاں تک تو نہیں جا سکتے بلکہ خیر مکین و مکان دونوں کی مناتے رہتے ہیں۔

تاہم اس پر تو شکر ہی بھیجے کو جی چاہتا ہے کہ جانیں محفوظ رہیں اور مکان کا بھی ایک حصہ اور مذہب کی یہ آواز کان میں اگر تسکین دے جاتی ہے کہ کسی نیک تعزیت سے جو بھی مصیبت آئے اس سے بندے کے گناہ دُھلتے اور مرتبے بلند ہوتے رہتے ہیں۔

والسلام، دعاگو؛

عبدالماجد

(۲)

دریاباد
۱۵ دسمبر ۱۹۶۹ء

بسم اللہ

مکرم بندہ! اَلسّلام علیکم

آپ کا تازہ رسالہ دو ایک دن سے آیا ہوا تھا آج اتفاق سے پہلے صفحہ پر نظر پڑ گئی۔ رفیق زندگی کی جدائی خود ہی کیا کم حادثہ ہے۔ کہنا چاہیے کہ یہ ترام الصدمات ہے چہ جائیکہ اور بھی قریب کے عزیز ایک ایک کر کے اٹھ جائیں اور دوسرے مصائب کا بھی اجتماع ہو جائے اللہ ہی آپ کے دل کو سنبھالے رکھے۔

مومن کے لیے تو ہر غیبی صورت محض صبر بہ صورت قہر ہوتی ہے، ہر ایک کا پورا اجر موجود ہے دُنیا

کی راحتوں، لذتوں کا کوئی مقابلہ ہی ابدی راحتوں اور لذتوں سے نہیں اور یہ اضطراری مجاہدے جو کرائے جاتے ہیں سب اسی جنت کے لیے ہیں جو ہر کلمہ گو کی منزل مقصود ہے۔

اللہ ہم کو، آپ کو، سب کو اس گہری حقیقت کا حقیقی احساس عطا کرے اس کے بعد ہر تلخی انشاء اللہ شیریں بن کر رہے گی۔

والسلام، دُعاگو،

عبدالماجد

<u>سید الطاف علی بریلوی (کراچی)</u>

عبدالمجید قریشی سے مراد علی گڑھ یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ ریاضی کی طرف ہے۔ مولانا دریابادی علیل تھے اور لکھنؤ میں مقیم اور شفاء الملک حکیم عبداللطیف کے زیر علاج تھے۔ خط کی آخری سطروں میں اشارہ اسی طرف ہے۔

لکھنؤ

۲۰ اپریل ۱۹۶۷ء

بسم اللہ

برادرم ! السلام علیکم

یہ آپ کے پروفیسر عبدالمجید صاحب قریشی تو بڑے چھپے رستم نکلے اور آپ نے انہیں خوب ڈھونڈھ نکالا۔ تھوڑی بہت نیازمندی مجھے بھی ان سے حاصل تھی اور اسی واقفیت کی بناء پر انہیں ایک مرد مسلمان اور علیگڑھ کا عاشق اور بڑا مخلص کارکن سمجھے ہوئے تھا اُن کی ادبیت کے جوہر تو آج پہلی بار کھلے۔

"العلم" کے تازہ نمبر نے تو انہیں دنیا سے روشناس ایک ادیب اور ایک مشاق اہل قلم کی حیثیت سے کر دیا اور اس انکشاف کا سہرا "العلم" کے "الطاف" کے سر رہا۔ ماشاء اللہ خوب لکھتے ہیں اور فارسی شعر و ادب سے تو ان کے اس ذوقِ لطیف کا میں ایک ریاضی داں سے تصور ہی نہیں کر سکتا تھا، اللہ انہیں عمرِ نوح عطا کرے اور آپ اسی طرح ان سے خزانے اگلواتے رہیں۔

ضمناً ایک بات میرے کام کی ان کے ہاں خوب مل گئی یعنی سید بدل الرحمٰن کا ٹوٹا پھوٹا پتا۔ اسکول کے زمانے کے ساتھیوں اور مخلصوں میں تھے۔ اب تو ان کی طرف سے بالکل مایوس ہو چکا تھا ۶۰، ۷۰ سال بعد آپ نے یہ خوشخبری سُنائی۔

آپ کا اداریہ بھی خاصا دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ مرد دنیائی تو تاریخ، ادب، فلسفہ، سائنس سارے ہی علوم کا جوہر ہے۔

یہ خط ختم ہو چکا تھا کہ عیادت نامہ پر نظر پڑی جزاک اللہ، اب تو کچھ اور مہلت زندگی کی مل گئی حکیم صاحب سے "فنِ لطیف" پر نظر اگر الطاف کی نہ پڑے گی تو اور کس کی پڑے گی ان کو بھی اس کی اطلاع کرا دوں گا۔

والسلام، دُعاگو:

عبدالماجد

<u>مولانا شاہ سراج الحق مچھلی شہری (الٰہ آباد)</u>

دریاباد

۲۰ مئی ۱۹۶۸ء

بسم اللہ

برادرم ! السلام علیکم

وہ گمشدہ کارڈ بحمد اللہ مل گیا اور میری تجاہلت بڑی حد تک دور ہو گئی۔ میز ہی پر نسلاً اور بے خطوط و کاغذات میں دب گیا تھا۔

پانچوں رباعیاں از سر نو پڑھ لیں۔ ماشاء اللہ و سبحان اللہ گویا قفل ابجد کی کلید! ایسے شاعر کا خود اپنے کو ابجد خواں سمجھنا خود ایک شاعری ہے کاش ایسے ابجد خواں بہت سے ہوتے۔ تیسری رُباعی کا کیا کہنا آنکھیں روشن کر دیں۔

یہ مشق فرور جاری رکھیے، بہت سی ہو جائیں تو مجموعہ انشاء اللہ بہت کارآمد نکلے گا، اور حضرت سراج کا چراغ بعض پرانے رُباعی گویوں کی طرح مدتوں انشاء اللہ روشن رہے گا۔

والسلام، دُعاگو و دُعا خواہ:

عبدالماجد

<u>شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا (سہارنپور)</u>

لکھنؤ

۷ اکتوبر ۱۹۶۵ء

بسم اللہ

حضرت والا ! السلام علیکم

مدینہ منورہ کا تحفہ یوں ہی کیا کم قابلِ قدر تھا چہ جائیکہ بشیخ الحدیث کے واسطہ کرم سے اِدھر کھجوروں کی حلاوت اور مٹھاس اُدھر آنجناب کا جذبۂ اخلاص اب سراپا سپاس بن کر رہ جاؤں تو

اور کیا ہوا۔

سرزمین حجاز سے مادی تحائف میں بھی دو بہترین نعمتیں ہیں، نمبر اول پر آب زمزم اور پھر یہی خرمائے محترم۔

بہرحال یہ تبرک پا کر دل باغ باغ ہوگیا اور زبان ہی سے نہیں کہنا چاہیے کہ روئیں روئیں سے آپ کے حق میں دعائے خیر نکلی۔ والسلام، دُعاگو و دعاخواہ،

عبدالماجد

ڈاکٹر اسرار احمد (لاہور)

دریاباد

۱۱ نومبر ۱۹۶۸ء بسم اللہ

صاحب من ! السلام علیکم

"میثاق" بابت نومبر پیش نظر ہے صفحہ ۱۴

تحسین ناشناس کا ڈر نہ ہوتا تو دل نے بے اختیار یہ صلاح دی کہ اس ساری عبارت پر ایک خوب بڑا سا صاد کھینچ کر بھیج دیجیے سبحان اللہ و ماشاءاللہ

ع دل نے یہ جانا کہ یہ سب کچھ بھی میرے دل میں تھا[1]

حیرت ہوتی کہ شبلی، فراہی، ابوالاسلام تینوں کی نباضی بُعدِ زمان و بُعدِ مکان دونوں کے باوجود اتنی صحیح کیونکر کرلی۔

ع درحیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

ڈاکٹر رفیع الدین کا بھی مقالہ اس نمبر میں بڑا قابلِ داد ہے۔

والسلام، دُعاگو و دُعاخواہ،

عبدالماجد

---

[1] پورا شعر اور مصرع کے صحیح الفاظ یہ ہیں:۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

شفیق احمد (گلبرگہ)

دریاباد

۱۴ فروری ۱۹۷۰ء بسم اللہ

"فضائل الخیرات" کے فضائل وخیرات پر کچھ لکھنا سورج کو چراغ سے دکھانا، بات سورج کی طرح روشن ہے۔

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

جس کو جو کچھ ملا ہے نبی ہی سے ملا ہے۔

مبارک ہیں وہ جنہیں اس کی خدمت کی بھی توفیق ہو جائے۔ والسلام

عبدالماجد

شہباز حسین (ایڈیٹر آجکل دہلی)

ماہنامہ "آج کل" دہلی میں مشاہیر اہلِ قلم کے خود نوشت حالات کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا گیا تھا۔ مولانا دریابادی کی خود نوشت "داستانِ حیات" اسی سلسلے میں طلب کی گئی تھی۔

دریاباد

۶ مئی ۱۹۷۶ء

مکرم نیاز کیشاں ! وعلیکم السلام

حکم نامہ پہنچا حیرت ہی ہوگئی۔ ایک بے کمال کیسے باکمالوں کی بزم میں قدم رکھے اور اپنی "داستانِ حیات" ہنرمندوں کو سنائے۔

لیکن بہرحال فرمائش ایک "شہباز" کی زبان سے ہوئی ہے "گنجشک" غریب میں یہ تاب و توانائی کہاں کہ سرتابی کرے۔ انشاءاللہ تعمیل جوں توں ہو کر رہے گی۔ ہفتہ عشرہ کی مدت میں۔ والسلام

دُعاگو و دُعاخواہ:

عبدالماجد

نند کشور وکرم (نائب مدیر "آجکل" دہلی)

نیاز حسین ایڈیٹر "آجکل" نے مولانا کے خود نوشت حالات کے لیے جو درخواست کی تھی، مولانا نے اسے قبول کر لیا تھا اور تعمیل ارشاد کر دی تھی، اب حالات کے ساتھ صاحب حالات کی تصویر چھاپنے کے لیے تصویر کی فرمائش کی تھی، مولانا نے تصویر کی فراہمی سے معذرت کر لی۔

دریاباد

۲۵ جون ۱۹۷۰ء

بسم اللہ

مہربان بندہ! آداب و تسلیمات

ع عشق و مزدوریٔ عشرت گہ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامیٔ فرہاد نہیں

اس تشہیر اور خود نمائی کی فرمائش مجھ زشت رو سے! جسے آئینہ میں بھی اپنا عکس دیکھنا گوارا نہیں۔ حیران ہوں کہ تعمیل سے معذرت کن الفاظ میں پیش کروں۔

دعا گو و دعا خواہ:

عبد الماجد

مہذب لکھنوی (لکھنؤ)

(۱)

لکھنؤ

۱۷ اکتوبر ۱۹۷۰ء

بسم اللہ

کرم گستر! تسلیم

(۱) لکھنؤ کے عوام کی زبان سے بارہا یہ محاورہ سننے میں آیا کہ "وہ مجھ سے بھی چار جوتے آگے ہے" چار جوتے بجائے چار قدم چار ہاتھ کے۔ آپ کے لغت میں جوتے کا یہ تصرف دیکھنے میں آیا۔

(۲) "چھیل چھبیلا" دکانداروں کی زبان ہے چھبے دان یا موکش دان ہی کے معنی میں مستعمل ہے۔

(۳) سیتاپور ہائی اسکول میں میرے عربی کے استاد ایک لکھنوی سید عبید حسین نامی تھے ان کی زبان پر "۱۱،۲۰" کا تلفظ برابر گیارہ، بارہ، دونوں کو بی غنہ کے ساتھ رہا کرتا تھا، شاید لکھنؤ کے بعض محلوں کا لہجہ یہی ہو جیسا کہ دہلی کے بعض طبقات یا بعض محلوں کا ہے۔

والسلام، دعا گو:
عبد الماجد

(۲)

دریاباد

۱۶ ر دسمبر ۱۹۷۰ء

بسم اللہ

مخدوم و مکرم! السلام علیکم

مرزا رسوا کے امراؤ جان ادا کے صـ۲۳ کے شروع میں "سلام" مؤنث چھپا ہے "لوگ انہیں ...جھک کر سلامیں کرتے تھے" (مطبوعہ ہمدم برقی پریس) دوسرے ایڈیشنوں میں بھی یہی فقرہ ...یہ موجود ہے۔

تو کیا کوئی قول "سلام" کی تانیث کا بھی ہے یا یہ محض سہو کتابت ہے۔ خدا کرے آپ ہر طرح ...یت ہوں۔

والسلام

عبد الماجد

...عدل (ایڈیٹر "نقوش" لاہور)

دریاباد

۲۹ ر دسمبر ۱۹۷۰ء

بسم اللہ

برادرم! وعلیکم السلام

عنایت نامہ کچھ روز ہوئے مل گیا تھا جواب دیتا تو کچھ ذہن سے اتر گیا اور کچھ اس سوچ میں ...بھی پڑا رہا کہ آخر لکھوں تو کیا لکھوں۔

کوئی دو برس ہو گئے کہ نہ آپ کی طرف سے کچھ چھپا ہوا، یہ زرہ کوئی اخبار، رسالہ یا کتاب بھیجی ...ہے اور نہ اِدھر سے اُدھر۔

ع جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

ایک آدھ صاحب نے ہمت کر کے اپنی ڈاک کابل اور لندن سے روانہ کرائی وہ تو البتہ مل گئی، ...ظاہر ہے کہ اتنی ہمت ہر ایک کہاں سے لا سکتا ہے۔

اب بظاہر زندگی بھر ملاقات کی کیا صورت۔

رشید صدیقی سے ملاقات مدتوں کے بعد ہوئی، بیچارے آنکھوں کی شکایت میں مجھ سے ...ں بڑھ کر مبتلا، میں تنے شایدان سے کبھی ہم چشمی کا دعویٰ کیا ہو قدرت نے اچھی ہم چشم نمائی میری کر دی۔

دل اس کی داد آپ کے سے مبصر سے چاہتا ہے!

لاہور کے بہت سے دوست احباب زندہ و مرحوم یاد آتے ہیں خصوصاً رئیس جعفری مرحوم

والسلام، دُعاگو و دُعاخواہ:

عبدالماجد

عبداللہ (شاہ گنج، جونپور)

دریاباد

۴ر نومبر ۱۹۷۰ء

بسم اللہ

مکرم بندہ! وعلیکم السلام

(۱) "میں لکھنے جا رہا ہوں" فقرہ صحیح ہے، پرانے ادیبوں کے ہاں یہ ترکیب نہ تھی اب عام رائج ہے۔ "جانا" ایک معنی "ارادہ کرنا، آمادہ ہونا، سامان مہیا کرنا" سب اردو میں داخل ہو گئے؛

(۲) "مشکور" شاکر کے معنی میں بہ قاعدۂ عربی غلط ہے۔ لیکن اردو میں عوام ہی نہیں خواص زبان پر بھی کثرت سے آنے لگا ہے۔ اب اسے اردو میں غلط کہنا مشکل ہو گیا ہے، میں خود احتیاط کرتا ہوں اور اس کے بجائے "ممنون" یا "شکر گزار" لکھ دیتا ہوں۔

سب قاعدوں سے مقدم اہل زبان کا استعمالی محاورہ و روزمرہ ہے۔

والسلام

عبدالماجد

سید ظہور الاسلام ندوی (علی گڑھ)

دریاباد

۱۴ر دسمبر ۱۹۷۱ء

بسم اللہ

عزیزم! وعلیکم السلام

"انجب" تو اردو لفظ ہے (آیا جس زبان سے بھی ہو) پہلے آرزو ہی کے لغت میں دیکھنا تھا عربی میں، بعض الفاظ ایسے بھی زبان میں ہوتے ہیں جو عوام یا خواص کے کسی بہت محدود طبقہ کے اندر رہتے ہیں، عام استعمال میں نہیں آتے اور اسی لیے لغت تک بار نہیں پاتے۔

"انجب" بھی اسی قسم کا معلوم ہوتا ہے، عامیانہ تو ہے ہی ساتھ بہت قلیل الاستعمال اور صرف الٹے معنی میں ہے جیسے "ذات شریف"، "شریف" کے معنی میں "بڑے حضرت ہیں"، "شریر النفس" کے معنی میں محاورہ آگیا ہے کم نصیبی سوار ہوگئی ہے۔

شاید تحریری زبان میں "انجب" کہیں بھی استعمال نہیں ہوتا ہے اس لیے اہل نظر لغت کی نظر سے چوک گئی۔

کتاب محمد مکی صاحب کو پہنچ گئی ان شاء اللہ گنجایش نکلتے ہی تعارف "صدق" میں آجائے گا۔

والسلام، دُعاگو:

عبدالماجد

حضرت علی صدیقی (ایڈیٹر "قومی آواز" لکھنؤ) (۱)

صدیقی صاحب کے والد ماجد کے انتقال پر یہ تعزیت نامہ تحریر فرمایا۔

دریاباد

۱۶ر فروری ۱۹۷۲ء

بسم اللہ

عزیزم! السلام علیکم

سفر میں تھا، دریاباد پہنچ کر ۱۳ کا "قومی آواز" نظر سے گزرا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔ مرحوم کے حق میں دُعائے مغفرت کر دی۔ والدین کی نعمت تو ایسی دولت ہے جس کا نعم البدل کیا معنی بدل بھی ممکن نہیں۔ اور اولاد کا سن کچھ بھی ہو جائے آن کے دم تک وہ لڑکا ہی رہتا ہے اور بہیودہ فکروں سے آزاد۔

اللہ مرحوم کو غریقِ رحمت کرے اور آپ لوگوں کو توفیقِ صبر دے۔

والسلام، دُعاگو و دُعاخواہ:

عبدالماجد

(۲)

دریاباد

۴ر جون ۱۹۷۲ء

بسم اللہ

عزیزم! السلام علیکم

"قومی آواز" ۲۰ جون سنہ کے ۲ لفظ زیر ہیں۔[1]

"ممکن ہو سکے گی!"

ترکیب غلط ہے "ممکن" اور "سکنا" ساتھ نہیں آسکتا۔ یا تو "ممکن ہوگی" لکھیے یا صرف "ہو سکے گی"۔

والسلام

عبدالماجد

(۳)

لکھنؤ

۱۶ اپریل ۱۹۷۳ء — بسم اللہ

عزیزم! السلام علیکم

خدا کرے اب شفائے کامل ہو گئی ہو، حکیم عبدالقوی سے حادثے کا حال سخت افسوس کے ساتھ سنا بعد کو فاقہ بھی معلوم ہو گیا تھا خدا کرے اب بالکل ہی صحت ہو۔

آپ کے اخبار میں ایک تکلیف دہ اور غلط لفظ برابر نکل رہا ہے "جسم فروشی" غلط اس لحاظ سے کہ عورت اپنا جسم نہیں بیچتی ہے جسم کا صرف ایک محدود حصہ عصمت بیچتی ہے اور صحیح نام اس کے بیچنے کا عصمت فروشی ہر لغت میں موجود ہے۔

دوسرا غلط ایسا ہی لفظ "بدسلوکی" آپ کے یہاں چلا ہوا ہے Misbehaviour کے معنی ہو صحیح ایک بالکل دوسرے موقع کے لیے اس خاص معنی کے لیے اردو میں ایک نہیں متعدد لفظ چلے ہوئے ہیں "منہ کالا کرنا"، "فحش کاری، گناہ، بدکاری، آبروریزی، بدفعلی"۔

سائن بورڈوں میں اب تک اردو کو جگہ نہ ملی، نہ تو صوبہ کانگریس کمیٹی کے دفتر نہ ضلع کانگریس کمیٹیوں کے دفتر میں لکھنؤ سی کمیٹی کو مستثنیٰ کر کے۔

والسلام

عبدالماجد

(۴)

دریاباد

۷ جولائی ۱۹۷۳ء — بسم اللہ

برادرم! وعلیکم السلام

Homosexuality کا ترجمہ آپ کے ہاں "ہم جنسی یا ہم جنسیت" بالکل غلط شروع

[1] مراد "قومی آواز" سے۔

ہو گیا ہے، ہم جنس sex کے معنی میں سرے سے ہے ہی نہیں، یہ تمام تر نوع کے مفہوم میں ہے۔ عربی کے چلے ہوئے لفظ اغلام یا لواطت یا پھر طبی اصطلاح استلذاذ بالمثل ورنہ پھر بازاری لفظ لونڈے بازی سے کام چلائیے، ثقاہت رہیں اگر قلم اپنائیے تو امرد پرستی میں آخر کیا عیب ہے۔

انشاءاللہ اب پیر کی چوٹ بالکل ہی ٹھیک ہو گئی ہوگی۔

والسلام

عبدالماجد

حکیم عبدالحمید (دہلی)

(۱)

دریاباد

۱۴ اکتوبر ۱۹۷۲ء — بسم اللہ

برادرم! السلام علیکم

اس عریضہ کے حامل عبدالعلیم قدوائی ایم اے ایل ایل بی ہیں، میرے بھتیجے بھی اور داماد بھی۔ محکمہ انڈسٹریز میں کارگزار ہیں، ابھی کانپور سے دہلی تبدیل ہوئے ہیں، حکیم عبدالقوی دریابادی کے چھوٹے بھائی بھی ہیں۔

مکان کی سخت مصیبت ان کے لیے ہے جیسی ہر باہر والے کو دلی میں ہوتی ہے، کوئی کسی کو کیا لکھے اور کس سے کیا کہے، جو حاجت روا تھے وہ خود حاجتمند بن گئے ہیں، مولوی اپنے پوتوں سے بھاری۔

ع کس کی حاجت روا کرے کوئی

آپ نے ایک عالم کی ہمدردی کا بیڑا اٹھایا ہے۔ یہ حاضر خدمت ہو رہے ہیں کہ شاید اس ذخیرہ میں ان کے نصیب کا بھی کوئی حصہ ہو اور تھوڑی سی مدد انہیں بھی مل جائے، یہ تعارف لکھ دیتے ہوئے خود ہی شرم سے گڑا جا رہا ہوں۔

انشاءاللہ آپ ہر طرح بخیر ہوں گے۔

دعاگو و دعاخواہ:

عبدالماجد

عبداللطیف اعظمی (دہلی)

(۱)

دریاباد

۱۴ اکتوبر ۱۹۷۳ء — بسم اللہ

عزیزم ! وعلیکم السلام

خیر میں ادیب و دبیر تو گیا "بزرگ ترین نہیں"، "خورد ترین" بھی نہیں البتہ آپ کے حسن ظن کی لاج رکھتے ہوئے تعمیل ارشاد میں جواب لکھے دیتا ہوں۔

جی ہاں رسالہ جامعہ میں "عش عش" کی بحث میں نے دلچسپی سے پڑھی اور استفادہ کیا، میرا معمول تو ابھی تک "عش عش" لکھنے کا تھا، فیلن نے بھی یہی دیا ہے۔

الشکسے کے نفس اللغۃ کی ردیف الف مطبوعہ موجود ہے اس میں "اش اش" موجود نہیں اس لیے قیاس یہی ہوتا ہے کہ انہوں نے بھی اسے ردیف عین ہی میں رکھا ہوگا۔ "اشتقاق" کی بحث کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتی، لیکن اصل جواب فصحا اور شرفائے ادب کے لحاظ کا ہے، میں اب تک استعمال غالب "مع" کا سمجھ رہا تھا، اب اس بحث سے معلوم ہوا کہ دوسرے فریق کے دلائل بھی خاصی قوت رکھتے ہیں ایسے موقع پر توسع اختیار کرنا چاہیے جیسا کہ تذکیر و تانیث کی بحثوں میں ہوتا ہے، اس لیے میں تو "ع" ہی سے بدستور لکھے جاؤں گا لیکن جو حضرات الف سے لکھیں گے اسے بھی غلط نہیں سمجھ سکتا بلکہ عش عش کی طرح "اش اش" کو بھی جائز سمجھوں گا۔

والسلام

عبدالماجد

(۲)

سیدہ سلامت اللہ کا ایک نہایت عمدہ مضمون "مجتہد اور مجاہد ابو الکلام آزاد" کے عنوان سے جامعہ، دہلی بابت ماہ رجولائی ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعض خیالات پر مولانا دریابادی نے ایڈیٹر جامعہ کے نام ایک خط میں نقد کیا تھا۔ ایڈیٹر جامعہ نے یہ خط اگست کے شمارے میں شائع کر دیا تھا۔ تعاقب میں ان کا ایک نوٹ بھی تھا۔ ذیل میں مولانا دریابادی کا یہ خط پیش خدمت ہے۔ ساتھ میں ایڈیٹر کا نوٹ بھی نقل کر دیا گیا ہے۔

جناب من ! السلام علیکم

تازہ جامعہ میں ایک مضمون مولانا ابو الکلام مرحوم پر ایک خاتون کے قلم سے ہے۔ موصوفہ کے جذبات و معتقدات جو کچھ بھی ہوں یہاں صرف ان "واقعات" سے متعلق کچھ کہنا ہے، جو صفحہ ۷،۴ پر درج ہیں۔ میں خود شریک جلسہ تھا۔ ان چیزوں کے یوں ہی چھپ جانے سے آپ کے پرچے کی ثقاہت پر حرف آتا ہے۔ اور تردید نہ کی جائے تو یہی چیزیں آگے چل کر تاریخ بن جائیں گی۔

(۱) "مسلم لیڈروں کا ایک جم غفیر تھا جو اس مسئلہ پر غور کرنے کے لیے لکھنؤ میں جمع ہوا تھا"——

یہ جلسہ ایک باقاعدہ اجلاس مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کا تھا، جس کے ممبر عوام و خواص، نرم و گرم ہر قسم اور ہر طبقہ کے لوگ تھے۔

(۲) "رات کو گرما گرم بحثیں ہوئیں"—— اجلاس کی کوئی بھی نشست رات کو نہیں ہوئی تھی۔ ہر نشست دن ہی میں ہوئی تھی۔

(۳) "نواب اور راجہ لوگ حکومت وقت کی طرف سے اس خدمت پر مامور کیے گئے تھے"—— اس "ماموریت" کا کوئی ثبوت شرعی، اخلاقی، قانونی، کسی معیار سے بھی موجود نہیں۔ نواب اور راجہ لوگ بھی سیکڑوں (بلکہ شاید ہزار سے اوپر) کے مجمع میں بس گنتی ہی کے چند شریک تھے۔

(۴) "نہ جانے بقیہ شب کی تاریکی میں کون سا افسوں پھونکا گیا"—— شب و بقیہ شب کی حیثیت تو محض افسانوی ہے۔ باقی "افسوں" اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ تمام لوگ کل کے جلسہ کے ہڑبونگ اور خلفشار سے اکتا گئے تھے اور یہ طے کر کے بیٹھے تھے کہ آج کوئی نہ کوئی فیصلہ بہر حال کر لینا ہے۔

(۵) "اب ان کے سر حکومت کی ڈیوڑھی پر جھکے ہوئے تھے"—— حکومت کی ڈیوڑھی پر سر جھکنے کا قطعاً کوئی سوال ہی پیش نہیں آیا۔ مولانا محمد علی کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ بحث بحثی اور بے نتیجہ حجت بازی تو کبھی ختم ہونے والی نہیں۔ کام اگر کرنا ہے تو اس بڑے مجمع سے اپنے چند قابل اعتماد نمایندے چن لیجیے۔ اور انھیں سادہ چک دے کر حکومت سے نلمہ و پیلم کا کام ان کے سپرد کر دیجیے۔ چنانچہ میں رزولیوشن اسی مضمون کا پیش کرتا ہوں۔

(۶) "ایک آزادی وہ شمع تھے، جس کو نہ کوئی لالچ نہ کوئی دھمکی بجھا سکی تھی"—— موصوفہ یقین فرمائیں کہ جلسے میں نہ کسی لالچ کا سوال کسی طرف سے پیش ہوا، نہ کسی دھمکی کا۔ دونوں فریق صرف اپنے اپنے دلائل پیش کرتے رہے۔

(۷) "یو پی کا گورنر بھی بطور اعزازی مہمان کے موجود تھا"—— اس افسانہ کو واقعیت سے کوئی تعلق نہیں۔ لفظی ترمیم، لفٹیننٹ گورنر، بجائے گورنر کے۔

(۸) "اس کی موجودگی میں بڑے بڑے شیر دل لیڈروں کے ضمیر بجھ چکے تھے..... اکابر ملت در ذو ساء قوم جو گورنر صاحب کے چشم و ابرو کو دیکھ رہے تھے بوکھلا اٹھے"

سو فیصدی شاعری۔

(۹) "سیاسی شہدوں نے مولانا پر آوازے کسے"—— وہ کون لوگ تھے، جنھیں یہ مہذب خطاب عطا ہوا ہے؟

(۱۰) "بالآخر مولانا یہ کہہ کر اسٹیج سے رخصت ہو گئے کہ آج اس اسٹیج پر تم میری زبان کو روک

سکتے ہو، لیکن دیکھنا ہے میرا قلم کون روک سکے گا"ـــــ الفاظ حقیقت و واقعیت سے یکسر بے نیاز!

والسلام، عبدالماجد

(جامعہ) ہم مولانا کے شکر گزار ہیں کہ موصوف نے تصویر کا دوسرا رخ پیش کر دیا، لیکن جو رخ زیرِ بحث مضمون میں دکھایا گیا ہے، وہ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا شبلی اور نواب وقار الملک کے مشہور بیانات پر مبنی ہے جس کا ثبوت ہم آگے چل کر پیش کرتے ہیں، اس لیے رسالہ جامعہ میں اس مضمون کا شائع ہونا قابلِ اعتراض نہیں ہے۔ البتہ مضمون کا یہ جملہ کہ "سیاسی شہدوں نے مولانا پر آوازے کسے" ضرور رسالہ جامعہ، زیرِ بحث جلسے اور خود مضمون نگار کے وقار کے خلاف ہے ہم اس کوتاہی کا اعتراف کرتے ہیں کہ مضمون کے پڑھتے وقت اس جملے پر نظر نہیں پڑی اور یہ بجنسہٖ رسالہ میں چھپ گیا......

(۱) جلسے کے بارے میں مولانا آزاد فرماتے ہیں۔ "صبح آٹھ بجے ہی سے اجلاس کا ہال تماشائیانِ بزم سے بھر گیا...... یہ بھی خبر اڑی تھی کہ ایک جماعت کل کے لیے باہر سے ٹھیکے پر بلائی گئی ہے۔"

(الہلال۔ ۵ مارچ ۱۹۱۳ء صفحہ ۱۲۶)

(۲) یہ صحیح ہے کہ رات میں کوئی نشست نہیں ہوئی تھی۔ لیکن دن کے باقاعدہ جلسوں کے لیے رات ہی میں مشورے بلکہ فیصلے ہوا کرتے تھے۔ نواب وقار الملک مشتاق حسین صاحب نے جو اس وقت جلسے کے آنریری سکریٹری کے فرائض انجام دے رہے تھے، اپنے تحریری بیان میں اس کا صراحت سے ذکر کیا ہے اور مولانا آزاد نے اس کے بارے میں خوب خوب طنزیہ جملے لکھے ہیں۔ آخری فیصلہ سے قبل گورنمنٹ ہاؤس میں ایک ڈنر بھی دیا گیا تھا اور اس موقع پر بھی بڑی رات تک "مشورے" ہوتے رہے۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں: "خود صحبت آزمایانِ شبینہ کا بیان ہے کہ یہ بادہ گساری رات کے دو بجے تک جاری رہی تھی۔ اللہ اللہ!! جاڑے کی راتیں اور پچھلے پہر کی "پر اسرار" صحبتیں!! آپ الزام و اعتراض کی فکر میں ہیں اور "رات کے دو بجے" کے لفظ سے نہیں معلوم کیسے کیسے خیالات میرے دماغ میں گزر رہے ہیں! رات کی تاریکی، پچھلے پہر، رندانِ شاطر و کہنہ مشق کا ہجوم اور بعض نوجوان نو آموز مدعیانِ حریت و بصر شغلی مے پرستی کا یہ عالم! اسے کیا کہوں کہ کیا کیا کہنا چاہتا ہوں۔"

مولانا محمد علی کے بارے مولانا آزاد لکھتے ہیں: "راجہ صاحب نے کہا تھا کہ جب تک مسٹر محمد علی رام نہ کیے جائیں گے، کچھ نہیں ہو گا۔" یہی سبب ہے کہ اس "خلوتِ شب" کی پدرات کا مورد اُنہی کو بنایا گیا تھا۔ اور رات بھر "مبہرے" کی تنز تمیں و آرائش میں صرف ہو گئی۔"

دوسرے روز جلسہ شروع ہوا تو اس کے متعلق مولانا آزاد اپنے مخصوص طرز میں لکھتے ہیں:

"یہاں تک کہ دس بجے۔ صدہا نظرہائے منتظر، اور صداہائے مضطرب کی صفوں سے گزرتی ہوئی "ارباب حل و عقد" کی قطار جلوہ فروش ہوئی اور "مجلہ سازش"[1] کے تمام "عروسانِ شب زندہ دار" ایک ایک کر کے نظر نوازِ جرم و انجمن ہو گئے۔ چہروں نے پہلی ہی نظر میں ارباب نظر سے رمز فروشی کی کہ رات بھر میں رنگ بدل چکے ہیں...... انہی میں ہمارے شیوہ طراز دوست مسٹر محمد علی بھی تھے۔ صحبتِ نیم شبی کا خمار آنکھوں میں، اور شب بیداری کی افسردگی چہرے پر۔"

(۳) "اس بات کا ثبوت دینا کہ کچھ لوگ حکومت کی طرف سے مامور کیے گئے تھے کہ کسی نہ کسی ترکیب سے سرکاری نقطۂ نظر کو جلسے میں منوا لیں۔ واقعی ممکن نہیں۔ لیکن نواب وقار الملک نے "سازش" کا لفظ لکھا ہے۔ مولانا شبلی نے اپنی مشہور طنزیہ نظم میں اسی لفظ کو اس موقع پر استعمال کیا ہے:

"سازش" کا ایک جال بچھایا ہے ہر طرف ۔۔۔ ہر شخص اس کی فکر میں مصروفِ کار ہے۔
سرسنیاں ہیں وعدۂ قدرتہائے راز کی ۔۔۔ ہر شخص "حکمتِ عملی" کا شکار ہے

(۴) لفٹیننٹ گورنر بہادر کے ڈنر سے قبل عام طور پر تقریروں کا لب و لہجہ حکومت کے سخت خلاف تھا اور ڈنر کے دوسرے دن اجلاس کا رنگ کچھ اور ہی تھا، اس لیے لوگوں نے اس طرح کے شبہے کیے ہیں۔ مولانا شبلی نے بھی اس تبدیلی پر حیرت ظاہر کی ہے

یا صبح دم جو دیکھیے آ کر تو بزم میں ۔۔۔ نے وہ خروش ہے جوش نہ وہ گیر و دار ہے
ٹوٹی ہوئی صفیں ہیں، علم سرنگوں ہیں سب ۔۔۔ بازوئے تیغ گیر جو تھا رعشہ دار ہے

(۵) قابلِ اعتراض جملے پر ہم شروع ہی میں معذرت کر چکے ہیں۔ لیکن موصوف غالباً جس کیفیت کو بیان کرنا چاہتی ہیں اسے مولانا آزاد نے یوں لکھا ہے:

"...... اس محاصرے کی صفوف کی وجہ سے راہ مرور اس طرح بند ہو گئی تھی کہ وہاں تک پہنچنے کے لیے کئی منٹوں کی جدوجہد مطلوب تھی۔ خود ہم اور خواجہ غلام الثقلین اگر اتفاق سے بالکل اسٹیج کے کنارے پیشتر ہی سے بیٹھے ہوئے نہ ہوتے تو تقریر کرنے کا موقع ہی نہ ملا ہوتا...... ایک اور تدبیر خاص وہ تھی، جس کے ذریعہ موافقت کے تیرز اور مخالفت کا شور و ہنگامہ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تھی، یعنی اسٹیج پر بیٹھنے والی جماعت کا ایک طبقہ نیچے مجلس کی مختلف قطاروں میں متفرق ہو کر بیٹھ گیا تھا تا کہ وقتِ ضرورت جمع رکھے رہے

[1] "سازش" کا لفظ شاید پہلے بھی کہیں گزر چکا ہے لیکن یہ میری جانب سے نہیں ہے، بلکہ بجنسہٖ نواب صاحب قبلہ کا لفظ ہے، جو انھوں نے اپنے مضمون میں دو جگہ استعمال فرمایا ہے۔ منہ (الہلال)

سے ایک ایک صدائے موافق اٹھ کر شور مچا دے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر کوئی مخالفت میں تقریر کرے، تو معاً پیچھے سے آوازیں اٹھنا شروع ہو جائیں الااس کے ہنگامے میں مجمع کی مخالف صدائیں مدغم ہو کر مفقود ہو جائیں گی

<u>اسد القادری (لندن)</u>

دریاباد

۲ دسمبر ۱۹۷۲ء

بسم اللہ

برادرم ! وعلیکم السلام

۲ نومبر کا لکھا ہوا خط پرسوں ۳۰ نومبر کو ملا کوئی کہہ سکتا تھا کہ ہوائی ڈاک کا انتظام بھی ایسا باد ہوائی ہوتا ہوگا ! توبہ توبہ !

میری کتاب کی خوش قسمتی کہ آخری عشرۂ رمضان المبارک میں قریب افطار آپ کی نظر سے گزری ۔ ظاہر ہے کہ جب خط کی عبارت میں حسنِ ظن کی اس افراط بلکہ اسراف سے آپ نے کام لیا ہے تو دعائے خیر میں آپ بخل سے کام لینے والے نہ تھے ۔ مومن مسافر و علیل روزہ دار کی دعا اور وہ بھی آخری عشرۂ رمضان المبارک میں اللہ اکبر ۔

اگر آئندہ خط لکھنے کی نوبت آئے تو اپنا تعارف ذرا تفصیل سے ضرور کرا دیں یعنی وطن کہاں تھا، تعلق کس خاندان سے تھا، تعلیم کہاں کہاں پائی اور کہاں تک وغیرہا ۔

انشاء اللہ شفا پوری ہوگی ، رعشہ کا اثر خط پر تو کچھ الحمد للہ کچھ ایسا نہ تھا خط مجھ سے تو آسانی چل گیا ۔

آنکھوں سے بڑی حد تک معذور ہو گیا ہوں اپنا خط خود نہیں پڑھ سکتا دوسروں سے لکھوا کر بھیجتا ہوں ۔

والسلام

عبد الماجد

<u>عبد القوی دسنوی (بھوپال)</u>

بھوپال کے سفر میں مولانا دریابادی نے نواب شاہجہاں بیگم کا دیوان دیکھنے کو مانگا تھا یہ دیوان آخر میں پیش ہوا ٹھیک اس وقت دیا جب مولانا روانگی کے لیے ریل میں سوار ہوئے ، گاڑی روانہ

ؔ اس نوٹ کے تمام اقتباسات الہلال ۵ مارچ ۱۹۱۳ء سے منقول ہیں ۔ اشعار کے لیے دیکھیے : الہلال ۱۲ مارچ ۱۹۱۳ء

ہوئی اور پیکٹ کھول کر دیکھا تو تھا رسیدہ کو اسے ہاتھ لگانہ سکے ، یہی بات مولانا نے خط میں تحریر فرمائی ہے ۔

دریاباد

۶ مارچ ۱۹۷۳ء

بسم اللہ

عزیزم سلمٗ ! السلام علیکم

یہ اچھا مذاق میرے ساتھ رہا ۔ فرطِ اشتیاق سے میں نے ریل پر بیٹھتے ہی چہرہ سے نقاب کھینچا ! برقع اتارا تو سبحان اللہ ، فرط نزاکت سے ۔ ع

ہاتھ آئیں تو انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے

کا عالم ۔

مجبوراً ۔ عطائے تو بلقائے تو ۔ دل شکر گزار بہر حال ہوں ۔

والسلام

عبد الماجد

<u>مالک رام (دہلی)</u> ۔ تحریر سے مراد مکتوب الیہ کا سہ ماہی رسالہ " تحریر " دہلی ہے ۔

دریاباد

۸ فروری ۱۹۷۴ء

بسم اللہ

جناب بندہ ! تسلیمات

صاحبِ " تحریر " کی زبان سے مضمون نہیں مضمونچے کی فرمایش اور اس سے جو بصیرت تو شاید کبھی بھی نہیں رکھتا اور اب بصارت سے بھی بڑی حد تک محروم رہ گیا ہے ! اپنا ہی معمول کا کام خدا معلوم کس طرح لشتم پشتم ہو پاتا ہے دوسروں کی خدمت کا نہ ولولہ نہ حوصلہ ! بجز شرمندگی کے اور معذرت کے پیش کش کے اور کیا کر دوں ۔

سید مسعود حسن رضوی سے ملاقات آج کی نہیں کوئی ۴۰ ، ۴۲ سال قبل کی ہے ۔ ان کے کمالاتِ ادبی کو اگر چھوٹے سے جملہ میں سمیٹ کر کہوں تو یہی کہہ سکتا ہوں اور اپنی ذمہ داری کے پورے شعور کے ساتھ کہتا ہوں کہ وہ ان چند گنے چنے لوگوں میں ہیں جو اردو صحیح لکھتے ہیں ، تحریر کی اور بھی خوبیاں ہوتی ہیں ، فصاحت ، ابلاغت ، سلاست ، ظرافت ، لطافت ، یہ سب اوصاف اضافی ہیں ، سب

سے مقدم زبان کی صحت ہے کوئی فقرہ دلچسپ نظر آیا اور لوگوں نے اس کی داد دے دی۔ کوئی ترکیب پھڑکتی ہوئی سوجھ گئی اور پڑھنے والوں کی زبان پر واہ واہ آگیا، یہ ساری بحثیں بعد کی ہیں پہلے زبان صحیح بھی تو ہو۔

اردو میں لکھنے والوں اور شعر کہنے والوں کی آج کمی تو ہے نہیں سیکڑوں سے گزر کر ہزاروں تک ایسے پہنچ گئے ہیں جو اردو کی فضائے نثر و نظم پر چھائے ہوئے ہیں ان پر کیسے کیسے "معلی القاب" پڑے ہوئے ہیں لیکن بجز گنتی کے کے ایسے ہیں جو زبان کا خیال رکھتے ہیں، عبارت صحیح لکھتے ہیں اور ایک ایک فقرہ کو سوچ کر اس کے وزن کا اندازہ کرکے اپنے قلم پر لاتے ہیں۔

اونچے اونچے پڑھنے والوں کا ذکر نہیں اردو پڑھ لینے والوں کی خاصی تعداد ایسی ہے جنھیں صحت زبان کی فکر ہی نہیں بس ان کے لیے کوئی فقرہ کافی ہے۔ ظرافت نگاری کی بھی تو بھانڈوں اور نقالوں کی سطح کی۔ ادبی لطافتوں کی طرف ذہن کو لے ہی نہیں جاتے۔

اور پھر مسائل ادب کی تحقیق میں مسعود صاحب صفِ اول کے لکھنے والوں میں ہیں۔ لستے سلجھے ہوئے ادیب، نقاد، سخن فہم کی مثال اُن کے معاصرین میں تو مشکل سے ہی کوئی ہوگی۔

اس لیے بڑی حیرت ہوئی کہ جب سننے میں آیا کہ اردو اکیڈمی نے حال میں تین کہنہ مشق اہل قلم کو جو یکمشت رقم ان کی عمومی خدمات پر پیش کی ہے اس فہرست میں مسعود صاحب نہیں، وجہ و سبب جو کچھ بھی ہو بہرحال اس اعراض اور اغماض سے ان کی حق تلفی ہی ہوئی، میں اکیڈمی کی اس سب کمیٹی کا ممبر نہ تھا نہ مجھے کہیں سے اس کی کچھ سن گن مل پائی ورنہ میں تو اپنی آواز ان کے نام کی تائید میں ضرور بلند کرتا۔ جزاکم اللہ کرے وہ اتنا ضرور اور جیئیں کہ اکیڈمی اس حق تلفی کی تلافی کر سکے۔

آپ کا اور اُن کا دونوں کا خیر اندیش

عبدالماجد

<u>عثمان احمد (شاہ گنج، جونپور)</u>

دریاباد

۹ مارچ ۱۹۷۶ء　　　　بسم اللہ

مکرم بندہ! وعلیکم السلام

بڑا شاعرانہ مبالغہ آپ نے اس دیہاتی کی زبان سے متعلق قائم کرلیا ہے، پہلے تو اس کی اصلاح فرمائیے، اب جواب اپنی بساط کے اندر یہ ہے۔

(۱) فصیح اور صحیح میں لفظ "برات" ہی ہے، باقی "بارات" بھی جائز اور کسباتی زبان میں رائج ہے۔

(۲) "ناقہ" اہل زبان کی زبان پر مذکر ہے، باقی میں غلط مؤنث کو بھی نہ کہوں گا، ہیں غلط کسی مذکر کو مشکل ہی سے کہتا ہوں۔

(۳) "ابھار" شروع ہی سے مختلف فیہ رہا ہے، میں تو دونوں کو صحیح تسلیم کروں گا، "ابھار" ترجیحاً مذکر ہے اور "غرض" ترجیحاً مؤنث۔

مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی ریڈریں اب بھی کیا بُری ہیں سوائے اس کے کہ ذرا پرانی ہوگئیں، شاید جامعہ ملیہ والوں نے کچھ اچھی تیار کرائی ہیں۔

والسلام، دُعاگو و دُعاخواہ!

عبدالماجد

<u>مولوی ضیاء احمد بدایونی</u>

کرم گستر! وعلیکم السلام

خود مدیر میگزین سلمہ اللہ ہی کا خط کیا کم تھا کہ اس پر مستزاد آپ کا سفارش نامہ! سے

تو جستم بھی شریک نجمۂ نالہ ہوا
آج کچھ اور بڑھائی گئی قیمت میری

کیسے انکار کروں، معذرت کن الفاظ سے پیش کروں؟ کاش آپ کو میری مصروفیتوں کا تفصیل علم ہوتا! آپ خود ہی اس وقت ایسا حکم نہ دیتے لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا جب اللہ نے اس عذر کی بنا پر بندوں کو معافی دے دی ہے تو کیا خود بندے بندوں کے حق میں اپنی درگذر سے کام نہ لیں گے؟

لکھ ڈالنا تو خیر کچھ ایسا مشکل نہیں قلم گھسیٹ دینے میں وقت ہی کیا ایسا لگتا ہے اصل سوال پڑھنے کا ہے۔ کسی ادیب یا شاعر کو از سر نو پڑھے بغیر کیسے اس پر لکھ دیا جائے۔ اور پھر پڑھنے ہی کا وقت نکالنا تو محال ہے ——————

اپنے محبوب سے محبوب ادیب یا شاعر کا از سر نو مطالعہ کرنا ایک مجاہدۂ عظیم ہے اور یہیں اگر بجز آپ سے معذرت کر دینے کے کوئی چارہ نہیں رہتا۔

خدمت صرف اتنی ممکن ہے کہ کچھ عام مشورے دے دوں۔ خود وہ نمبر ہو تو اس پر بطور دیباچہ یا پیش لفظ چند سطریں لکھ دوں یا کوئی خاص مقالہ آ جائے تو اس پر اُلٹی سیدھی کچھ رائے دے

دون ــــــــ بوڑھے پہلوانوں کو آپ نے سنا ہوگا کہ اکھاڑے میں اتر کر کشتی کے قابل نہیں رہ جاتے باہر بیٹھے ہوئے داؤ پیچ بتا سکتے ہیں، ان کے گُر سکھا بنا دیتے ہیں۔

مزاح و ظرافت اور طنز و تعریض و دانگ الگ چیزیں ہیں، امید ہے کہ اس فرق کو خاص طور پر ملحوظ رکھا جائے گا۔ بلکہ خود شوخی و ظرافت کے درمیان میں جو لطیف فرق ہے اُسے نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔

شاعروں میں اکبر اور نثر نگاروں میں محمد علی جوہر ان سب اصناف کے جامع ہوئے ہیں، اکبر پر تو یقینی ہے کہ میگزین میں خوب کھل کر لکھا جائے گا۔ باقی کسی کو جوہر کی نثر نگاری پر بھی پوری توجہ کرنی چاہیئے۔ مضامین محمد علی، مقالات محمد علی، نگارشات محمد علی وغیرہ کے نام سے کئی مجموعے نکل چکے ہیں، کم از کم انہیں تو ضرور ہی لیا جائے۔

لطیف، سُبک، شوخ نگاری کی مثالیں ریاض خیر آبادی کے ہاں کثرت سے ملیں گی۔ کوئی ریسرچ کر کے ذرا دیکھے تو ! اور نذیر احمد تو کسی طرح بھولنے والی چیز ہی نہیں۔

غیر مشہور اور گمنام لکھنے والوں میں یہ دو بھی از سرِ نو قدر دانی کے محتاج ہیں۔ ایک سیّد محفوظ علی بدایونی مغفور، دوسرے شیخ ولایت علی۔

ظرافت اپنی حدود سے تجاوز کر کے ذاتیات اور شخصی ہجوگوئی تک پہنچ جاتی ہے۔ اس کی مثالیں اودھ پنچ اسکول میں بہت ملیں گی۔ اور گلزارِ نسیم پر جو قیامت خیز بحث شروع ہوئی تھی، اُس میں آخر میں طرف دارانِ شرر بھی اسی سطح پر آ گئے تھے۔ ملاحظہ ہو خفتہ وار ظریف مرحوم کے فائلیں ــــــــ ایک طرف ہیں خطوط "بنام علیمن کے نام" دوسری طرف ہیں مکتوب "سجادی خانم کے نام"!

ہزل، پھکڑ، فحاشی سب کے ڈانڈے آکر مسخ شدہ ظرافت سے مل جاتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام کا جو مقام ادبیات میں ہے وہ تو نظر میں ہو ہی گا۔ بہر حال کے لکھنے والوں میں شوکت تھانوی، رشید صدیقی، قاضی عبدالغفار، سالک، پطرس اور کنہیا لال کپور۔

ہر مذہبی مناظرانہ رسالوں اور کتابوں میں جو ایک دوسرے پر فقرے اُچھالی گئی ہیں اُن سے بھی کترا کر کیسے گزر سکے گا! انہیں بھی سمیٹنا لازمی ہے ــــــــ ایک مولوی صاحب رسالہ کہتے ہیں "شریعت کا لٹھ" مثلاً دوسری طرف سے جواب نکلتا ہے "شریعت کا آرہ" ــــــــ

وقس علیٰ ھذا۔ ایک رسالہ کا عنوان ہوتا ہے "شہتاب" (کھڑاؤں کے معنی میں) مثلاً جواب نکلتا ہے "کشاپ" (جوتی کے معنی میں)۔ بریلی سے آواز آتی ہے کہ "دیوبند کا ایک دیو یہ کہتا ہے"۔ دیوبند سے جواب نکلتا ہے "تم نے جو ہم کو اپنا خصم قرار دیا ہے" الخ ــــــــ

اس مجموعہ کی بیرا آپ نے نہ کرائی تو کچھ نہ کیا۔

ایک مستقل عنوان "علی گڑھ کا حصّہ ظرافت و طنز میں" ضرور رکھیے اور اس کی ابتدا خود سر سید سے کیجیے ــــــــ لیجیے معذرت نامہ خود ہی مضمون بن چلا۔

والسلام، نیاز مند

عبدالماجد

بیکس اکبر آبادی

دریاباد۔ بارہ بنکی بسم اللہ

محترمی! وعلیکم السلام

آپ کا مراسلہ مع اپنے نوٹ کے اگلے شمارہ (نمبر ۱۰) میں انشاء اللہ نکلے گا۔ آپ کا مکتوب جس لہجہ میں ہے کاش چغتائی صاحب آپ ہی سے اسے سیکھ لیتے۔ سماع کے جواز و عدم جواز کا مسئلہ تو مدتوں سے زیر بحث چلا آ رہا ہے۔ اور کوئی اصولی، اساسی مسئلہ ہے بھی نہیں، لیکن یہ لکھنے کی آج تک کسی کو ہمت نہیں ہوئی کہ "گانا سننا اور ناچ دیکھنا سنتِ رسول ہے"؛ معاذ اللہ! آپ ہی فرمایئے ایسی گستاخیوں پر کوئی مسلمان کیسے صبر کرے۔

یا مثلاً یہ لکھ بیٹھنا کہ ..... بخدا ایسے الفاظ نقل کرتے ہوئے میرا دل لرز جاتا ہے، یہ چغتائی صاحب کیسے مسلمان ہیں کہ بے تکلف ان خرافات کے مدعی ہو بیٹھے ہیں۔

والسلام

عبدالماجد

نمبر ۹ جو چھپ چکا ہے اس میں لفظ "سلالہ" کے معنی پر ایک مفصل نوٹ ہے، دفتر کو لکھ رہا ہوں کہ ایک پرچہ آپ کی خدمت میں بھیج دیا جائے۔

جناب اصطفا خاں لکھنوی (کراچی)

(۱)

اصطفا خاں کے جواں سال صاحبزادے کے حادثۂ انتقال پر مولانا دریابادی کا تعزیت نامہ شمیم صاحب سے اشارہ مولانا عبدت اللہ شمیم انصاری فرنگی محلی کی طرف ہے۔ دوسرے مکتوب میں مہمان کا نام آیا ہے۔

دریاباد

۲۴ ستمبر ۱۹۵۹ء

بسم اللہ

کرم گستر! السلام علیکم

سانحہ کا ذکر پرسوں لکھنؤ میں شمیم صاحب سے سُن کر دل دھک سے ہو گیا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْن۔ لیکن سوچتا ہوں کہ آپ سے تعزیت کروں یا آپ کو مبارکباد دکھوں کہ کتنی بڑی قربانی آپ سے طلب کی گئی اور آپ کا ظرف کتنی سخت قربانی کے قابل سمجھا گیا۔ وَمَا یُلَقّٰهَا اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَمَا یُلَقّٰهَا اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ۔ میں تو آپ کے صعوبات سفرِ حج ہی کا ذکر ایک صاحب سے سُن کر عش عش کر رہا تھا کہ کیا حجِ مقبول آپ کو نصیب ہوا اور کیسے کیسے مجاہدے اضطراراً آپ سے کرائے گئے کہ اس آخری اضطراری مجاہدۂ عظیم کا نمبر تو سب سے بڑھ گیا! ——— انعام و اکرام لطف و نوازش کی جو بارش آپ پر ہونے والی ہے اس کا تو آج اندازہ بھی نہیں ہو سکتا۔

جوان، ہونہار محبوب لختِ جگر کا یوں اٹھ جانا کوئی معمولی مجاہدہ ہے؟ اللہ اکبر! مرحوم اگر شادی شدہ تھے تو بیوی بچوں پر کیا گذری ہوگی!

اللہ آپ کو، ان کے سارے متعلقین کو صبرِ جمیل عطا کرے، اولاد کا صدمہ تو وہ چیز ہے کہ خود صابروں، شاکروں کے سرتاج صلی اللہ علیہ وسلم کے آنسو اولادِ خردسال تک پر نکل آئے ہیں ——— اور ہم ضعیف و ناتواں اُمتیوں کو اس باب میں بھی ایک اُسوۂ حسنہ نصیب ہو گیا ہے۔

والسلام علیکم

دعا گو و شریکِ غم:

عبدالماجد

(۲)

دریاباد

۲۸ نومبر ۱۹۶۲ء

بسم اللہ

کرم گستر! وعلیکم السلام

آپ کا خیریت نامہ خوب آ گیا۔ اس عرصہ میں آپ کئی بار یاد آئے، اور دل نے اس حسرت کے ساتھ

محسوس کیا کہ لکھنؤ میں آپ سے ملاقات کی صورت ایک مدت سے پیدا نہ ہوئی۔

آپ کا تازہ مجموعۂ کلام کچھ روز ہوئے مل گیا تھا، شکریہ! شمیم صاحب کا دیباچہ خوب ہی ہے۔ گو صفائی میری زبانِ قلم پر ہمیشہ سے ہے اور اپنے اکابر کو میں نے یہی بولتے سُنا اور یہی لکھتے دیکھا ہے۔ گھرنا اور گھڑت صرف پنجابی حضرات کا تلفظ اور املا ہے۔ انشاء اللہ آپ کو شفا ئے کامل دے کہ آپ جلد ہی سفرِ لکھنؤ کے قابل ہو جائیں۔

والسلام، دعا گو:

عبدالماجد

قاری محمد طیب قاسمی دیوبندی

(۱)

مکتوب الیہ کی والدہ کے انتقال پر مولانا کا تعزیتی مکتوب۔

دریاباد

۲۷ اکتوبر ۱۹۵۹ء

مخدوم و مکرم! السلام علیکم و رحمۃ اللہ

"الجمعیۃ" میں سانحہ کی خبر ابھی نظر سے گزری۔ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَھَا وَارْحَمْھَا۔

والدہ کا ظلِ عاطفت ہر سن میں ایک سایۂ رحمت اور دنیا میں سب سے بڑی نعمت ہی رہتا ہے۔ آپ خوش قسمت تھے کہ اتنے دن تک آپ کو مرحومہ کی خدمت کا موقع ملا اور جنت کا استحقاق ایک اس ذریعہ سے حاصل کر لیا۔

آپ کو تعزیت کے کلمات لکھنا لقمان کو حکمت کا درس دینا ہے۔

والسلام، دعا گو و دعا خواہ:

عبدالماجد

(۲)

پہلے خط کی وصولی کے موقع پر مکتوب الیہ علیگڑھ میں تھے جہاں اُن کی آنکھ کا آپریشن ہوا تھا اور "آنکھ کی کہانی" کے عنوان سے ایک نظم تحریر کی تھی اور مولانا دریابادی کو بھیجی تھی۔ مولانا کے دوسرے خط میں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔

دریاباد

۱۵ دسمبر ۱۹۶۲ء

بسم اللہ

حضرتِ محترم! السلام علیکم

"آنکھ کی کہانی" "آنا مریم" کا عطیہ یہاں آتے ہی پڑھ ڈالی۔ سبحان اللہ و ماشاء اللہ۔ مجھے علم نہ تھا کہ آپ کو نظم پر بھی اس قدر قدرت حاصل ہے۔ ذٰلک فضل اللہ

کیا کیا قافیے نکالے ہیں اکیسے کیسے مضمون باندھے ہیں پیشہ ور شاعروں کے بھی چھکے چھوٹ جائیں، نہ کہیں سے جھول اتنی طویل نظم میں کہیں سے آورد نہیں بس آمد ہی آمد ہے۔

خوش دماغ تو بحیثیت ایک سچے قاسم زادہ کے آپ تھے ہی، اب معلوم ہوا کہ ماشاء اللہ خوش فکر بھی اس درجہ میں ہیں۔ ماشاء اللہ۔ والسلام

دُعاگو و دُعاخواہ،

عبدالماجد

(۳)

دریاباد

۱۷ جنوری ۱۹۶۶ء بسم اللہ

مخدوم و مکرم! وعلیکم السلام

آپ کی آنکھ ماشاء اللہ کیا بنی کہ آپ نے بہتوں کی آنکھیں کھول دیں اور مجھ سے بصروں کو بھی اپنی بساط کے مطابق کچھ نور کی شعاعیں نظر آنے لگیں۔

نور السمٰوٰت والارض بصیرت و بصارت دونوں میں ترقی بخشے اور لفظ و معنی ادب و معرفت دونوں پر آپ کی حکمرانی برقرار رکھے۔

"صدق" میں بھی انشاء اللہ ضرور ذکر آئے گا۔ والسلام

دعاگو و دعاخواہ،

عبدالماجد

(۴)

مکتوب الیہ کی رفیقۂ حیات کے انتقال پر تعزیتی مکتوب۔

دریاباد

۹ فروری ۱۹۷۲ء بسم اللہ

برادرم! السلام علیکم و رحمۃ اللہ

سانحہ نے دل کو انتہائی ملول کیا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

قلب انسانی کے لیے جو صدمے انتہائی صبر آزما ہو سکتے ہیں ان میں ایک یہی رفیقۂ حیات کی مفارقت ہے انشاء اللہ آپ اُس وقار اور عزیمت کے ساتھ گزر جائیں گے جو آپ کے مرتبۂ علم و فضل و منزلت کے شایاں شان ہے۔ مجھ سے بڑھ کر اس عظیم تلخی کا لذت شناس اور کون ہوگا اور میرے لیے سب سے ٹھنڈا مرہم آپ کے مکتوبات و مضامین ثابت ہوئے تھے، آپ کا وہ احسان کبھی بھولنے والا نہیں۔

اللہ مرحومہ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور آپ کے رفع مدارج کو اس حادثہ کا سبب بنائے۔

"صدق" میں بھی انشاء اللہ اس کا ذکر کروں گا تاکہ کثرت سے لوگوں کو دعائے مغفرت و ایصالِ ثواب کا موقع ملے۔

مرد کا تو سارا نظامِ زندگی اور سکونِ قلب اس سے رخصت ہو جاتا ہے، بہر حال آپ کو مبارک ہو کہ اس اضطراری سنت دریلتِ خدیجہ کا موقع مل گیا۔ والسلام، دعاگو و دعاخواہ،

عبدالماجد

طاہر حسن کاکوروی

(۱)

مکتوب الیہ مولوی نور الحسن مولف نور اللغات کے پوتے ہیں اور ذوق تحقیق لغات اور لسانیات میں اپنے دادا کے سچے جانشین۔ الفاظ کی تحقیق ہی کے سلسلے میں مولانا دریابادی کو خط لکھا تھا، اس کا یہ جواب ہے۔ آخر میں اشارہ ترقی اردو بورڈ، کراچی کے زیر اہتمام لغت کے کام کی طرف ہے۔ اب اس ادارے کا نام اردو ڈکشنری بورڈ ہے۔

دریاباد

۲۰ ستمبر ۱۹۶۶ء بسم اللہ

برادرم! وعلیکم السّلام

۱۔ "فضل" کے لیے میں نے اپنی تفسیر میں کچھ لکھا ضرور ہے لیکن اب اسے دوہرانا آسان نہیں۔ باقی آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ بھی صحیح ہے اور اپنی جگہ بالکل کافی۔

۲۔ "فروق" پر ضرور لکھیے لیکن کل کتاب تو بڑی ضخیم ہو جائے گی۔ اسماء، صفات، افعال۔ سب ہی اس کے تحت آجائیں گے۔ اسماء مثلاً گلا، حلق، حلقوم، ٹینٹوا کا فرق، صفات مثلاً سادہ دلی، سادہ مزاج، سادہ لوح کا فرق، افعال مثلاً لکھ دیجیے، لکھ ڈالیے، لکھ مارییے کا فرق۔

مماثل الفاظ کا ذخیرہ تو بہت بڑا ہے۔

۳۔ اللہ۔ رب، خدا کا فرق ضرور لکھیے۔

۴۔ الف مقصورہ کا املا تو انجمن ترقی اردو نے عرصہ ہوا محض الف کر دیا مثلاً ادنیٰ کے بجائے ادنا۔ تعالیٰ کے بجائے تعالا۔ اعلیٰ کے بجائے اعلا مگر یہ رواج پوری طرح چل نہ سکا حروف کے بدلنے کی بحث دوسری ہے۔ "ص" کے بجائے "س" "ح" کے بجائے "ہ" اور "ض" کے بجائے "ز" کرنے میں بڑی ہی دقتیں پیش آئیں گی اور معنی اور مفہوم میں ایک بھونچال آ جائے گا اس لیے اس رائے کا میں قطعی مخالف ہوں۔ لغت کا کام فرد واحد کے بس کا نہیں۔ انگریزی کے بڑے لغت دس دس بیس بیس فاضلوں نے مل کر اور انگریزی ادب کی ہزارہا ہزار کتابیں من وعن مطالعہ کرنے کے بعد لکھے ہیں۔ پاکستان میں اردو لغت کا کام اب اس بڑے پیمانے پر حکومت کی سرپرستی میں شروع ہوا ہے۔

مولوی نورالحسن مرحوم تن تنہا لغت لکھ کر بڑا ہی جہاد کر گئے۔ والسلام

عبدالماجد

(۲)

۲؍ اپریل ۱۹۶۸ء

برادرم! السلام علیکم

یوم تو اب ہر کس و ناکس کا منایا جانے لگا ہے محسن مرحوم تو خیر بڑی چیز تھے ضمناً اس میں ذکر صاحب نوراللغات کا بھی آ جانا چاہیے۔ کسی عملی خدمت سے معذور ہوں۔ ٹھیک تاریخ جلسہ معلوم ہونے پر دو پیام عرض کر دوں گا ان شاء اللہ۔ والسلام

دعا گو و دعا خواہ عبدالماجد

(۳)

مکتوب الیہ مولانا مرحوم کی اس رائے سے متفق نہیں ہو سکے۔ ان کا خیال تھا کہ "بربریت" کی اصل عربی ہے۔

۴؍ جنوری ۱۹۷۳ء

برادرم! السلام علیکم

کاغذات کی الٹ پلٹ میں آپ کے کرم نامہ مورخہ ۵؍ دسمبر پہ نظر پڑ گئی۔ حیران رہا کہ اب تک یہ کیسے نظر سے غائب رہا۔ بہرحال اس سہو نظر پہ دل سے معافی چاہتا ہوں۔ "بربریت" یہ انگریزی لفظ Barbarian سے اردو میں آیا ہے، انگریزی میں اس کے معنی نیم وحشی، نیم جنگلی اور غیر مہذب کے ہیں۔ انگریزی سے مورد ہے اور اب اردو کا جزو بن گیا ہے۔ قرآنی رسم خط سے متعلق جو سوال ہے اسے صدق میں دے رہا ہوں۔ ان شاء اللہ آئندہ ہفتہ وہ دفتر سے پہنچے گا اور آئندہ نمبر ان میں جوابات آئیں گے۔ والسلام۔

دعا گو: عبدالماجد

(۴)

۱۹۷۴ء

برادرم سلمہ اللہ! وعلیکم السلام

عربی لغات کو اپنی بساط کے اندر کھنگالنے سے پتا چلا کہ "سُندُس" کے معرّب ہونے پر سب کا اتفاق ہے یعنی سب ہی نے یہ لکھا ہے کہ عربی میں یہ لفظ باہر سے آیا ہے۔ لیکن یہ بہت کم کسی نے لکھا ہے کہ آیا کہاں سے ہے یعنی کس زمانے میں اور کس زبان سے آیا ہے۔ کسی نے ہندوستان کو لکھا ہے، اور کسی نے ایسے ہی گول چھوڑ دیا ہے معنی سب نے باریک ریشم کے لکھے ہیں۔ عربی لغت نویس کو ماخذ کی طرف جانا ضروری تھا بھی نہیں۔ افسوس ہے کہ اکاڈمی والوں نے نوراللغات کا مسئلہ بیچ ادھر میں چھوڑ دیا ہے۔ خیال یہ ہے کہ اس میں صدر صاحب مُخِل ہو رہے ہیں۔ والسلام۔

دعا گو: عبدالماجد

(۵)

۱۰؍ مئی ۱۹۷۴ء

برادرم سلمہ اللہ وعلیکم السلام

زندہ ہوں اور بہرحال زندگی کی مدتِ موعود پوری کر رہا ہوں۔ والسلام

عبدالماجد

شورش کاشمیری (لاہور) (۱)

اس خط میں مذکورہ محمد علی سے مراد محمد علی بوگرا ہیں جو امریکہ میں پاکستان کے سفیر تھے۔ انہوں نے اپنی سیکرٹری سے شادی کر لی تھی۔ اس واقعے پر پاکستان کے بعض حلقوں میں بہت لے دے ہوئی۔ اسی واقعہ و ہنگامہ کی طرف اشارہ ہے۔

۸ رجولائی ۵۵ء

برادرم السلام علیکم

تازہ نوٹ پڑھ کر میں دنگ رہ گیا۔ پہلے تو دل میں آیا کہ سرے سے صبر کر جاؤں۔ پھر خیال آیا کہ ایک بار تو توجہ دلا ہی دینا چاہیے۔

پہلے تو عنوان ہی کھٹکا۔ بجائے نام کے "ایڈیٹر صدق" چاہیے تھا خیر اُسے چھوڑیے۔ کمال آپ نے یہ فرمایا ہے کہ ایک اہم مسئلہ شرعی کی تحقیق و تشریح کو۔ جس پر آپ کے پاکستان میں خصوصًا شد و مد سے حملے ہو رہے ہیں۔ تمام تر ایک پاکستانی شخصیت کی حمایت و نصرت قرار دے دیا ہے یہ نیت پر صریح حملہ نہیں تو آخر اور کیا ہے۔ اور اپنے ناظرین تک صدق کی صحیح پوزیشن کو تمام مسخ کر کے پہنچانا نہیں تو اور کیا ہے؟

کیا دنیا میں محمد علی ہی اس جرم کے تنہا مجرم ہیں؟ خود پاکستان ہی میں ایڈوکیٹ جنرل فیاض علی اور کتنے اوروں کی مثالیں حال ہی میں پیش آ چکی ہیں۔ پھر کچھ روز قبل وزیرِ اعظم انڈونیشیا کے لیے کیا کچھ اُمڈ رہا تھا؟

لکھنؤ میں ۳۰ء میں چودھری خلیق الزمان کا یہی حشر دیکھ چکا ہوں۔ بہ قول خود انہیں کے جب تک میں نے آشنائی جاری رکھی۔ کوئی کچھ نہ بولا۔ بس جس دن عقد کیا۔ معلوم ہوا ہے کہ ایک آگ لگ گئی۔"

۳۱ء میں میں نے بھی یہی جرم کیا تھا۔ ایک رات کسی صاحب اولاد اور مصیبت زدہ بیوہ کے ساتھ عقد کر لیا تھا۔ جس میں حظِ نفس (جی ہاں وہی حظِ نفس جس کو آپ حضرات کی شریعت نے ایک مستقل معصیت قرار دے رکھا ہے) کے ساتھ ساتھ ان بیچاری کی امداد کا بھی خیال تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ایک طوفان برپا ہو گیا۔ خاندان اور برادری والوں نے جو کچھ کہا اسے چھوڑیے۔ مستقل پمفلٹ "عبدالماجد دریا آبادی بے نقاب" کے نام سے نکلا۔ ہفتوں نہیں مہینوں اخبارات و رسائل کے صفحات اسی بحث سے پُر رہے۔ لکھنؤ سے کراچی تک پورا محاذِ جنگ قائم ہو گیا۔

سید حبیب شاہ مرحوم کا خطاب تک یاد ہے۔ لکھا تھا کہ "آپ کے خلاف یہ فردِ جرم لگی ہے آپ اپنی صفائی میں جو کچھ کہنا چاہتے ہوں کہیے۔"

دہلی کے ایک ہفتہ وار نے سرخی جمائی "ایک مولانا کی حرمسرا کے اسرار"!

غرض یہ کہ ہر تھوڑے دنوں کے بعد یہ فتنہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور جس کے دل میں ذرا بھی غیرتِ دینی ہے اس پر فرض ہے کہ اس جزئی ارتداد کے مقابلہ میں صف آرا ہو۔

اپوا وغیرہ سلامت رہیں۔ اب یہ فتنہ شدید تر ہو گیا ہے اور حرام کاری اور عقدِ ثانی کا مقابلہ کھلم کھلا شروع ہو گیا ہے۔

کیا محمد علی اب سیاسی حیثیت سے اس درجہ مبغوض و مردود ہو گئے ہیں کہ کوئی شرعی مسئلہ بھی ایسا نہ بیان کیا جائے جس سے ضمنًا انہیں اپنی شخصی زندگی میں کچھ فائدہ پہنچ سکتا ہو؟

آخری فقرہ "خدا کے لیے آفتاب سے ذروں کو نہ ملایئے" ــــــ کے جواب میں سوا اس کے اور کیا عرض کروں کہ خدا کے لیے کوئی طریقہ بتلایئے کہ امت کے اعمال کے جواز و عدمِ جواز کی بحث میں بجز اسوۂ انبیاء کے پیش کرنے کے کوئی اور معیار رکھا جاتے ــــــ! جو خاص الخاص معیار امت کے ہاتھ میں ہے۔ اسی کو آپ اس سے چھین لینا چاہتے ہیں۔

آخری سوال۔ عوام سے ہم آہنگ ہو کر اور انہیں کی سطح پر آ کر یہ "حظِ نفس" کو جرم آپ نے آخر کس دلیل سے قرار دے لیا ہے؟

صدق میں یہ بحث نہیں اٹھایا مراسلہ چٹان کے لیے نہیں آپ کے نام ذاتی مکتوب ہے ہاں آپ چاہیں تو اس کے کچھ حصے دوسرے اشخاص کے نام حذف کرنے کے بعد شائع کر سکتے ہیں۔

دوستوں، مخلصوں سے مناظرہ کرنے میں دل کو جتنی کوفت ہوتی ہے اسے کچھ میرا دل ہی جانتا ہے۔ خط ارادہ کے خلاف اتنا طویل ہو گیا۔

ہاں ایک بات اور یاد پڑ گئی۔ آپ کے تازہ مرحوم دوست منٹو کی حمایت کے جوش میں بالکل بلا ضرورت ایک سخت اتہام میرے اوپر لگا کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اسے جس وقت تک میں نہ معاف کر دوں اللہ میاں بھی شاید معاف نہ فرمائیں۔

والسلام

عبدالماجد

(۲)

شورش مرحوم نے چٹان کے سالنامے کے لیے مضمون کی فرمایش کی تھی

۱۰ ردسمبر ۱۹۶۹ء

برادرم السلام علیکم

خصوصی نمبر کے لیے مضمون کی فرمایش عرصہ سے آئی ہوئی ہے تعمیل کے لیے وقت کہاں سے لاسکتا تھا۔ معذرت نامہ کو سوچ ہی رہا تھا کہ ۱۸ر نومبر کے چٹان میں ایک ادبی مضمون پر نظر پڑ گئی اور جی میں آیا کہ الٹی سیدھی چند سطریں اسی ذیل میں لکھ بھیجوں۔ تراشہ رکھا لیا۔ اور آج خدا خدا کر کے اتنا موقع بھی مل پایا۔

(۱) سرورق پر جو فوٹو آپ نے اس وقت کے مشاہیر کا دیا ہے بیشک وہ ایک یادگار چیز ہے۔ کچھ اور چیزوں کی تصریح اس کے ساتھ ضروری نہیں۔

الف۔ یہ گروپ غالباً ۱۹۰۱ء کا ہے۔

ب۔ گروپ کے ہر ممبر انلباً اس وقت کی انجمن ترقی اردو کے ممبر ہیں۔ انجمن اس وقت نئی نئی قائم ہوئی تھی اور مستقل وجود رکھنے کے بجائے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا ایک شعبہ تھی۔ مولانا شبلی سیکرٹری تھے اور محسن الملک، وقار الملک، نذیر احمد، حالی، آرنلڈ اس کے ارکان۔

ج پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ (یہ بعد کو ڈاکٹر اور پروفیسر بنے) مصنف پریچنگ آف اسلام، استاد اقبال، ایک بڑے شریف اور اسلام دوست انگریز تھے ۱۹۳۰ء تک زندہ رہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا آخری مکمل یعنی تیرھویں ایڈیشن میں اسلام اور اسلامیات سے متعلق مضامین ان کے قلم کے یا ان کے نظر ثانی کیے ہوئے ہیں۔ مارگولیتھ وغیرہ کے پھیلائے ہوئے زہر کا توڑ بڑی حد تک جو چند شریف منصف مزاج انگریزوں نے کیا ہے۔ ان میں سرڈینسن راس کی طرح پیش پیش سر ٹی ڈبلیو آرنلڈ بھی تھے۔

(۲) یہ فوٹو غالباً سب سے اول بار انتخاب مخزن میں نکلا تھا مخزن مرحوم کا اب کوئی کیسا تعارف کرائے کہ اپنے زمانہ میں لاہور کیا معنی، ہمارے ہندوستان کا کیسا بیش بہا ادبی پرچہ تھا۔

(۳) الف مولانا شبلی کا اصل تخلص صرف شبلی ہی تھا۔ شبلی نعمانی بس کہیں کہیں ضرورت وزن

ہی سے لاتے ہیں۔

ب۔ مولانا شبلی کے قیام حیدرآباد کا زمانہ قیام لکھنؤ سے قبل کا ہے داغ کی جس صحبت کا ذکر آیا ہے مولانا شبلی اس وقت جوان تھے۔

(۴) الف۔ محسن الملک مرحوم شیعہ سے سنی ہوتے تھے۔ حنفی نہیں۔ اغلباً مسلک اہلحدیث پر آخر دم تک قائم رہے۔

ب۔ سر اینتھونی میکڈانلڈ (میکڈانلڈ نہیں) کا سرکار سے صرف دیوناگری رسم الخط کے اجرا سے متعلق تھا۔ ہندی زبان سے متعلق نہیں۔

ج۔ محسن الملک بہادر نے علی گڑھ کالج کی سیکرٹری شپ سے استعفا کو پیش کر دیا تھا۔ لیکن با آخر رہے وہی سیکرٹری اپنے وقت وفات تک۔

(۵) الف۔ حالی کا دیوان اور مقدمہ دیوان دونوں ساتھ ہی ساتھ چھپے تھے۔ شعر و شاعری کے نام سے مقدمہ الگ ہو کر تو ان کے انتقال کے بعد شائع ہوا ہے۔

ب۔ ان کے شدید مخالفوں میں شیخ سجاد حسین کا کوروی ایڈیٹر "اودھ پنچ" بیشک آگے آگے تھے اور ان کا ساتھ شیخ احمد علی شوق ایڈیٹر آزاد بھی دے رہے تھے حسرت موہانی کو ان دونوں کے ساتھ منسلک کرنا صحیح نہیں حسرت نے اپنے ماہنامہ "اردوئے معلیٰ" میں اول تو تنقید بہت بعد کو کئی سال بعد کی۔ اور دوسرے اس کا رنگ اودھ پنچ بالکل نہ تھا۔ دونوں شعر جو آپ نے نقل کیے ہیں وہ خالص اودھ پنچی ہیں۔

ج۔ دوسرے شعر کا دوسرا مصرع صحیح یوں ہے ؎

غازی میاں کا حال ڈفالی سے پوچھیے

اودھ میں دھوم دھام سے میلہ غازی میاں کا ہوتا ہے۔ دنہ کہ بدھو میاں کا) جس میں ڈفلا خوب بجتا ہے۔

(۶) مولانا شبلی سرسید سے سن میں بہت چھوٹے تھے اور ان کا بڑا ادب کرتے تھے۔ تحقیق کے لیے استفسار ضرور انہوں نے کیا ہوگا۔ لیکن آج کل کے پڑھنے والوں پر اگر اس سے یہ اثر پڑے کہ دونوں ہم سن اور باہم بے تکلف دوست تھے تو یہ صحیح نہیں۔

(۷) نذیر احمد کے لکچر پر آزاد کی اصلاح والی روایت ذرا تشنہ ہے میں نے اسے اول بار مہدی افادی مرحوم سے بحوالہ مولانا شبلی سنا لیکن جب خود مولانا سے دریافت کیا تو انہوں نے

اس سے بالکل انکار فرمایا اور کہا کہ نذیر احمد بھلا اسے کیسے گوارا کر سکتے تھے کہ اپنا لیکچر اصلاح کے لیے کسی کے آگے پیش کریں۔

(۸) شرر مرحوم عالم دین تو شروع ہی سے تھے۔ ہاں آخر زمانہ میں صورۃً بھی پورے مولوی ہو گئے تھے۔ داڑھی بہت بڑی اور گھنی موئی نہ تھے اعمال بالحدیث تھے۔

والسلام۔ دعاگو عبدالماجد

(۳)

شورش مرحوم کے والد کے انتقال کی خبر پڑھ کر۔ ماہ مبارک سے اشارہ رمضان کی طرف ہے

دریاباد

۱۹ ر اپریل ۱۹۵۶ء

برادرم! السلام علیکم

۱۵ ر کا نوائے وقت ایک روز کی تاخیر سے کل ۱۸ ر کی شام کو موصول ہوا اور اسی میں سانحہ کی خبر پڑھی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

سن کچھ ہی ہو جاتے باپ کا وجود دنیا میں ایک بہت بڑی نعمت ہوتا ہے جس کا کوئی بدل نہیں اور اس کے بعد ساری ذمہ داریاں اپنے ہی سر آ پڑتی ہیں۔

مرحوم کی مغفرت کے لیے یہی کیا کم ہے کہ ماہ مبارک نصیب ہوا۔

دعاگو و شریک غم

عبدالماجد

(۴)

شورش مرحوم نے چٹان میں حاجی سید وارث علی شاہ کے معتقدین کی روش کے بارے میں بعض خیالات کا اظہار کیا تھا۔ مولانا دریابادی نے اپنے خط میں انہیں سے اتفاق یا اختلاف یا وضاحت کی ہے۔ مولانا دریابادی نے شورش کے معروضات کا نمبروار جواب دیا ہے۔ نمبر ا میں حاجی وارث علی شاہ، مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا حسین احمد مدنی کی طرف اشارہ ہے۔ نمبر ۲ میں حاجی صاحب کے اور ان کے مریدین کے ننگے پاؤں رہنے، جو تانہ پہننے اور ہمیشہ حالت احرام میں رہنے کی روایت اور اس کے پس منظر کا ذکر آیا تھا۔ نمبر ۳ میں پنجاب کے بعض دنیادار عالی فقرا کا بیان تھا۔ نمبر ۴ اور ۵ میں حضرت حاجی صاحب کی کل مشرب کی عدم احتیاج کا بیان تھا۔ نمبر ۶، ۷ اور ۸ میں ملک غلام محمد سابق گورنر جنرل پاکستان کی طرف اشارہ ہے کہ وہ حضرت حاجی صاحب کے مرید تھے، خواب میں انہیں دیکھا

تھا اور بارہا وہ ان میں صرف اعتقاد رکھتے تھے۔ نمبر ۹ میں حضرت حاجی صاحب کے ایک مرید کے عشق و سرمستی کے واقعہ کا بیان ہے۔ اور اس بات کی تردید کہ پیارے ۹ جس پر وہ فریفتہ ہو گئے تھے، ان کی عزیزہ تھی اور کوئی ہرگز نہ تھی۔ مولانا دریابادی کا خط ۸ خط ہے۔ القاب و آداب شاید چٹان کی اشاعت میں حذف کر دیئے گئے ہوں۔

۱۷ ر فروری ۱۹۵۶ء

۱۔ حاجی صاحب کی ذات مختلف فیہ رہی ہے۔ جہاں آپ کے ماننے والے بے شمار تھے وہیں، منکرین کی جماعت بھی اچھی باوقعت و اقتدار رہی ہے۔ حضرت تھانویؒ۔ مولانا حسین احمدؒ وغیرہما کا شمار اسی آخری جماعت میں تھا۔

حاجی صاحب کا انتقال ۱۹۰۵ء میں ہوا ہے جب میں ۱۲ سال کا تھا۔ اتفاق یہ اسی دن زلزلہ بھی آیا۔ معتقدوں نے اسے بھی کرامت پر محمول کیا خود میرے اعزہ میں کثرت سے آپ کے معتقد تھے۔ لیکن بعض شدید مخالف بھی۔ حالات دونوں کی زبان سے بہت کثرت سے سننے میں آتے۔ آخری فیصلہ میں نے یہ کیا کہ آپ تمام تر سکر سے مغلوب ایک مجذوب تھے۔ اور اس لیے مرفوع القلم۔ قطعی تارک الدنیا اور ہمہ وقت مستغرق۔ لیکن تربیت و ارشاد کے ناقابل عمر بھر مجرد رہے اور ہر قسم کے علائق سے آزاد ——

۲۔ ہر مرید یا متبع نہیں۔ یہ وضع صرف ذاتی فقرا کی تھی اور ہے۔

۳۔ صداقت و بربریت (تو نے سچ کہا خدا تیرا بھلا کرے (آزاد ترجمہ)

۴۔ یہ روایت ممکن ہے کہ کسی خاص دور زندگی کی حد تک صحیح ہو عام حالات میں آپ عدم احتیاج کے پابند کبھی نہ تھے۔ سال کے ۱۲ مہینے ایک خود فراموشی کی کیفیت طاری رہتی تھی کھانا پانی کوئی بھی چیز خود سے طلب نہ کرتے۔ جب اور جس وقت کسی نے جو کچھ کھلا دیا برائے نام کھا پی لیتے۔

۵۔ لیکن قطعی انکار ان سے بھی نہ کرتے۔ جب کسی نے بریانی شیرمال وغیرہ پیش کر دی ایک آدھ لقمہ اس میں سے بھی چکھ لیتے۔

۶۔ ان کو حاجی صاحب کی زیارت صرف خواب میں ہوئی تھی۔

۷۔ ایک دفعہ نہیں بارہا۔

۸۔ یہ روایت خدا معلوم آپ نے کہاں سنی؟ ملک صاحب کا کوئی پیر نہ تھا۔ جو کچھ بھی تھے۔ وہ حاجی صاحب ہی تھے۔

۹- سب سے زیادہ دھوکا آپ کو یہیں ہوا ہے۔ اسی ضلع میں دیوا سے چند میل کے فاصلے پر ایک قصبہ ہے تیر گاؤں۔ وہاں کے ایک شریف زادہ حافظ عبدالکریم نامی تھے حاجی صاحب کے پرستاروں میں۔ پیاری بیچاری کوئی طوائف نہ تھی، انہیں کی حقیقی پھوپھی زاد بہن تھی۔ حافظ اس پر فریفتہ ہو گئے اور بجائے کسی لفنگے پن کے اس سے باضابطہ عقد کر لینا چاہا۔ لیلیٰ کے والدین کی طرح پیاری کے والدین کو بھی ضد آ گئی۔

اس کے بعد کی داستان بڑی طویل بھی ہے اور حیرت انگیز و دردناک بھی۔ مجنوں کے قصے تو سُنے سنائے ہیں۔ حافظ نے اس ساری داستان کو "شنیدہ" کی بجائے "دیدہ" کر دکھایا۔ گالیاں کھائیں، لٹھ کھائی۔ محلہ کے لڑکوں نے چھیڑا، ستایا، دھوبن نے پیاری کے کپڑوں کا بہانہ کر کے آپ اُن سے انعام وصول کیا، بلکہ اسی جنونِ عشق میں (چہرہ پر دیا سلائی کا مسالہ مل کر) جن کا روپ بھر کر رات کو اس کے مکان میں کودے۔ ماں وغیرہ سب ڈر کر چھپ گئیں۔ ان کے ہوش اس عالم میں بھی اتنے باقی رہے کہ انہوں نے پیاری سے صرف قرآن مجید سنانے کی فرمائش کی۔ آخر ایک بار اس کے گھر کے کنوئیں میں خودکشی کے ارادہ سے پھاند پڑے۔ لوگوں نے زندہ نکال لیا۔ لیکن سخت زخمی ہو چکے تھے۔ اُدھر پیاری کی شادی کسی اور سے ہو گئی۔ اور اس سے اولاد بھی ہوئی (اس کا بھی امکان ہے۔ کہ پیاری ۹۰، ۹۲ سال کی عمر میں اب بھی کہیں زندہ ہو۔ حافظ آبادی اور ویرانے سب کہیں ایک کمبل اوڑھے اور "مرہ ہے پیاری کا" نعرہ لگاتے پھرتے رہے۔ آخر میں دوسروں کی سفارش پر مرشد ہی کو رحم آیا حافظ کو حجرہ میں تنہا بٹھا کر مراقبہ کرایا۔ اس کے بعد خود حافظ پیاری (یہی ان کا نام پڑ گیا تھا) کی روایت بھی یہی تھی کہ۔

"میں نے دیکھا کہ پیاری دلہن بنی ہوئی ایک چھپر کھٹ پر بیٹھی ہوئی ہے بے انتہا حسین و دلکش میں بے خود ہو کر سیروں پر گر پڑا۔ اور مرشد کی آواز کان میں آئی کہ تو اپنے رب کو بھی حشر میں اسی شکل میں دیکھے گا ——— آنکھ کھل گئی۔ دل کو تسکین تھی اور وصل اشد روشن کا اثر غائب تھا۔ واللہ اعلم"

میں نے حافظ پیاری کا آخر زمانہ دیکھا ہے۔ ۱۹۲۲ء سے کئی سال بعد اُن کے وقتِ انتقال تک، سیکڑوں، ہزاروں معتقد خود اُن کے بھی تھے۔ خصوصاً بمبئی کے سیٹھ اور حیدرآباد کے امراء اور اُن کی زندگی بڑی امیرانہ بسر ہو رہی تھی۔ دیوا ہی میں ان کا بھی مزار ہے۔

(۵)

۱۹ مارچ ۱۹۵۶ء — دریاباد بارہ بنکی

برادرم وعلیکم السلام

قبل اس کے کہ اپنے سفرنامہ کے سلسلہ میں ذکر (اور ذکر ہمیشہ ذکرِ خیر ہی کا مرادف نہیں ہوتا) آپ کا، اور آپ کی ٹھاٹھ باٹھ والی دعوت کا کروں، آپ کا والا نامہ پہنچ گیا۔ کل شام کو ملا اور آج صبح ہی پہلی ممکن ڈاک سے جواب لکھنے بیٹھ گیا۔ سفرنامہ میں اس ذکر کا موقع تو کہیں ہفتوں بعد نکل پائے گا۔

تازہ چٹان ابھی ابھی ڈاک سے ملا اس میں ۳ مارچ کے چٹان کے حوالہ سے ایک مراسلہ مولوی مسعود علی ندوی پر بڑا تند و تلخ نکلا ہے مجھے اصل مضمون بالکل یاد نہیں پڑ رہا ہے۔ یاد کر کے وہ تراشہ ضرور بھیج دیجئے گا۔

آپ نے سوال کر کے ایک نازک مسئلہ چھیڑ دیا۔ مولانا مرحوم سے اختلاف دارالمصنفین کو تو کبھی نہیں رہا البتہ خود سید صاحب مرحوم کی مولانا سے متعدد رنجشیں اور شکایتیں رہیں جن کا اظہار وہ اپنی صحبتوں میں برابر کیا کرتے تھے۔ وہی آپ تک پہنچی ہوں گی۔ پہلی شکایت سید صاحب کو یہ تھی کہ الہلال (دورِ اول) کے فلاں فلاں مشہور و مقبول مضمون سید صاحب کے قلم کے تھے بعد کو کسی مجموعہ میں چھپے مولانا کے نام سے اور مولانا نے اس انتساب کی تردید نہ کی۔ دوسرا اعتراض سید صاحب کو غبارِ خاطر اور تذکرہ کے متعدد بیانات پر تھا۔ مثلاً مولانا کا سفرِ عراق، یا مولانا کے بزرگوں میں فلاں فلاں بزرگ کا ہونا ان سب کو وہ افسانہ سمجھتے تھے اور اس ضمن میں مولانا کی ازہر میں تعلیم بھی آ جاتی اگرچہ اس روایت کی براہ راست ذمہ داری مولانا پر نہیں آتی اس طرح ترجمان القرآن کے وہ ذرا بھی قائل نہ تھے اور اس میں ان کے ساتھ اہل علم کا ایک بڑا گروہ تھا۔ ان سب کے علاوہ بعض شکایتوں کا تعلق مولانا کی ذاتی مذہبی زندگی سے ہے۔ مثلاً ترک نماز، ترک روزہ اور وہ شغل شبانہ جس کا نام نہ لوں گا۔ (اس کے متعلق روایتیں آخر تک ملتی رہیں اور ان صحبتوں کے محرمِ راز صرف آصف علی وغیرہ تھے)، ہاں صاحب وہ ——— ندوی کون سے ہیں! جواب تک مولانا کی طرف سے صاف نہیں ہو سکے ہیں۔ اس کا جواب ضرور دیجئے گا۔ ایک اور بھی بات عرض کر دوں۔ جس سے بہت سی باتوں کا جواب از خود نکل آئے گا۔ انسان کی زندگی میں دور طرح طرح کے آتے رہتے ہیں اور جس نے صرف پہلے دور دیکھے ہیں وہ اکثر اگلے دوروں کا تصور بھی نہیں کر سکتا ایک مجھی کو لیجیے میری موجودہ وضع قطع کو دیکھ کر کون یقین کر سکتا ہے کہ ایک زمانہ میں شدید ملحد رہ چکا ہوں اور اس سے بھی قبل اپنے اسکولی دور میں ایک اچھا ایکٹر! تو بس یہ سمجھ لیجیے کہ سنہ ۲۵ء، سنہ ۲۶ء بلکہ سنہ ۳۵ء، سنہ ۳۶ء کے بھی ابوالکلام سنہ ۱۲ء، ۱۳ء والے ابوالکلام سے بالکل ہی مختلف تھے۔ ان کی ذہانت، فطانت

طباعی ہر دور میں نمایاں رہی ہے لیکن ان کی ثقاہت اس دور میں بہت ہی مشتبہ رہی۔ بالکل اگر آپ تھوڑی سی ناگواری برداشت کر لیں تو ایک موجودہ فاضل ندوی کا یہ فقرہ اس وقت کا نقل کر دیتے ہیں کہ وہ یہ حضرت تو اپنے وقت کے ابو زید السراجی ہیں" (سراجی مقامات حریری کا ایک مشہور کیریکٹر، چرب زبانی میں اپنی مثال آپ) سید صاحب چونکہ مولانا سے بہت زیادہ قریب رہے اس لیے ان کا تاثر اس قسم کا بہت بڑھا ہوا تھا۔

آپ سے عرض کروں گا کہ ایسے لوگوں کو (اور اب وہ دو ہی چار رہ گئے ہیں) زیادہ قابل الزام نہ سمجھیں۔ وہ ایک حد تک معذور ہیں۔ اور خبث نفس کے مجرم تو بہر حال نہیں۔

مولانا ذاتی طور پر میرے محسن رہے خصوصاً آخر زمانہ میں چنانچہ اس کا ذکر بھی میں نے اپنے مضمون کے آخر میں کر دیا ہے یاد رہ بات ہے کہ ان کی ساری کوششیں ناکام رہیں تاوقتیکہ خود پنڈت جی نے ان کی تائید نہ کی۔

ظاہر ہے کہ یہ خط محض نج کا اور صرف آپ کے ذاتی معلومات کے لیے ہے۔ یہ اثر شاید آپ کے خلوص ہی کا ہے کہ دل کھول کر آپ کے سامنے رکھ دیا۔

حدیث الغاشیہ والا مضمون تو بہت پرانا ہے، ۱۹۲۴ء کا آپ جس کا حوالہ دے رہے ہیں وہ ۱۹۲۲ء کا ہے (نہ کہ اتاترک مصطفیٰ کمال کی تنسیخ خلافت کے بعد۔ اس کا عنوان "النبأ العظیم" تھا اور اس کا پہلا نمبر خلافت (بمبئی) میں نکلا تھا اس میں تو تعریض مولانا محمد علی کی جوشیلی تائید خلافت پر تھی۔ مولانا محمد علی اس کا جواب لکھنا ہی چاہتے تھے کہ کچھ مخلصین نے درمیان میں پڑ کر اس سلسلے کو بند کرا دیا اور دوسرا نمبر ہی اس کا نہ نکل سکا۔

ہاں صاحب یہ چٹان کی ایک بات سے نہایت ہی ناخوش ہوا تھا اور دلی رنج کے ساتھ غصہ بھی محسوس کیا تھا یہ بوٹا سنگھ کو ہیرو بنانے کی کوشش دینی و دنیوی ہر اعتبار سے بہت ہی مکروہ

والسلام، دعاگو دعا خواہ،

عبدالماجد

مولانا کے ابتدائی دور (قیام بمبئی) کے ایک رفیق آغا حشر مرحوم تھے وہ ایسے ایسے قصے بیان کرتے تھے کہ مولانا کا کوئی معتقد انہیں برداشت نہیں کر سکتا۔ آغا سے مجھ سے ۱۹۳۵ء میں لکھنؤ میں خوب ملاقاتیں رہی تھیں۔ اسی عالم میں وہ مع اپنی کمپنی کے ٹھہرے ہوئے تھے۔

۸ راپریل ۱۹۵۸ء (۶) دریا باد ضلع بارہ بنکی

برادرم وعلیکم السلام

مکتوب کے جواب میں مقالہ اور مقالہ کیا پورا رسالہ لکھ ڈالا میرے شیر نے! میں نے بھی وقت نکال ایک نہیں دو نشستوں میں پڑھ ہی لیا۔ اول سے آخر تک۔ یہ ہمت ابھی کچھ کم نہ رہی۔

میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد!

غازی مسعود کو میں آپ کی طرف سے لکھے دیتا ہوں لیکن غضب یہ کیا کہ میں نے مانگا کچھ اور آپ نے بھیجا کچھ! میں نے تو مانگی مولوی مسعود علی کی اصل تحریر یا تقریر تھی جو اس مراسلہ کا باعث ہوئی اور آپ نے مرحمت کیا الٹا وہی مراسلہ:

روزنہ کی بدحواسی شاید ایسی ہی مثالوں کے دم سے اپنی شہرت قائم کیے ہوئے ہے.....

ہاں صاحب! عام الرائے کے لفظ میں ایک صریح فحش کنایہ بھی ہے مولانا شبلی کی نظر ادھر نہ گئی، ورنہ وہ ہرگز یہ لفظ نہ لاتے۔ الفاظ کے بارے میں بڑے محتاط تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد سے متعلق ایک ناگوار پھبتی بھی اسی زمانے کی مولانا نذیر احمد دہلوی کی جانب منسوب مجھ تک پہنچی ہے۔ واللہ اعلم صحیح یا غلط۔ راوی اگرچہ شیعہ ہیں لیکن بہ ظاہر ہر طرح ثقہ۔

مضمون کے بارے میں میرے تامل کو خدا کے لیے کسی تصنع و تکلف پر محمول نہ کیجیے۔ صرف میری معذوریوں کو مستحضر کر لیجیے اکٹھی چار بار فرمائشیں اسی ابوالکلام نمبر کے لیے اس وقت تک موصول ہو چکی ہیں۔ ایسی ہی زور دار دہلی سے اور علی گڑھ سے اور لاہور سے، دوسری فرمائشوں کا ذکر ہی نہیں، جو ڈھاکے سے اور کراچی سے دوسرے مخصوص نمبروں کے لیے مسلط ہو چکی ہیں۔

آخر انسان ہوں جن کیونکر بن جاؤں۔ دو چار سطریں دوسرے کاغذ پہ گھسیٹے دیتا ہوں ہاشم سلمہٗ علی گڑھ میں آنے پر آپ کا خط انہیں دکھا دوں گا۔

والسلام، دعاگو، عبدالماجد

(۷)

مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب "انڈیا ونس فریڈم" کے ردعمل "آزادی ہند" کے نام سے ایک کتاب رئیس احمد جعفری نے مرتب کی تھی لیکن سرورق پر مولانا آزاد کی تصویر کے ساتھ ان کا نام بھی چھاپ کر یہ تاثر دیا گیا کہ یہ مولانا کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ شاید یہ حرکت ناشر کی ہو۔ اسے علمی حلقوں میں سخت ناپسند کیا گیا۔ عبداللہ بٹ نے اس پر سخت احتجاج کیا۔ شورش مرحوم نے بھی چٹان میں اس پر سخت تبصرہ کیا۔ اس میں ذکر

مولانا دریابادی کا بھی آگیا تھا کہ جعفری صاحب مولانا دریابادی کے مخصوص ارادت مندوں اور مخلصوں میں تھے۔

دریاباد
۱۲ اکتوبر ۱۹۵۹ء

بسم اللہ

کیوں حضرت یہ کیا ہی تماشا کہ اپنی زندگی کا شوق اپنے اس نیاز مند پر ہیں تو وہ "آزادیٔ ہند" کی شکل تک دیکھنے کا گنہگار نہیں پھر گرم گرم بحث کی لپیٹ میں میرا ذکر خیر آگیا میں اس کا محمل سمجھ سکا نہ عمل۔

بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ

ظاہر ہے کہ چٹان ۱۴ ستمبر سنہ کے وسط کا ہے۔

منیجر صدق حکیم عبدالقوی سلمہٗ ابھی لکھڑی سواری لاہور گئے تھے آپ کے ہاں بھی حاضر ہوئے تھے اتفاق سے آپ موجود نہ ملے۔

والسلام دعاگو:
عبدالماجد

(۸)

مولانا دریابادی مرحوم کا درج ذیل مکتوب شورش مرحوم کے جس خط کے جواب میں تھا یہاں اسے بھی درج کر دیا جاتا ہے شورش مرحوم کا یہ یکم کا خط تھا لیکن مولانا دریابادی نے اس کا راست جواب دینے کے بجائے اسے اپنے جواب کے ساتھ ۲۳ اپریل ۱۹۶۵ء کے صدق جدید میں چھاپ دیا شورش مرحوم نے اپنے جواب الجواب کے ساتھ یہ خط چٹان کی اشاعت ۳ مئی ۱۹۶۵ء میں چھاپ دیا تھا۔

مکتوب شورش

یکم اپریل ۱۹۶۵ء

مکرم و محترم مولانا السلام مسنون

ابھی ۲۶ مارچ کا صدق نہیں ملا، ایک دوست سے پتا چلا تو یہ شمارہ منگوا کر دیکھا صفحہ ۷ پر دارالعلوم ندوہ کے ایک صاحب کا مراسلہ اور آپ کی وضاحت دونوں میرے سامنے ہیں۔

ا۔ ہم نے جو کچھ چٹان میں آپ کے حوالے سے درج کیا وہ آپ ہی کے قلم سے ہے، اور میں وہی دستے ـــ

۲۔ میں نے آپ کو لکھا تھا کہ آپ مولانا ابوالکلام آزاد کے نام پر رح کا نشان کیوں نہیں دیتے۔ اس کا استعمال کن بزرگوں پر ہوتا ہے، اور معیار کیا ہے؟ آپ نے جواب میں جو کچھ فرمایا وہ میرے پاس محفوظ ہے اس میں قصہ بھر ہیر پھیر نہیں کیا گیا۔ میں افترا پرداز پر لعنت بھیجتا ہوں۔

آپ نے جواب پوسٹ کارڈ پر لکھا ہے، اور مختصر ہے۔ اب سیاق و سباق کے نام پر گریز و فرار جائز نہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں آپ نے مذکورہ پوسٹ کارڈ لکھا ہے اور اس میں مولانا کا نام موجود ہے۔ آپ نے اب جو پوزیشن لی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ پاکستان میں اپنے کسی معتمد، مخلص اور مسئول دوست یا عزیز کو ہدایت فرمائیے کہ وہ میرے ہاں اس خط کو ملاحظہ کر لیں۔ ڈاک کی مہر اور آپ کا قلم دونوں صاف ہیں۔ یہ خط شائع کیا گیا، تو مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کو مزید پریشانی اور پشیمانی ہوگی۔ کہیے آپ کی رائے کیا ہے؟ افسوس ہے کہ آپ اپنا ہی لکھا بھول جانا چاہتے ہیں۔

۱۵ اپریل ۱۹۶۵ء تک آپ کے جواب کا منتظر رہوں گا جواب نہ ملا تو میں یہ سمجھوں گا کہ آپ کے حافظے نے تسلیم کر لیا ہے واضح رہے کہ میرے پاس آپ کے تین خط اور بھی ہیں جن میں مولانا سے متعلق آپ کے دل کا غبار موجود ہے۔

والسلام

المخلص: شورش کاشمیری

جواب

(از عبدالماجد)

مہربان نامہربان او علیکم السلام

شرفا کے ہاں دستور یہ ہے کہ ہر تلخ سے تلخ بحث کا بھی خاتمہ معذرت پر ہو جاتا ہے، خصوصاً معذرت غیر مشروط پر ـــــــ معذرت کر دی گئی، اُمید پوری نہ ہوئی۔

"گریز" اور "فرار" اور اس قبیل اور اس قبیلے کے سارے ہی لغات کے بے محابا استعمال میں آپ کو جو ملکہ حاصل ہے۔ اس میں آپ سے مقابلہ کی مجال کس کو ہے ـــــ اپنا عجز تو تمام تر مسلم ہے۔

رہا نفس جواب، تو اس کے بارے میں فیصلہ تو جبھی ہو سکتا ہے، جب سائل کے اصل الفاظ بھی سامنے ہوں ـــ اور ہاں اگر سائل سے بے تکلفی ہے، تو کبھی اس کے عقیدہ کے غلو کی اصلاح بھی زیرِ نظر ہوتی ہے، پھر تاثر اگر یہ دیا جا رہا ہے کہ جواب کا تعلق مولانا کی ذات سے مخصوص و محدود تھا، تو یہ سو فیصدی باطل ہے۔ اس کے بجائے تمام عمرو بکر، کسی کا بھی سوال میں ہوتا ضابطہ کے لحاظ سے سب کے لیے جواب ایک ہی ہوتا، اور خود مجیب کے حق میں تو سب سے بڑھ کر۔

"دل کا غبار" معلوم نہیں، آپ نے کس چیز کا نام رکھا ہے ظاہر ہے کہ مولانا مرحوم کو اُن کے سارے کمالات کے اعتراف کے ساتھ معصوم تو سمجھا جانے سے رہا۔ جیسا کہ کسی بھی فاضل محترم کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ یقیناً موصوف کی کچھ کمزوریوں ہی کا ذکر ہوگا۔ اب اگر کوئی اپنے ممدوح، محبوب، مقتدا کے مثالب کو شائع کرنے ہی پر تُل جائے۔ گو ایک رقیب روسیہ کی زبان سے تو اس کا ہاتھ کون پکڑ سکتا ہے؟ —— البتہ عقیدت و اخلاص کی یہ ایک نئی قسم ہوگی۔

سنہ ۱۸ء کے قبل جو کچھ بھی ہوا ہو اس کے بعد سے ادھر سے یہ احتیاط رہی تھی کہ حتی الامکان کوئی مخالفانہ بیان پبلک میں نہ آنے پاتے۔ اور مولانا میرے ایسے ہی مخدوم و محترم ہو گئے تھے جیسے اس دور کے بہت سے دوسرے ادیب و خطیب، عالم و فاضل، لیڈر اور رہبر —— احتیاط تو آپ تک کے باب میں یہ رہی کہ شکایتی مراسلے میں نام نہ آپ کا آنے دیا، نہ آپ کے پرچے کا ——

اب رہی میری "مزید پریشانی و پشیمانی"، تو اس کی سعی و اہتمام جس کا حصہ ہو چکا۔ اسے اب کسی تکلف، تامل و تذبذب کی ضرورت کیا ہے ؎

راضیم من شاکرم من اے حریف
پیش تو رسوا و پیش حق شریف،

مقصود آپ کی تحریر کا آپ یقین فرمائیں کہ اب بھی نہیں سمجھا۔ یعنی آخر آپ ثابت کیا کرنا چاہتے ہیں۔ اگر مختصر لفظوں میں آپ اسے فرما دیں، تو ممکن ہے کہ بات بہت جلد صاف ہو جائے یوم الحساب جس طرح مجھ پیر فرتوت سے دُور نہیں، اسی طرح آپ کے سے جوان سال سے بھی نہیں۔ اور عجب نہیں کہ یہ سب مولانا مرحوم کے عین مواجہہ میں ہو، کہ ہم دونوں میں ظالم کون ہے اور مظلوم کون۔

بحث کی بنیاد آپ نے میری ایک نجی تحریر کو رکھا ہے اس لیے جواب بھی اپنی نجی حیثیت میں دے رہا ہوں۔

جواب الجواب

اُوپر کا خط اور اس کا جواب ناظرین کرام پڑھ چکے ہیں۔ میرا خط مولانا کے نام ذاتی تھا، برائے اشاعت نہ تھا۔ لیکن مولانا شرافت اور شرفاء کے حوالے تو دیتے جاتے ہیں۔ شرافت کے ادنیٰ تقاضوں کو سمجھنے کی تکلیف بھی گوارا نہیں کرتے۔ بہرحال ایک شریف کے لیے شرافت کا

واسطہ بڑی چیز ہے۔ ہم اس بحث کو اس توقع پر ختم کرتے ہیں کہ مولانا خود بھی شرافت کے تقاضوں کا پاس رکھیں گے، اور مولانا ابو الکلام کو معصوم نہ سمجھنے کے باوجود ان کے ذکر میں حفظِ مراتب کا لحاظ ضرور ملحوظ رکھیں گے۔

گر حفظِ مراتب نہ کنی زندیقی

شورش کاشمیری

پروفیسر عطاء اللہ، پرنسپل اسلامیہ کالج جھنگ (پاکستان)

کالج میگزین "البصیر" کے شبلی نمبر کے لیے مضمون کی فرمائش کے جواب میں

۱۸ اکتوبر سنہ ۶۳ء — دریاباد، ضلع بارہ بنکی

جنابِ والا! وعلیکم السلام

آپ خدا کے لیے میرے اوپر رحم فرمائیے، کوئی ہفتہ ناغہ نہیں جاتا کہ ہندوستان و پاکستان سے مضمون فرمائش نامے اسی طرح کے "حقوق" کے واسطے سے نہ آتے ہوں! اسے "صدق" میں بار بار اپنی معذرت لکھ چکا ہوں، اسے آپ حضرات پڑھنے کے قابل نہیں سمجھتے۔ مستقل وقت معذرت ناموں ہی کے لکھنے میں صرف ہو جاتا ہے پیام "شبلی نمبر" کے بجز خدمت تھا مستقل تقاضا کی فرمائش میرے اوپر صریح ظلم کرنا ہے۔

والسلام

عبد الماجد

نہالی صاحب (پرتاب، دہلی)

مکتوب الیہ کے ایک کالم مطبوعہ "پرتاب" دہلی کے جواب میں

۱۰ مارچ سنہ ۶۳ء — بسم اللہ — دریاباد، بارہ بنکی

جناب من! تسلیم

کل ایک صاحب نے کانپور سے "پرتاب" کا ایک تراشہ ارسال فرمایا ہے جس پر تاریخ درج نہیں۔ اس میں اگر تو گرا نہ مانئے، کالم میں نہالی صاحب کے قلم سے صدق و مدیر صدق پر اور جو کچھ گہر افشانی کی گئی ہے اس پر میں کچھ نہ کہوں گا، صرف آنجناب بادب دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ یہ جو بار بار میری جانب منسوب کیا گیا

ہے کہ میں اپنا وطن پاکستان کو سمجھتا ہوں، تو براہِ کرم ارشاد ہو جائے کہ میری ایسی تحریر آپ نے کہاں دیکھی ہے؟ وہیں نے لکھا ہے کہ 'مولانا پاکستان گئے تھے، تو ان کے ایمان میں تازگی آگئی تھی، اور انہوں نے لکھا تھا کہ اپنا وطن آخر اپنا وطن ہے۔ وہ ہندوستان میں رہتے ہیں لیکن اپنا وطن پاکستان کو سمجھتے ہیں'، سو یہ عبارت یا اس کے قریب قریب بھی میرے سفرنامہ کے کس صفحہ، کس سطر میں ہے؟ سفرنامہ نہ سہی، صدق کے کس نمبر میں؟ بڑا شکر گزار ہوں گا، اگر آپ پورا حوالہ مجھے لکھ بھیجیں گے۔

نیاز کیش:

عبد الماجد

آل احمد سرور (علی گڑھ) (۱)

۲۶ جولائی ۱۹۵۹ء دریاباد

کرم گستر! السلام علیکم

"ہماری زبان" ۲۲ جولائی ۱۹۵۹ء پیشِ نظر ہے۔ کتاب کا سرورق حسب ذیل ہے۔ "ضلع جگت ۱۳۲۳ھ مصنفہ عالی جناب معلی القاب راجہ رایان مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر کے سی آئی ای، یمین السلطنت پیشکار وزیر اعظم دولت آصفیہ المتخلص بہ شاد، تلمیذ حضرت آصف خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ در مطبع اعظم دکن طبع شد۔"

۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵/۱۹۰۶ء کے پڑتا ہے، حجم ۲۲×۱۸/۸ سائز پر ۷۵ صفحہ دو کالمی ہے، مہاراجہ شاد اس فن کے مانے ہوئے اُستاد تھے۔ اصلاً جلیل جانشین امیر کی تصنیف ہے، لفظ "جگت" پر مرزا شوق لکھنوی کا ایک شعر رسالہ کے دیباچہ سے آپ کے صفحات میں نقل ہو چکا ہے، دوسرا شعر بھی ان ہی شوق لکھنوی کا سن لیجیے ؎

میرے پیچھے نہ اس طرح پڑیے ... اور جا کر کہیں جگت لڑیے

رسالہ کے خاتمہ پر اپنے نسخہ میں چند فقرے اس خاکسار نے بھی اضافہ کر دیے ہیں۔ مثلاً تیر و کمان کے ضلع میں: میری خطا نہیں۔ کثیر اپلاؤ۔ سوامی رام تیرتھ بڑے شخص تھے۔ عبارت قوسین میں لکھیے۔ دروزہ میں تکلیف ہوتی ہے۔ نان خطائی کھائیے وغیرہ۔

میرے نسخہ پر بہ کثرت حاشیے ایک باکمال لکھنوی نے قلم اور پنسل سے لکھ دیے ہیں۔ لکھنؤ میں اب بھی دو ایک اس فن کے اُستاد موجود ہیں۔

ہمارے بزرگوں میں مولانا سید سلیمان ندوی باوجود اپنی ساری ثقاہت و متانت کے اس فن میں طاق تھے اور نام لینا اگر بالکل ہی بے ادبی میں داخل نہ ہو تو اب کیا عرض کروں کہ ہمارے اور اُن کے شیخ طریقت مولانا تھانوی بھی مناسبتِ لفظی کے بادشاہ تھے۔

والسلام

عبد الماجد

(۲)

۲۸ اپریل ۱۹۶۶ء بسم اللہ دریاباد

مکرم بندہ!

آپ کا ۲۲ کا پرچہ پیشِ نظر ہے اس کے ایک مراسلے میں سابق کے ایک مکتوب نگار سید فضل الحسن کے مکتوب ۲۲ مارچ کی چار عبارتوں پر گرفت کی گئی ہے، عبارتیں یہ ہیں:

(۱) ابھی حال میں (۲) کوئی اعلیٰ پایہ کا خوشخط (۳) ایک اہم ترین (۴) موئے قلم کی کاوش۔

مجھ کم سواد کو ان چاروں میں زبان کی کوئی بھی غلطی نظر نہ آ سکی۔ "حال" میں تاکید و زور کا اضافہ محاورہ روزمرہ میں بالکل جائز ہے، اور "موئے قلم کی کاوش" کی غلطی تو اور بھی سمجھ میں نہ آئی۔ فصحاء کا استعمال لغت صرف و نحو کے قاعدہ پر حاکم ہے محکوم نہیں۔ "اہم" اردو میں لازمی طور پر افعل التفضیل نہیں، "اہم تر" اور "اہم ترین" دونوں بالکل درست ہیں۔

والسلام

عبد الماجد

(۳)

الٰہ آباد میں ہندوستانی اکیڈمی کا جلسہ تھا جس میں سرور صاحب تشریف نہ لے جا سکے تھے۔ اسی کی روداد بیان فرمائی۔

۱۲ اگست ۱۹۶۶ء بسم اللہ دریاباد

برادرم! السلام علیکم

ادھر آپ پٹنے گئے اُدھر یہ نیاز مند پٹنے کے قریب پہنچ گیا ۳۲ دانتوں میں ایک زبان کٹی تھی، ۳۱ جولائی کو الٰہ آباد میں دیکھنے میں آئی۔ اردو کا حق تنہا نمائندہ یہ بے زبان، آپ نے شرکت نہ کر کے ظلم کیا اُردو پر، اُردو اکیڈمی پر اور خود اپنے پر، کون جانتا تھا کہ یہ غم سرور کے ہاتھوں اٹھانا پڑے گا۔ والسلام

عبد الماجد

(۴)

لفظ چورنی

چوٹے کے لیے مونث چوٹی تو مستعمل ہے لیکن چور کا مونث کہیں نظر سے نہیں گزرا البتہ شاہ رفیع الدین دہلوی قدیم مترجم قرآن کے ترجمہ قرآن مجید کے ایک ایڈیشن میں السارقۃ کے لیے لفظ چورنی نظر سے گزرا۔

شاہ صاحبؒ کا شمار اہل زبان میں ہے اس لیے تنہا ان کی سند کافی ہے لیکن اگر ایک آدھ سند کہیں اور سے مل جاتی تو دل کو مزید اطمینان ہو جاتا۔ پھر یہ امر بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں کہ شاہ صاحبؒ کے ترجمہ کے میں نے پانچ مختلف ایڈیشن دیکھے مگر یہ لفظ صرف ایک ایڈیشن میں ملا اور یہ ایڈیشن تاج کمپنی (لاہور و کراچی) کا مطبوعہ چھوٹی حمائل کی صورت میں۔

عبدالماجد

دریاباد ۔ بارہ بنکی

(۵)

حیدرآباد (دکن) کی ایک مشاق لکھنے والی کی خبر انتقال "ہماری زبان" (علی گڑھ) میں پڑھ کر

۲۵ جنوری ۱۹۶۲ء دریاباد

بسم اللہ

کرم گستر! السلام علیکم

جہاں بانو نقوی کے گزرنے کی خبر آپ ہی کے پرچے نے سنائی۔ انا للہ۔ مرحومہ کے اعزہ کا مجھے پتا نشان نہیں معلوم۔ آپ کا احسان ہوگا اگر آپ میری تعزیت کسی طرح ان لوگوں تک پہنچا دیں، اللہ مغفرت فرمائے۔ ماہ رمضان میں موت خوش نصیبوں ہی کے نصیب میں آتی ہے اور پھر کینسر سا موذی مرض تو خود ہی سارے گناہ دھو دیتا ہے۔ والسلام

عبدالماجد

(۶)

ترود صاحب کے والد مرحوم کے انتقال کی خبر پڑھ کر

دریاباد

۱۶ اردسمبر ۱۹۷۱ء

برادرم سلمہ! وعلیکم السلام

انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آپ کو خط لکھنے کو قلم سنبھال ہی رہا تھا کہ خود آپ کا خط مل گیا، سانحہ کی خبر میاں ہاشم قدوائی کے خط سے ہو چکی تھی، دعائے مغفرت اسی وقت کر دی تھی اب پھر کر دی۔

باپ کا سہارا بہت بڑا سہارا ہوتا ہے جب تک زندہ رہتا ہے لڑکے کا سن جو کچھ بھی ہو جائے وہ اپنے کو لڑکا ہی سمجھتا رہتا ہے، پوری فکریں اور ذمہ داریاں اس کے اٹھ جانے کے بعد ہی اپنے سر آ پڑتی ہیں خوش نصیب ہے وہ اولاد جس کو اتنے سن تک باپ کی خدمت کا موقع ملتا رہے۔

بہرحال اب اللہ ہی مغفرت فرمائے اور ہر طرح سے معاملہ رحمت کا رکھے۔

والسلام، دعاگو، عبدالماجد

جوش ملیح آبادی (کراچی)

(۱)

مولانا دریابادی نے جوش کے ترک شراب نوشی کی خبر پڑھ کر بابائے اردو مولوی عبدالحق کی معرفت انہیں یہ خط لکھا تھا لیکن افسوس کہ یہ خبر صحیح نہ تھی۔

دریاباد

۲۷ ستمبر ۱۹۵۹ء بسم اللہ

برادرم! السلام علیکم

کیا بتاؤں کتنی مسرت "قومی زبان" میں ترک بادہ نوشی کی خبر پڑھ کر ہوئی، مخلصانہ مبارک باد بصدقِ دل سے پیش ہے۔

ایسی شے جو مزیلِ عقل ہو ہرگز کسی صاحب فہم و ادراک کے شایانِ شان نہیں ہے۔ اب دوسری خوشخبری سننے کے لیے بھی مشتاق و منتظر ہی نہیں دعاگو ہوں، آپ کی شرافت پر مجھے ہمیشہ اعتماد رہا ہے اور میرا وجدان یقین کے ساتھ کہہ رہا ہے کہ جس قلم سے وہ زبردست ولولہ انگیز و وجد آفریں نعت نکل چکی ہے، ناممکن ہے کہ وہ اپنے مالک و مولیٰ کے حضور میں منکر و مکذب، باغی و طاغی کی حیثیت سے حاضری دے ـــــ وہ سعدی، حافظ، جامی، خسرو، ڈاکٹر اقبال و حسرت ہی کی صف میں محشور ہوگا۔ پتا معلوم نہ تھا خدا کرے اس پتے سے پہنچ جائے۔

والسلام

دعاگو: عبدالماجد

(۲)

دریاباد

۱۱ فروری ۱۹۶۱ء بسم اللہ

حضرت جوش سراپا ہوش!

ورود لکھنؤ کی خبر اور وہاں کی بزم آرائی لکھنؤ کے اخباروں سے معلوم ہوئی ـ

ہم سے بہ دو رہا غیروں سے ملاقات رہی

اگر یہ معلوم ہوتا کہ ابھی قیام لکھنؤ میں رہے گا تو ضرور ملاقات کیلئے وقت نکال کر سفر اختیار کرتا

یہ بھی علم نہیں کہ لکھنؤ میں قیام ہے کہاں؟

اندازے سے یہ کارڈ بھیج رہا ہوں۔

سعدی کا مصرع اگر ذہن سے نکل گیا ہو تو تازہ کر لیجیے ع

قدیمان خود را بیفزائے قدر

والسلام، دُعاگو،

عبدالماجد

(۳)

دریاباد

۳۱ اکتوبر ۱۹۶۱ء

بسم اللہ

برادرم! وعلیکم السلام

والانامہ ملا، ساتھ ہی نمونۂ لغت اردو بھی پہنچا! انشاء اللہ جلد ہی پڑھ کر کچھ نہ کچھ عرض کروں گا۔

بعض پاکستانی تنقیدیں پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے نقادوں کا زاویۂ نظر۔

قصور ڈھونڈھ کے پیدا کیے جفا کے لیے

خوردبین سے دیکھئے تو حسین سے حسین چہرہ بھی داغدار نظر آسکتا ہے۔ علالت کے ذکر سے تشویش خاطر ہوئی، لیکن نثر میں "خدا کرے" اور نظم میں "معبود" تو بڑی ہی امید افزا علامتیں ہیں۔

دنیا سے اٹھنا تو سب ہی کا برحق ہے لیکن دعا ہے کہ جوش کا بلاوا جب اُدھر سے آئے وہ رکسی "صہبا گسار، سزاوارِ نار" کا نہیں بلکہ رومی، خسرو اور اقبال کی صف میں شامل ہونے اور کسی کے ذکر جمیل میں رطب اللسان رہنے والے کا ہو اور اس دُعا کے مقبول ہونے سے مایوس ہرگز نہیں۔

والسلام

عبدالماجد

(۴)

برادرم! وعلیکم السلام

اردو نامہ پہنچا رہتا ہے اور اسی سے آپ کی مطبوعات کا بھی پتا چلتا رہتا ہے "مرآۃ العروس"

"منتخب الحکایات"، کے نئے ایڈیشن وغیرہ۔

نسخہ پہنچا اور اس کو معمول سے بہتر پایا۔ ذوالفقار صاحب نے حضرت اکبر پر تو خوب لکھ ڈالا۔ قابل داد ہی نہیں، بلکہ قابل رشک بھی۔ یہ سب تو مجھے لکھنا تھا۔ نہ ہوا کہیں کا بادشاہ، نہیں تو ان کا منہ موتیوں سے بھر دیتا۔

بعض دوسرے مضامین بھی بہت خوب ہیں۔ دلچسپ بھی، معلومات افزا بھی۔

لغت کے باب میں آپ لوگوں کو کیا رائے دے سکتا ہوں۔ تاہم اپنے سن سے فائدہ اٹھا کر کچھ نہ کچھ تو عرض کیے ہی دیتا ہوں۔

اہل لغات نے بہت سے مستعمل الفاظ خواہ مخواہ چھوڑ دیے ہیں۔ آپ کے جامع لغت میں ان سب کو جگہ ملنا چاہیے۔ مثلاً رکوع (رکن نماز نہیں بلکہ آیت اور پارے کی طرح ایک تقسیم قرآنی کے معنی میں)

محاذ: جنگی [illegible] کے معنی میں اخباروں میں کثرت سے چل گیا ہے۔ موجد غالباً سید جالب مرحوم ایڈیٹر ہمدم تھے۔

شیتیا (c. olla) قصباتی زبان میں سجھاؤ کے مترادف ہے۔

بیٹرن: ادنیٰ درجہ کی ہندو بیسواؤں کی ایک ذات۔

حالیہ ([illegible]) کے معنوں میں۔

سنسنی خیز: زبان میں داخل ہو چکا ہے موجد غالباً ظفر علی خاں۔

چشمہ سار
پارچہ
تلنگا
رامشگر — یہ سب سرشار وغیرہ کے ہاں استعمال میں آچکے ہیں۔ اب البتہ کچھ متروک سے ہو گئے ہیں۔

ہٹی ہے (رہے ہی کے بجائے زبان پر برابر مستعمل ہے)

تلفظ میں جہاں جہاں دو دو مستعمل ہوں دونوں دیے جائیں۔ مثلاً ۱۱ اور ۱۲ کا تلفظ میں نے لکھنؤ اور دہلی دونوں جگہ باراں اور گیاراں (نون غنہ کے ساتھ) بھی سنا ہے۔ اسے نظر انداز کر دینے کی کوئی وجہ نہیں۔

بولنا، حیدرآباد میں کہنے کے معنی میں ہے۔ یہ بھی ضرور درج ہونا چاہیے۔ لیجیے میں لقمان کو حکمت سکھانے لگا۔

والسلام

۹ دسمبر ۱۹۶۱ء عبدالماجد دریاباد۔ ضلع بارہ بنکی

ہاں ایک لفظ اور خیال میں آیا۔

بیتا، لکھنؤ میں یہ لفظ بارہا سنا ہے۔ اہل لغت نے خدا معلوم کیوں چھوڑ دیا ہے۔

رنڈی، یہ لفظ پہلے اپنے عموم میں "عورت" کے مترادف تھا۔ اب صرف بیسوا کے معنی میں رہ گیا ہے۔

اس طرح کے بکثرت لفظ ملیں گے۔ بعض کے مفہوم کہیں وسیع سے محدود ہو گئے ہیں، اور کہیں محدود سے وسیع۔ یقیناً آپ کے جامع، محققانہ لغت میں ان کی تصریح ہو گی۔

یہ خط ڈاک میں جا ہی رہا تھا کہ حقی صاحب کا عنایت نامہ موصول ہوا تعمیل ارشاد کی صورت آسان نہیں۔ بہرحال اپنی والی کوشش کروں گا۔

عبدالماجد

(اردو نامہ، کراچی، جنوری ۱۹۶۲ء)

دریاباد (۵)

۱۲ جنوری ۱۹۶۲ء بسم اللہ

برادرم! وعلیکم السلام

بے شک وہ غلط فقرہ زبان قلم پر آگیا تھا جوش صاحب ملیح آبادی ہی ہونا چاہیے تھا نہ کہ جوش ملیح آبادی صاحب۔ اصلاح کا دلی شکریہ اور اصلاً یہ خط اسی کے لیے ہے ورنہ اور کوئی خاص ضرورت اتنی جلد جواب کی داعی نہ تھی۔

اور اس پر ایک واقعہ بھی سن لیجیے۔ میرا بچپن تھا کہ داغ کی وہ غزل شائع ہوئی جس کا مطلع تھا۔

دلبر سے جدا ہونا یا دل کو جدا کرنا
اس سوچ میں بیٹھا ہوں کہ آخر مجھے کیا کرنا

ریاض الاخبار اُس وقت دھوم دھام سے نکل رہا تھا۔ ریاض نے اعتراض کیا کہ زبان "کیا کرنا" نہیں "کیا کرنا ہے"۔ داغ نے نجی کے خط میں جواب دیا کہ مطلع میرا کہا ہوا ہے اور یہ جاننے کے بعد آپ کوئی مزید سند ضروری سمجھتے ہیں؟ ریاض نے جواب الجواب میں لکھا کہ یہی تو میری عرض ہے کہ یہ زبان آپ کی نہیں۔ اگر آپ کی ہے تو اپنے ہزارہا اشعار میں کہیں سے اس کی نظیر دے دیجیے بس میں قائل ہو جاؤں گا۔ یہ آپ کی زبان ہی نہیں ہے۔ دکھنیوں کی بولی سنتے سنتے بس یہ غلط محاورہ بھی آپ کی زبان پر چڑھ گیا اور بے خیالی میں قلم سے نکل گیا ——— اس پر داغ کو خاموش ہو جانا پڑا۔ تو برادرم جب یہ صورتحال داغ جیسے

مستند اہل زبان کو پیش آسکتی ہے تو مجھ سے دیہاتی کا بھلا کیا ذکر ہے خدا جانے کتنی غلطیاں دانستہ و نادانستہ کرتا رہتا ہوں اور آجکل کی اخباری زبان سے تو بس اللہ ہی اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

کراچی تک کی رسائی یوں بھی آسان نہ تھی اور اب تو دشوار تر ہو گئی ہے۔ ع

راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

ایک ممکن صورت یہی ذہن میں آئی ہے کہ آپ کی مجلس اگر کبھی یہاں کے دو چار مستند ادیبوں (مثلاً حضرت اثر لکھنوی) کو ہفتہ دو ہفتہ کے لیے بغرض مشورہ مدعو فرمائے تو کمیوں کے ساتھ گھن کی طرح یہ نیاز مند بھی اڑتا پڑتا کسی طرح وہاں پہنچ جائے۔

ہاں صاحب اگر کتاب شوکت آرا بیگم آپ کی مجلس از سر نو شائع کرا رہی ہو تو اس کے صلہ یا معاوضہ کے ذمہ دار و مستحق عبدالرؤف کاکوروی کو نہ بھول جائیے گا۔ والسلام

عبدالماجد

دریاباد (۶)

۹ جنوری ۱۹۶۲ء بسم اللہ

برادرم! السلام علیکم

یہ ۱۱ جنوری کے مفصل نیاز نامہ کا ضمیمہ ہے۔

اس خط میں داغ کے شعر کا دوسرا مصرع قلم سے غلط نکل گیا، صحیح یہ ہے۔

ع اس سوچ میں بیٹھا ہوں آخر مجھے کیا کرنا

"کہ" اس میں زائد لکھ گیا۔ والسلام

عبدالماجد

دریاباد (۷)

۸ دسمبر ۱۹۶۲ء بسم اللہ

حضرت سلامت! تسلیم

اردو نامہ تازہ پرچہ نمبر ۱۰ موصول ہوا۔ نور اللغات میں ص ۵۴ میں اکابر و مشاہیر ادب کے ساتھ ایک عامی کا حوالہ دیکھ کر حیرت اور ندامت دونوں سے گڑ گیا، یہ کیا کیا آپ لوگوں نے۔ خواہ مخواہ اپنی کتاب کا

معیار اتنا گرا دیا۔

اب۔ غزل ہمہ سے تھوڑا سا رگڑہ بھی سُن لے

ص۶۳ پا ۶۳ ابلیس ..... آدم کی پیدائش سے پہلے عبادت کی بدولت فرشتوں کے زمرے میں شامل اللہ کا معلم ہوگیا تھا۔ یہ ساری عبارت بالکل بے سند اور محض عوام کے عامیانہ عقیدہ کی ترجمان ہے۔ ابلیس حسب تصریح قرآن جن تھا (کان من الجن) اور جن ہی آخر تک رہا اس کا فرشتہ و مغضوب ہونا تمام تر مسیحی عقیدہ ہے۔

ص۷۵ کی "ابے تبے" کے ذیل میں یہ سہواً جھوٹ تو نہیں گیا؟
ابے تبے کرنا، تو تکار کرنا، بدزبانی کرنا، ڈانٹ ڈپٹ کرنا؟
فقرہ، آپ تو گالم گلوچ پر اتر آئے اور لگے ابے تبے کرنے۔

والسلام

عبدالماجد

شمس تبریز خاں لکھنؤ

(۱)

الہلال کے سلسلۂ بحث "خلد و کرب یا لذت و الم" کے سلسلے میں سوال کا جواب

۷ر اکتوبر ۱۹۵۹ء

مہربان بندہ! وعلیکم السلام

اب ان پرانی فراموش شدہ بحثوں کو از سر نو زندہ کرنے سے کوئی حاصل نہیں۔ بات اتنے عرصے کی ہوگئی کہ تفصیلات اب مجھے یاد بھی نہیں۔ ۴۵، ۴۶ سال کی مدت کچھ تھوڑی ہوئی؟ اور نہ اب اس موضوع سے کوئی خاص دلچسپی ہی رہ گئی ہے۔ آپ کے رفع انتظار کے لیے بس اتنا لکھے دیتا ہوں کہ اہل علم ولز کے دو گروہ اس وقت تھے۔ ایک کے ساتھ صاحب الہلال تھے، دوسرے کے ساتھ یہ بے علم خاکسار وہی اختلاف ذوق شاید اب بھی قائم ہو۔ مسئلہ صرف ایک پہلو کی ترجیح کا تھا نہ کہ کسی فریق کی یکسر تغلیط و تردید اور پھر اس میں شدت کا مظاہرہ جس حد تک میری طرف سے ہوا ہو، اللہ اسے معاف فرمائے۔

مکتوب الیہ کی مراسلت میں مولانا نے ذہنی و فکری یگانگت محسوس کرکے ملاقات کے لیے لکھنؤ آنے کو لکھا۔

مکتوب الیہ اس وقت گونڈہ میں تھے۔

۱۸ر ستمبر ۱۹۶۷ء

"..... اس بڑے مضمون کے بعد مجھے ضرورت ملاقات کی محسوس ہو رہی ہے کہ آپ کو ذرا پہچان تو سکوں، ماہ اکتوبر کا بیشتر حصہ لکھنؤ میں انشاء اللہ گزرے گا اگر بآسانی فرصت مل سکے تو وہاں کا سفر مقابلہ دریاباد کے آسان تر ہوگا۔ علی میاں وغیرہ سے بھی ملاقات کا امکان ہے، ندوہ کی سیر بھی ہو جائے گی۔ گونڈہ سے لکھنؤ آمد و رفت کا بل میرے ذمہ، جیسا کہ بہت سے عزیزوں اور ان کی طالبعلمانہ زندگی کے لیے رکھتا ہوں۔"

دُعاگو،

عبدالماجد

(۳)

مراسلت میں طویل وقفے کے بعد مکتوب الیہ کا خط ملا تو مولانا نے تحریر فرمایا

یکم اکتوبر ۱۹۷۰ء

مشفقی! وعلیکم السلام

میں تو معمول تعلقات کی طرف سے بھی مایوس ہو کر اب صبر کر چکا تھا۔ آج ہی لکھنؤ کا پروگرام ہے۔ چار ہفتے کے لیے، ملاقات کا وقت تو وہی سہ پہر کا رہ گیا ہے .....

(۴)

مراسلت میں غیر معمولی وقفے کے بعد مکتوب الیہ کا خط آیا تو مولانا نے جواباً تحریر فرمایا

۴ر اگست ۱۹۷۱ء

عزیزم! وعلیکم السلام

ایک عرصۂ دراز کے بعد خط ملا، شروع میں مہینوں میں منتظر رہا کیا، پھر یہ سمجھ کر چپ ہو گیا کہ کوئی قصور میری طرف سے ایسا ہوا ہوگا جو اُدھر کی اس رنجش و بیزاری کا باعث بن گیا، اور کوئی بات قابل ذکر نہیں.....

والسلام

عبدالماجد

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری (کراچی)

مکتوب الیہ کے نام چند خطوط حکیم عبدالقوی دریابادی کے بھی ہیں چونکہ ان سے مولانا دریا
بادی کے حالات پر روشنی پڑتی ہے، نیز سلسلے کے بعض مباحث کے تسلسل کے لیے ان
کا مطالعہ ضروری تھا، اس لیے وہ بھی شامل کر لیے گئے ہیں۔

(۱)

۹ر نومبر ۱۹۶۳ء — دریاباد، ضلع بارہ بنکی (یو۔پی)

کرم گستر وعلیکم السلام

مجمۂ پیر فرتوت "معاند و حاسد" کا نشریہ خدا کرے آپ ار کو سن چکے ہوں۔ اس میں ایک
فقرہ یہ بھی آپ کی سماعت میں آ گیا ہوگا کہ قدرت نے جسے بڑائی کے لیے پیدا ہی کیا تھا۔ ابھی
کم سن ہی تھے کہ تحریر و تقریر دونوں کی دھوم مچ گئی ...... خدنگ نظر ...... لسان الصدق
...... الندوہ کے کوچہ علم و فضل میں آ نکلے تو ایڈیٹر بنے بغیر ہی ایڈیٹر بن گئے۔"

کیا آپ اس فقرہ پر رضامند نہیں! میں آپ کے اس فقرے پر رضامند ہو گیا تھا کہ
"الندوہ کے عملاً ایڈیٹر رہے ہیں"

مکتوبات سلیمانی تو گویا چھپ چکی۔ ہفتہ ہی عشرہ میں ان شاء اللہ شائع ہو جائے گی۔ دیکھ
کر آپ خود ہی فیصلہ کر لیں گے۔ ۳۰۰ سو صفحہ کی کتاب میں مولانا ابوالکلام کا ذکر چار پانچ مقام
سے زیادہ نہیں اور وہ بھی زیادہ تر صرف ابتدائی خطوط میں۔ ۱۲ء، ۱۴ء والوں میں۔ وہاں بھی
میں نے اپنے حواشی میں تلخیوں کو زیادہ سے زیادہ ہلکا کر دینے کی کوشش کی ہے۔ اور ایک
لمبا خط جو خود مولانا نے اپنی صفائی میں سید صاحب کے نام لکھا تھا، درج کر دیا ہے۔ اور اس
سے مولانا کی تمام تر عظمت و شرافت ہی نکلی ہے۔

دنیا کو کیسے یقین دلاؤں کہ مولانا میرے مکرم و محترم تھے۔ بلکہ ۲۰ء، ۲۱ء میں تو میرے
محسن بھی بن گئے تھے۔ ۲۱ء وغیرہ میں ایک لمبی مدت تک میں وہ برابر خلافت کمیٹیوں کے جلسے
میں شریک ہوتے رہے اور کہیں میرے ان کے اختلاف کی نوبت نہ آئی حالانکہ میں شریک
محمد علی کی پارٹی میں تھا۔ مولانا ابوالکلام اس وقت بڑے صدر تھے (یعنی آل انڈیا) اور میں
چھوٹا صدر (یعنی صوبۂ اودھ کا)۔ حشر میں ان شاء اللہ اس کا فیصلہ خود مولانا ہی پر چھوڑ
دوں گا۔

مولانا کے میرے نام کے خطوط بھی کیا ان ظالموں نے نہیں پڑھے؟ بعد کے زمانہ کا ذکر
نہیں، خود ۲۱ء ہی میں، کیا ایسی مراسلت دشمنوں کے درمیان ہوتی ہے؟

مجھے ان مرحوم سے جو کچھ اختلافات تھے۔ وہ سب ۱۸ء تک، بلکہ اس سے قبل ہی
ختم ہو چکے تھے۔ اس کے بعد میری کوئی بھی پبلک تحریر مولانا کی مخالفت میں نہ ملے گی۔ بلکہ نج
کی تحریروں میں بھی احتیاط رکھنے لگا۔ مرحوم کی وفات کے بعد جب دیوبند کے ایک صاحب
نے خط میں مولانا سے متعلق ایک بہت چلی ہوئی اور زبان زد عوام روایت سے متعلق تحقیق
کرنا چاہی تو میں نے جواب لکھ دیا، کہ یہ کیا ضرور ہے کہ مجھے مولانا کی زندگی کے ہر ہر جزئیہ کی
اطلاع ہو، اور بالفرض ہو بھی تو کیوں میں اپنے سارے معلومات کو آپ کی طرف منتقل کرنے لگوں!

البتہ آپ کے اس عموم و اطلاق سے اتفاق مشکل ہے کہ کسی بھی شخصیت سے متعلق کوئی
بھی ناگوار حصہ کتاب میں نہ آنا چاہیے۔ ایسا کسی بھی تاریخ یا تذکرہ کی کتاب میں کیوں کر ممکن ہے؟
کم سے کم اردو میں اب تک جتنے بھی "مکتوبات" چھپ چکے ہیں۔ شبلی، اقبال، محمد علی،
عبدالحق، مہدی، اکبر، وغیرہ کے، یہ سب موغتش قرار پا جاتے بلکہ رقعات غالب میں بھی قتیل،
صاحب برہان قاطع وغیرہ کا ذکر کن الفاظ میں ملتا ہے؟ اتنا ظرف و تحمل تو ہر پارٹی کے اشخاص
میں بہرحال ہونا ہی چاہیے۔

اپنی "میر دبل" میں تین جگہ مولانا کا نام لایا ہوں، کہیں بھی بے ادبی کے ساتھ؟ آئندہ
"معز دکن" میں بھی تین مقام پر تذکرہ ہوئے گا۔ اور ان شاء اللہ ہر جگہ ذکر خیر ہی ہوگا۔

خط خلاف عادت اتنا طویل ہو گیا اور اس میں بڑا وقت لگ گیا۔

شاہ جہان پور سے مجھے بھی ایک نسبت حاصل ہے۔ میرے دادا مفتی مظہر کریم،
ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں، وہیں کلکٹری یا سر رشتہ دار تھے۔ اور کہا یہ جاتا ہے کہ "باغیوں" کے مشورے
انھیں کے مکان پر ہوتے تھے۔ صحیح یا غلط اسی الزام میں ان پر مقدمہ چلا اور کئی سال کے
لیے کالے پانی بھیجے گئے۔ میرے والد کی پیدائش بھی غالباً وہیں کی ہے۔ اکرام اللہ خان ندوی،
ظہور احمد وحشی ندوی، دونوں مرحوم میرے مخلصوں میں تھے۔ اور ڈپٹی الطاف حسین خاں
میرے ساتھ کے کھیلے ہوئے ہیں۔ اور متعدد شاہ جہاں پوریوں سے تعلقات اب قائم ہیں۔ والسلام

دعاگو

عبدالماجد

(۲)

مکرم و محترم! وعلیکم السلام۔ مزاج گرامی

۱۴ر دسمبر کا مکتوب گرامی ملا۔ اس سے تین یا چار دن قبل عم محترم مولانا دریابادی کے حسب ہدایت ایک نسخہ مکتوبات سلیمانی حصہ اول کا آپ کی خدمت میں تحفۃً بذریعہ رجسٹرڈ پیکٹ ارسال کر چکا تھا۔ خدا کرے یہ پیکٹ بخیریت پہنچ جائے۔

آپ کا ایک مراسلہ آیا تھا۔ وہ ان شاء اللہ صدق کی کسی قریبی اشاعت میں درج ہوگا۔ وہ پرچہ روانہ خدمت کروں گا۔

مجھے بھی آپ سے کراچی میں ملاقات نہ کر سکنے کا بڑا افسوس رہا۔ ان شاء اللہ اگر اگلے سال آنا ہوا تو ضرور ملاقات کروں گا۔ جمیاً ستمبر یا اکتوبر ورنہ نومبر میں میرا کراچی آنا ہر سال ہوتا ہے۔

مولانا کے سفر حیدرآباد کی روداد ابھی صدق میں نکلنی شروع نہیں ہوئی ہے۔

نیازمند

حکیم عبدالقوی

(۳)

مکتوب الیہ کا ایک سلسلۂ مضمون علامہ سید سلیمان اور مولانا ابوالکلام آزاد سے متعلق سہ روزہ مدینہ بجنور میں نکل رہا تھا۔ اس خط میں اور اس کے بعد کے دو خطوں میں ذکر اسی کے بعض مطالب کے بارے میں ہے۔

۸ر فروری ۱۹۶۴ء

کرم گسترا! السلام علیکم

مدینہ میں آپ کے یہ "معلومات" نظر پڑے کہ سید صاحب "اس خط کے شائع نہ کرنے کی وصیت فرما گئے تھے"۔ حلف شرعی ہے۔ عرض ہے کہ یہ بات آج بالکل پہلی بار میرے علم میں آئی ہے۔ بہ طور نصیحت و مجہول روایت کے بھی آج تک نہیں سنی تھی۔

آپ نے یہ چھاپ کر کتنی بڑی ذمہ داری میرے سر ڈال دی اور ایک مخصوص طبقے کے ہاتھ میں کتنا بڑا حربہ دے دیا اور اس طرح نادانستہ کتنا بڑا ظلم خود اپنی شرافت اور ثقاہت پر کر گزرے۔ والسلام

عبدالماجد

(۴)

۲۲ر فروری ۱۹۶۴ء

کرم گسترا! وعلیکم السلام۔

خط میں کوئی بات جواب طلب نہ تھی۔ پھر بھی یہ خیال کر کے کہ شاید آپ جواب کے متوقع و منتظر ہوں، یہ لکھے بھیجتا ہوں۔

اپنی کتابوں پر ریویو عموماً اور عادۃً نہیں پڑھتا۔ بس کسی سے ان کا خلاصہ و ماحصل زبانی سن لیتا ہوں۔ اس کتاب کی صورت دوسری ہے۔ آپ کے مضمون کا پہلا نمبر پڑھا تو بہت ہی سرسری یعنی بیچ بیچ سے چھوڑ کر۔ اتفاق سے اس خاص فقرہ پر نظر پڑ گئی اور وہ بہت ہی کھٹکا۔ اس لیے کہ ایک ذمہ دار اور شریف قلم سے تھا۔ بعد کے طویل نمبروں کے لیے وقت اتنا بھی نہ نکال سکا اور محض برائے نام ہی مطالعہ پہ قناعت کرنا پڑی۔ والسلام

عبدالماجد

(۵)

۱۲ر مارچ ۱۹۶۴ء

کرم گسترا! السلام علیکم

کل ایک صاحب نے آپ کے تازہ مضمون کا ایک فقرہ دکھلایا کہ دریابادی کا خیال ہے کہ یہ تمام غلط فہمیاں ۱۵ء ۱۸ء میں دور ہو گئی تھیں، لیکن واللہ اعلم آپ نے یہ خیال کہاں سے اخذ کر لیا۔ میں نے تو اپنے اور مولانا کے تعلقات کے سلسلے میں کہا تھا کہ فلاں سنہ سے میرے اختلافات ختم ہو چکے تھے۔ سید صاحب اور مولانا کے تعلقات سے اس بیان کو کوئی واسطہ ہی نہ تھا۔ والسلام

عبدالماجد

(۶)

اس خط کے نمبر ۵ میں مولانا دریابادیؒ نے جو چیلنج دیا ہے اس کے بارے میں کیا عرض کیا جائے؟ سلیمانی جماعت کے رکن آلود ...ابی تھے۔ خود انہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے ایک مرید باصفا مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی مرحوم و مغفور کو ابوالکلام کی منقبت کے سلسلے میں خبیث القلم اور سیاہ باطن کے القاب سے یاد فرمایا ہے، کیا یہ سب شتم اور صریح گالی نہیں؟ شورش کاشمیری مرحوم نے ... وفات میں بیسیوں مضمون لکھے لیکن سید صاحب مرحوم کے لیے ہر جگہ عقیدت و احترام ہی رہا ہے۔ حالانکہ خود مولانا دریابادی کا بیان ہے کہ سلیمان ندوی مرحوم مولانا آزاد سے اپنی شکایتوں اور رنجشوں کا ذکر اپنی صحبتوں میں کیا کرتے تھے "کیا کرتے تھے" یعنی سید صاحب مرحوم کی عادت مستمرہ تھی جس نے پاکستان گئے اور مرتے دم تک ان کا پیچھا نہیں چھوڑا، اگر چہ اس شکایت کو غیبت کے سوا کوئی اور نام

نہیں دیا جاسکتا لیکن مولانا آزاد کے کسی معتقد کی زبان یا قلم سے کوئی سخت یا اخلاق و تہذیب سے گرا ہوا جملہ ڈھونڈھے سے نہ ملے گا لیکن جب شورش مرحوم نے مولانا دریابادی سے شکوہ کیا کہ آپ اپنے قلب کی ناراضگی کے لیے سید صاحب جو ناگفتنی میں کیوں تکتے ہیں تو مولانا اپنے ٹوٹتے ہوئے قلم کی دہائی دیتے ہیں اور معتقدین کو حد کے بیچ پکارتے ہیں اور معتقد خصوصی شورش مرحوم کو خدا کی گرفت کی وعید سناتے ہیں۔ اس کی گزارشات کو رکیک تنقید، اس کے شکوے کو جا سوزی، اور اس کے وجود کو شرافت و سنجیدگی کا مدفن قرار دیتے ہیں۔ (دیکھیے رقعات ماجدی ص ۶۷، ۶۸)

ابھی پچھلے سال پاکستان کے سفر کے موقع پر سید صباح الدین عبدالرحمن نے حیدرآباد سے شستہ رہتے ہوئے کار کے سفر میں حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ کے بارے میں معلومات کے جو دریا بہائے لا رکھے ہیں، اس کی گواہی اللہ کے ذریعہ دیں گے۔ غرضیکہ مولانا دریابادی اور سید سلیمان ندوی (مرحومین) کی نجی صحبتوں اور ان کے معتقدین کے اخلاق کے سرپرستی رازداں سے پردہ تو سید سلیمان ندوی سے تنقید و تبصرہ کی زد میں آ جائے گا، یہاں مولانا دریابادی کے چیلنج کا جواب تھا، ان کے اپنے الفاظ اور ان کے ایک معتقد کے الفاظ میں۔ اسے پڑھ کر ایک صاحب نے کہا: "الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے" کی کیا خوب مثال ہے۔

نمبر ۶ میں اشارہ مولانا غلام رسول مہر کی طرف ہے۔ مولانا نے یہ خط واپس منگوا لیا تھا اور دیکھ کر اسے بعینہٖ چھاپ دینے کی اجازت دے دی تھی، لیکن مولانا دریابادی نے اسے چھاپنا مناسب نہیں سمجھا۔

۱۴ مارچ ۱۹۶۲ء

مہربان بندہ وعلیکم السلام

۱۔ نعمت اللہ خاں کا مراسلہ محض ان کے اصرار شدید پر چھاپنا پڑا۔ مہینوں سے آیا ہوا تھا۔ ذہنی ناگواری کا اظہار صاف اپنے ادارتی نوٹ میں کر دیا تھا۔ موضوع کی اتنی اہمیت میری نظر میں نہ تھی کہ اس پر مستقل سلسلۂ بحث جاری رکھا جائے۔ میرے معلومات جو تھے، وہ پہلے لکھ چکا ہوں۔ دوسروں نے اپنے اپنے خیالات شائع کر دیے۔ بس بات ختم۔ قوم و ملت کا کون سا اہم مسئلہ اس دعوے کے ثبوت و عدم ثبوت پر معلق ہے؟

۲۔ مکاتیب سے متعلق جو باتیں آپ نے لکھیں، یقین فرمائیے کہ بالکل پہلی بار میرے علم میں آ رہی ہیں۔ میں نے آج تک یہ افواہیں بھی نہیں سنی تھیں۔ بڑا ہی فرق ہمارے آپ کے ذرائع علم میں ہے۔

۳۔ جی بار بار چاہتا ہے کہ آپ کا پورا سلسلۂ مضامین پڑھوں۔ طوالت و ضخامت کو دیکھ کر بس ہمت جواب دے جاتی ہے

۴۔ مکتوبات کو پڑھ کر مکتوب الیہ سے متعلق جو بہت سخت مضمون ذہن میں تھا، اس کی میری طرف سے تو اجازت ہے۔

۵۔ سلیمانی جماعت کے کسی فرد کے قلم سے اگر سب و شتم اس کا آدھا چوتھائی بھی نکلے، جیسا اب تک ابوالکلامی جماعت کے بعض افراد کی طرف سے ہو چکا ہے، تو مجھے ضرور اس کی نشان دہی کیجیے۔

۶۔ لاہور ہی کے ایک پرانے اہل قلم اور آپ ہی کی جماعت کے ایک اہم رکن کا طویل نجی مکتوب آیا ہوا ہے۔ جس میں سید صاحب پر بھی خاصی تنقید ہے، مگر سنجیدہ و شریفانہ۔ میں نے شائع کرنے کی ان سے اجازت مانگی ہے۔ مل گئی، تو بعض ناموں کو حذف کر کے چھاپ دوں گا۔ والسلام

عبدالماجد

(۷)

پچھلے مکتوب میں بعض جملے پڑھے نہ جا سکے تھے۔ دریافت کرنے پر مولانا نے جملے صاف کر کے لکھوا دیے اور نیچے کی سطر اپنے قلم سے تحریر فرمائی۔

۱۔ کہ اس پر مستقل سلسلۂ بحث جاری رکھا جائے۔

۲۔ اہم مسئلہ اس دعوے کے ثبوت و عدم ثبوت

۳، ۴۔ مکتوبات کو پڑھ کر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مضمون ذہن میں تھا۔

۵۔ تو مجھے ضرور اس کی نشان دہی کیجیے۔

۶۔ اہم رکن کا طویل نجی مکتوب۔

ان عبارتوں کو دوبارہ لکھوا کر بھیج رہا ہوں اور اپنی بدخطی پر عفو خواہ ہوں۔ والسلام

عبدالماجد

۱۴-اپریل ۶۲ء

(۸)

۲۲ر اپریل ۱۹۶۲ء

کرم گسترا وعلیکم السلام

آپ کا یہ حسن ظن صحیح نہیں کہ میں ہر ایک کے خط محفوظ رکھتا ہوں۔ آپ کی فرمائش کی تعمیل یوں بھی مشکل ہی تھی چہ جائیکہ جب میرے پاس خطوط موجود ہی نہ ہوں۔

اپنے ہی کاموں کے لیے وقت نہیں نکال پاتا۔ ان بحثوں میں پڑنے کے لیے وقت کہاں سے لاؤں۔ آپ سے بہ منت التجا ہے کہ میرے اوپر رحم فرما کر مجھے بالکل ہی معاف فرما دیں۔

نعمت اللہ خاں صاحب کے خط میں اپنی مظلومیت پر جو فریاد کی تھی اور جسے انھوں نے آپ کے خط میں غصہ سے تعبیر کیا ہے، ظاہر ہے کہ اس کا تعلق آپ کی کسی تحریر سے نہ تھا۔ والسلام

معذرت خواہ :

عبدالماجد

(۹)

دہلی سے اجمل خاں صاحب نے "مولانا آزاد کے نام ادبی خطوط و جوابات آزاد" کے نام سے ایک مجموعہ چھپوایا تھا۔ اس میں مولانا دریابادی کے نام بھی چار خطوں کے جواب مولانا آزاد کی جانب سے مگر اجمل خاں کے قلم سے تھے۔ چنانچہ مولانا دریابادی سے دریافت کیا تھا کہ شاید ان کے پاس یہ اصل خطوط اور دیگر خطوط ہوں گے۔ یہ مضمون اگلے خط میں بھی آیا ہے۔

۲۹ دسمبر ۱۹۶۷ء

مکرم بندہ! علیکم السلام

مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے خود مولانا کا لکھا ہوا کوئی بھی خط چھوڑا ہو، صرف دہی خط چھوڑ دیے تھے، جن میں عبارت مولانا کی نہیں، بلکہ ان کے دفتر کے کسی صاحب کی ہے اور وہ تمام تو سرکاری یا دفتری خط ہیں۔ مولانا ان پر صرف دستخط کے گنہ گار ہیں۔

دہلی کے نئے مجموعے کی بھی مجھے خبر نہیں۔ اگر ایسا کوئی خط اجمل خاں صاحب نے چھاپا ہے تو میرے پاس سے تو انھیں ملا نہیں۔ بہر حال آپ کی خاطر سے بعدِ رمضان ایک بار پھر وقت نکال کر اپنے کاغذات کو کھنگالنے کو تیار ہوں۔ بشرطیکہ اب بھی کچھ ایسے خطوط محفوظ مل جائیں۔ ادھر چند سال کے عرصہ میں بہت سے محفوظ خطوط کچھ میری بے پروائی اور کچھ دیمک وغیرہ کے باعث تلف بھی ہو چکے ہیں۔

دفتر کو لکھنؤ کہے دیتا ہوں کہ مکتوبات سلیمانی حصہ دوم "تحفۃً" آپ کی خدمت میں بھیج دی جائے۔ والسلام

دعاگو و دعا خواہ :

عبدالماجد

(۱۰)

مولانا دریابادی مکتوبات سلیمانی مجھے تحفۃً بھیجنا چاہتے تھے۔ میں نے بتایا کہ وہ تو میں نے حاصل کر لیا۔ آپ اس کے بجائے اپنا دوسرا رسالہ "سیرۃ نبوی قرآنی" مجھے عنایت فرمادیں۔ محض اس لیے کہ مولانا یہ خیال نہ فرمائیں کہ تحفہ لینے سے انکار ہے۔

۱۷ جنوری ۱۹۶۸ء

مکرم بندہ! وعلیکم السلام

آپ کا خط بڑے موقع سے آگیا۔ دفتر سے یہ سُن کر کہ مکتوبات آپ خرید چکے ہیں۔ میں تو سوچ میں پڑا ہوا تھا کہ آپ ہی نے مناسب حل پیش کر دیا۔ "سیرۃ نبوی قرآنی" کے لیے ابھی دفتر کو کہے دیتا ہوں۔ بعد تفسیر کے اسی کو اپنے لیے سب سے بڑا سرمایۂ سعادت سمجھتا ہوں۔

اجمل خاں صاحب کی کتاب سے اب تک ناواقف ہوں۔ خدا معلوم میرے کون سے ادبی خطوط مع جواب انھوں نے شائع فرما دیے ہیں۔ مجھے تو کوئی یاد ہی نہیں پڑتے۔

ہاں صاحب، مولانا مرحوم کے خطوط کا وہ ذخیرہ خدا معلوم میرے ہاں سے کیا ہو گیا۔ بعدِ رمضان میں نے بہت ڈھونڈھا دوسروں سے بھی ڈھونڈھوایا، اب تک تو پتا چلا نہیں ہے۔ گو میں ابھی مایوس نہیں۔

اور کیا بتاؤں کہ آپ سے کس درجہ شرمندگی مجھے ہو رہی ہے۔ زندگی میں ایسے ہی اتفاقات بے شان و گمان پیش آ ہی جاتے ہیں۔ انا للہ ثم انا للہ۔ والسلام

عبدالماجد

۱۲ اکتوبر ۱۹۶۸ء

(۱۱)

مکرم گسترا! وعلیکم السلام

ابھی ابھی آپ کا کارڈ موصول ہوا۔ اس میں آپ کے جس پچھلے خط کا حوالہ ہے، افسوس کہ وہ موصول ہی نہیں ہوا۔ خط کے ضائع جانے سے جو تکلیف کاتب اور مکتوب الیہ دونوں کو ہوتی ہے، وہ ظاہر ہی ہے۔ والسلام

دعاگو،

عبدالماجد

(۱۳)

جنرل محمد ایوب خاں کا عہد تھا۔ شورش کاشمیری مرحوم کو ان کے جرم حق گوئی میں گرفتار کر لیا گیا، چٹان کا ڈیکلریشن منسوخ ہوا اور پریس بھی ضبط کر لیا گیا۔ ادھر ان کے خلاف کراچی سے ایک صاحب کا نہایت سخت مراسلہ صدق میں چھپا، شبہ یہ ہوا تھا کہ مراسلہ نگار بدمی انصاری ہیں۔ مولانا نے اس خیال کی تردید کی نیز اس خیال کا اظہار کیا گیا تھا کہ یہ موقع انتقام لینے کا نہیں ہمدردی کرنے کا ہے۔ نمبر ۲ میں مولانا نے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

مولانا دریابادی کا یہ آخری خط ہے۔

۱۷ر اکتوبر ۱۹۶۸ء

مکرم بندہ وعلیکم السلام

جس مفصل خط کا آپ نے حوالہ دیا تھا، وہ اب جا کر موصول ہوا۔

ایک سرسری نظر، وقت نکال کر، شروع سے آخر تک کر گیا۔ توضیح صرف دو باتوں کی کر دینا چاہتا ہوں۔

۱۔ وہ مراسلہ بزمی بیچارہ کا ہرگز نہ تھا۔

۲۔ آپ کو کس طرح یقین دلاؤں کہ شورش صاحب کے اندر یا باہر ہونے کی ہرگز کوئی تحقیق، اس مراسلہ کی اشاعت کے وقت نہ تھی۔ ان کی گرفتاری اور ان کے پریس کی منبطی کی خبریں نظر سے گزری تھیں، پھر یہ بھی کہیں پڑھ لیا تھا کہ پریس چھوٹ گیا اور خیال غالب یہ قائم تھا کہ وہ بھی چھوٹ گئے ہوں گے۔

باقی آپ نے جو چیزیں لکھی ہیں، ان کا فیصلہ آپ ہی کے مشورے کے مطابق بجائے آج کے، کل ہی پر چھوڑتا ہوں۔ والسلام۔

عبدالماجد

(۱۳)

اب مولانا دریابادی کی زندگی ہی سے مراسلت حکیم عبدالقوی دریابادی، مرحوم کے جانشین مولانا کے بعد وادا سے شروع ہوتی ہے یہاں ان کے صرف چند خط شائع کیے جاتے ہیں۔

۲۱/۱۲/۷۸

مکرمی سلام مسنون

آپ کا ۱۶ر نومبر کا کارڈ عم محترم مولانا دریابادی کے نام موصول ہوا۔ ان کے حسب ارشاد جواب میں لکھ رہا ہوں۔

چونکہ آپ نے خط میں تحریر فرمایا ہے کہ پچھلے مضمون کی اشاعت آپ کے نزدیک مناسب نہیں ہے اور آپ اس کے بجائے دوسرا مضمون ارسال کریں گے۔ اس لیے اس کی اشاعت روک دی گئی ہے۔

مولوی رئیس احمد جعفری کی وفات سے سخت صدمہ ہوا۔ مرحوم میرے بھی بڑے کرم فرما تھے۔ انکے بھائی عقیل جعفری صاحب مقیم ڈرگ کالونی، کراچی کو میں نے تعزیتی خط لکھا ہے اور رئیس صاحب سے متعلق ایک تعزیتی مضمون میں نے روزنامہ قائد، لکھنؤ میں لکھا تھا اس کا تراشہ بھی انھیں بھیج دیا ہے۔

نیازمند:

حکیم عبدالقوی

۲۵/۳/۷۶

(۱۴)

محترمی وعلیکم السلام۔ مزاج شریف

گرامی نامہ ملا۔ عم محترم کی طبیعت ماہ گزشتہ زیادہ خراب رہی تھی۔ بلڈ پریشر بڑھ گیا تھا۔ اب خدا کا شکر ہے کہ طبیعت بہتر ہے۔ لیکن افسوس کہ اب زیادہ دماغی کام لکھنے پڑھنے کا نہیں کر سکتے۔ صدق کی ذمہ داری اب ایک حد تک میری طرف منتقل کر دی ہے۔ صدق کے تازہ پرچہ میں جواب کی جمعہ کو ان شاء اللہ حوالہ ڈاک ہو گا۔ اپنی علالت کی تفصیل وہ اپنے قلم سے لکھیں گے۔ ان کے حافظے پر بھی خراب اثر پڑا ہے۔ جس مسئلہ پر آپ نے لکھا ہے مرض کی اس حالت میں، اس پر ان سے گفتگو تقریباً بیکار ہی ہے۔ بہر حال آپ کی رائے سے میں متفق ہوں۔ دعا کیجیے کہ ان کی طبیعت جلد اس قابل ہو جائے کہ میں آپ کی اس تحریر کو ان کے سامنے پیش کر سکوں۔

فروغ اردو والوں نے وہ کتابیں مجھے دے دی تھیں اور ان کے عوض۔ مجھے مل گئے۔ آپ کے صدق کے چندہ میں یہ رقم شمار کر لی گئی ہے۔ اطلاعاً عرض ہے۔ پہلے ۲۰ پیسہ کے ٹکٹ میں صدق پاکستان جاتا تھا۔ لیکن اب تین ہفتہ سے تیس پیسہ فی اخبار ٹکٹ لگنے لگا ہے۔ ۲۰ پیسے ٹکٹ والے جو پرچے ارسال کیے تھے، سب واپس آ رہے ہیں۔ اس لیے اب صدق کا چندہ پاکستانی

خریداروں سے عذر کہیں نا نذر کرنا پڑے گا۔ لیکن ابھی پاکستان میں وصولی چندہ کا انتظام نہیں ہو سکا ہے۔

کتابوں کی تجارت ابھی بند ہے اور اس وقت ڈاک کا محصول بہت زیادہ ہے۔ اس لیے کتابوں کے سلسلہ میں فرمائش کی تعمیل فی الحال نہ ہو سکے گی۔ علاوہ ازیں اخبار ی کاغذ کی شدید گرانی و نایابی، عام گرانی اور حمِ محترم کی علالت کے باعث صدق انتہائی نازک مالی دور سے گزر رہا ہے۔ دعا فرمایئے۔

نیاز مند،
حکیم عبد القوی

<u>پروفیسر محمد اشرف خاں (پشاور)</u>

خط کے پہلے نمبر میں "سید صاحب" سے علامہ سید سلیمان ندوی مراد ہیں۔ دوسرے نمبر میں شیخ اشرف سے اشارہ لاہور کے انگریزی کتابوں کے مشہور پبلشر شیخ محمد اشرف کی طرف ہے۔ مکتوب الیہ اپنی انگریزی کتاب "انڈو عرب ریلیشنز" چھپوانا چاہتے تھے اس سلسلے میں مولانا دریابادی سے کسی مناسب پبلشر کے بارے میں دریافت کیا تھا تیسرے نمبر میں مولانا نے اپنا مفصل نظام اوقات تحریر فرمایا ہے۔ نمبر ۴ میں جس ادارے کے قیام کا ذکر ہے، وہ برائے نام قائم تو ضرور ہو گیا۔ اگرچہ سید صاحب کے شایانِ شان نہیں پانچویں اور آخری نمبر میں ڈاک خانے کی مہر میں "دشبل" کی اسپیلنگ میں غلطی کی درستگی کی طرف اشارہ ہے۔ مکتوب الیہ کا بیان ہے کہ اس غلطی کی طرف انھوں نے توجہ دلائی تھی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

<u>شروع ۱۲ دسمبر</u> دریاباد ضلع بارہ بنکی

ختم ۱۴ دسمبر عزیز مکرم! وعلیکم السلام

۱۔ سید صاحب سے میرے تعلقات یگانگت عزیزوں کے سے تھے۔ اس لیے جو ان کا یگانہ ہو وہ میرے لیے بیگانہ نہ رہا۔

۲۔ شیخ اشرف اچھے پبلشر ہے مزید اپنی کتاب کے لیے ان سے مراسلت کیجیے۔

۳۔ اس بے بضاعت کا نظام اوقات حسبِ استفسار بے تکلف عرض ہے۔ صبح تڑکے ایسے وقت اٹھنا کہ نماز فجر سے قبل ½ گھنٹہ چہل قدمی بھی کر لی اور اس میں

تھوڑا بہت کچھ پڑھ بھی لیا۔ با وضو ہوتا ہوں واپس ہوتے ہی نماز فجر شروع کر دی — روزانہ پھر نہ کچھ ورزش اپنے سن، جثہ اور قوی کے متناسب لازمی ہے بہت دیر کے بعد اور بہت نقصان اٹھا کر یہ سبق سیکھ سکا۔ بعد فجر بر لتے نام کچھ پڑھا پڑھا کہ چند منٹ بعد ناشتہ آگیا۔ اب تک چلنے کا عادی تھا۔ اب چند روز سے بجائے چلنے کے محض گرم پانی میٹھا کر کے شروع کیا نفع اس کا بھی وہی یعنی رفع قبض اور چائے کے مضرات سے نجات "درکنگ ڈے" اسی وقت سے شروع ہو جاتا ہے۔ یعنی اخبار رسالہ وغیرہ ناشتہ کے ساتھ ساتھ پڑھتا جاتا ہوں اس کے بعد لڑکیاں سلام کو آئیں کچھ پڑھنے کا کام انھوں نے کیا اور کچھ باتیں ان سے عام تربیت کی ہو گئیں۔ اب خطوں کے جوابات لکھے۔ اور متفرق کام (حوالہ کی کتابیں تلاش کر رکھیں جن کی دن میں ضرورت پڑے گی۔ وغیرہا) ساڑھے نو پہ ڈاک روانہ کر دی تازہ وضو کے بعد بیوی بچوں سے مختصر ملاقات کرتا ہوں۔ دوسرے کمرے میں آیا جو اصل تصنیف گاہ ہے۔ یہاں دس سے دو بجے تک مسلسل لکھتا ہی رہتا ہوں۔ زیادہ تر قرآن مجید کے سلسلے میں کبھی دن کچھ اور۔ (ڈیڑھ بجے نماز ظہر (دن کا کھانا وقت بچانے کے خیال سے سالہا سال سے ترک کر دیا ہے۔) بعد نماز ظہر ہلکا سا ناشتہ جو کام میں مخل نہ ہو۔ بعد ناشتہ پھر متفرق کام عموماً صدق کا۔ جس زمانہ میں لڑکے اور لڑکیاں موجود ہوتے کوئی آدھ گھنٹے کے وقت ان کے لیے فرداً فرداً ان سے ہر قسم کی آزادانہ بات چیت ان کے ذاتی مسائل ([illegible]) پر گفتگو۔ کبھی کبھی درس مثنوی بھی۔

اس کے بعد نماز عصر پھر تازہ ڈاک آگئی جس میں اخبارات اور رسالوں کی بھرمار ہوتی ہے انگریزی اور اردو روزنامے ہی ہند و پاکستان کے ملا کر ۲۵ ہوتے ہیں۔ سہ روزہ، ہفت روزہ ان کے علاوہ، سات آٹھ تو بغیر پڑھے ردی میں ڈال دیتا ہوں پھر بھی اچھے خاصے پڑھنے پڑتے ہیں۔ مغرب سے آدھا گھنٹہ قبل برآمدے میں بیٹھ جاتا ہوں وہ وقت عام ہوتا ہے ڈاک بھی ساتھ ساتھ دیکھتا جاتا ہوں۔

بعد مغرب فوراً ہی کھانے پر بیٹھ جاتا ہوں اور دانتوں کی خرابی کے باعث دیر تک کھاتا رہتا ہوں ضعفِ بصارت کے باعث رات کا پڑھنا لکھنا کئی سال سے موقوف ہے۔ کھانے کے بعد برائے نام چہل قدمی چھت پر کر لی اور پھر نیچے آکر بیوی اور لڑکیوں کے پاس بیٹھ گیا۔ ان سے باطمینان ملنے کا یہی وقت ہوتا ہے لڑکیوں نے دن میں جو کچھ پڑھا تھا۔

(حضرت تھانویؒ کے وعظ، مثنوی کے ترجمے کی برابر تاکید رہتی ہے) اُسے میرے سامنے دہراتی ہیں اور بہت سی باتیں کام کی بحمداللہ ہو جاتی ہیں۔ گھنٹہ سوا گھنٹہ کے بعد عشاء کے لیے آیا۔ بعد نماز بیوی تھوڑی دیر کے لیے آجاتی ہے ان سے ملنے کا یہی وقت ہوتا ہے۔ وہ اُدھر گئیں اور ادھر میں سونے لیٹ گیا۔

یہ پروگرام ظاہر ہے کہ ہر ایک کے لیے قابل عمل نہیں تاہم بہ اختلافِ احوال کسی حد تک نمونہ کا کام انشاءاللہ دے سکے گا۔ حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کا جتنا احسان مند ہوں بس میرا دل ہی جانتا ہے دوسرے اہل ہمت تھے انھوں نے اُن سے دین لیا میں کم ہمت تھا میں نے دنیا اُن سے لی۔ انھوں نے زندگی بنادی تربیت اور تنظیم جو کچھ آئی ان ہی کے فیض سے ورنہ پہلے انتشار ہی انتشار تھا۔

دو ایک باتیں رہ گئی مہمانوں اور ملاقاتیوں کا مزید نظم قائم کیا جائے۔ میرے ہاں کوئی عزیز بھی بغیر اطلاع سابق مہمان نہیں آسکتا ہر ایک سے وقت پہلے ہی طے ہو جاتا ہے دوسرے ملاقاتیوں کے لیے وہی قبل مغرب آدھ گھنٹہ کا وقت مقرر ہے خاص صورتوں میں وقت پہلے سے مقرر کیا جاتا ہے تنظیم اوقات میں وقت شروع میں ضرور ہوگی لیکن رفتہ رفتہ لوگ عادی ہو جائیں گے۔ اور آپ کو انتہائی راحت ملنے لگے گی۔

لیجیے خط بہت ہی طویل ہو گیا۔ باقی باتوں کا مختصر جوابات دے کر ختم کیے دیتا ہوں۔

۴۔ سلیمان اکیڈمی کا خیال بہت ہی اچھا ہے لیکن محض خیال کی اچھائی کافی نہیں اصل اور اہم ترین سوال موزوں اور اشخاص کے ملنے کا ہے۔ اور پھر سرمایہ کا۔

۵۔ ڈاک خانے کی مہر کی اب اصلاح ہو گئی مدت دراز ہوئی کہ ایک ندوی نے جامعہ ملیہ سے اس پر توجہ دلائی میں نے فوراً اکیڈمی والوں کو لکھا۔ انھوں نے پوسٹ آفس سے مراسلت شروع کی، دفتری گھس گھس میں پورا ایک سال لگ گیا۔ اب خدا خدا کر کے تصحیح ہو پائی ہے۔ والسلام، دعاگو و دعاخواہ:

عبدالماجد

پیغامات

مولانا ابوالکلام آزادؒ

ماہی "اردو ادب"[1] علی گڑھ کے مولانا آزاد نمبر کے لیے پروفیسر آل احمد سرور کے نام

۱۸ اپریل ۱۹۵۸ء بسم اللہ

پیام

اردو ادب نے مولانا آزاد کی یاد میں جو خصوصی نمبر شائع کرنے کا ارادہ کیا ہے ہر طرح مبارک و قابل تحسین ہے۔ اس سے کم سے کم ایک ظلم کی تو کسی حد تک تلافی ہو جائے گی۔

اس دس بیس برس کے اندر اردو ادب کی تاریخ پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ آزاد نامے ایک بڑے ادیب و انشاء پرداز کی کوئی ہستی موجود ہی نہیں ہے! یہ کتنا بڑا ظلم ہوا ہے! یہ ظلم دو چار اور صاحبوں پر بھی ہوا ہے لیکن مظلومِ اعظم آزاد ہی ہیں۔

مولانا کی دینی و سیاسی خدمات کا جائزہ تو دوسرے بھی لے سکتے ہیں۔ لیکن ان کی ادبی اور انشائی خدمات کا صراحت و تفصیل سے جائزہ لینا آپ کے رسالہ کا خاص موضوع ہونا چاہیے۔ اتنا وقت کہاں سے لاؤں کہ خود شرح و بسط سے لکھوں۔ کچھ نہ کچھ بہرحال صدق میں لکھ ہی چکا اور آپ کے علاوہ چار چار جگہوں سے اور فرمائشیں آئی ہوئی ہیں۔ آپ کے رسالہ نے اگر یہ کام کر دیا تو گویا سب کی طرف سے ایک ادبی فرض کفایہ ادا کر دیا اور تاریخِ ادب کے دامن سے ایک بدنما دھبے کو دور کر دیا۔

مولانا کی انشا کے مختلف دور قائم کرنے لازمی ہیں، تین دور تو کھلے ہوئے ہیں اور شبلی اسکول سے ان کا تعلق واضح کرنا ضروری ہے۔ یہ ایک عجیب لطیفہ ہے کہ شبلی سے اتنا قریب اور متاثر ہو کر بھی مولانا ماورا اور غیر متاثر رہے۔ والسلام

عبدالماجد

---

[1] اردو ادب، انجمن ترقی اردو (ہند) کا سہ ماہی علمی مجلہ، اس وقت علی گڑھ سے پروفیسر آل احمد سرور کی ادارت میں نکلتا تھا، اب دہلی سے ڈاکٹر خلیق انجم کی ادارت میں نکلتا ہے۔ یہ پیام سرور صاحب تک نہ پہنچ سکا۔ "مکتوباتِ ماجدی" حصہ دوم ۱۹۸۲ء میں شامل ہے۔

حکیم محمد اجمل خاں

پیام بہ موقع یادگار برسی حکیم اجمل خاں مرحوم بہ نام حکیم عبدالاحد پرنسپل طبیہ کالج، پٹنہ

دریاباد۔

۲۶ رجنوری ۱۹۵۹ء

اجمل خاں کے ذکر جمیل سے اپنے کو تر زبان رکھنا خود اپنی خوش ذوقی اور احسان شناسی کا ثبوت دینا ہے اور اس کا اعلان کرنا ہے کہ آپ کا ادارہ حذاقتِ فن کا بھی قدر دان ہے اور شرافتِ نفس اور صحیح انسانیت کا بھی۔

مرحوم کا مونوگرام (MONOGRAM) کاغذات پر چھپا ہوا تھا "افضل الاشغال خدمت الناس" اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل پر کندہ تھا خدمتِ خلق میں دن رات لگے رہنا ان کا اوڑھنا بچھونا تھا اور یہی گویا ان کا ہمہ وقتی فریضہ۔

جلسۂ یادگار کی صدارت کے لیے بھی انتخاب ڈاکٹر ذاکر حسین کا خوب رہا جمالِ شرافت سے اسی طرح آراستہ و پیراستہ۔

حکیم صاحب کی یادگار اگر اخلاص سے منانا ہے تو خصوصی توجہ ان تین چیزوں پر لازمی ہے۔

(۱) ان کے مدرسہ طبیہ دہلی کی ہر طرح تعمیر و ترقی انھیں کی قائم کی ہوئی بنیادوں پر۔

(۲) ہندو مسلم اتحاد کا فروغ گاندھی جی کے قائم کیے ہوئے خطوط پر۔

(۳) جامعہ ملیہ اسلامیہ کی فلاح و ترقی اس کی قدیم خصوصیات کے ساتھ۔

والسلام

عبدالماجد

پروفیسر احتشام حسین

پیام نو، لکھنؤ کے لیے مضمون کی فرمائش پر اس کے ایڈیٹر مرزا جعفر حسین[۱] ایڈوکیٹ کے نام

دریاباد۔

۱۴ دسمبر ۱۹۷۲ء بسم اللہ

[۱] مکتوب الیہ پرانے مسلم نیشنلسٹ لیڈر ہیں اور شیعہ پولیٹیکل کانفرنس کے مدتوں جنرل سیکریٹری رہے ہیں۔ شیعہ سنی اتحاد کے زبردست حامی اور لکھنویات پر برابر "نیا دور" اور "آج کل" میں لکھتے رہتے تھے پروفیسر احتشام حسین مرحوم کے خاص دوستوں میں تھے "پیام نو" کا ہفتہ وار پرچہ نکالتے تھے جو اس کے بعد بھی جاری رہا۔

احتشام مرحوم کے فکر و فن پر لکھنے والے تو بہت سے ہوں گے میں اپنی طویل ذاتی واقفیت کی بنا پر صرف دو باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

۱۔ وہ بڑے اچھے کارکن اور کارگزار اردو کے حق میں تھے لشکر اردو کے بہترین سپاہی اور سپہ دار اُردو کے ہر محاذ پہ معرکہ آرا خدا معلوم کتنی اردو کمیٹیوں اور اداروں کے وہ دل دماغ بھی اور ہاتھ پیر بھی، بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق اردو کے بڑے بابا تو یہ چھوٹے بابا۔

۲۔ بہ حیثیت انسان بڑے ہی شریف النفس، شرافت کیا تھی ان کی کرامت تھی، سادگی، اخلاص، حسن سلوک و احسان، مروت اور خدمتِ خلق کے گویا پتلے تھے اور حفظِ مراتب میں تو اپنی نظیر آپ تھے۔

وہ سلسلۂ تقریب والی میری تقریر جلسہ گاہ ہی سے "قومی آواز" والے اڑا لے گئے مجھے دیکھنے کو بھی نہیں ملی[۱]۔

عبدالماجد

مولانا احسن مارہروی

پیام بہ نام ڈاکٹر انعام احسن صاحب، کراچی

دریاباد

۱۸ فروری ۱۹۶۰ء بسم اللہ

مارہرہ کا خطہ یوں بھی مردم خیز ہے احسن مرحوم اس عموم میں ایک مرتبۂ خصوصی رکھتے تھے۔

داغ کے شاگردِ رشید ہی نہیں زبان میں ان کے ہم زبان، غزل گوئی کے میدان میں فرد اور ادب کے صاحب نظر استاد۔

ان کا یہ مقطع کبھی کا کان میں پڑا ہوا بھلانے سے بھی نہیں بھولتا ؎

اپنی تصویر کی تقدیر پہ کیوں رشک نہ آئے
وہ منگا لی گئی احسن کو بلایا نہ گیا

والسلام عبدالماجد

[۱] گنگا پرشاد ہال میں پروفیسر احتشام حسین صاحب کے انتقال پر تعزیتی جلسہ مولانا مرحوم کی صدارت میں ہوا اس موقع پہ مولانا نے جو تقریر پڑھی اس کی طرف اشارہ ہے۔

افق لکھنوی

یوم افق کے موقع پر شیشور پرشاد منور لکھنوی کے نام مولانا دریابادی کا پیام

دریاباد

۱۱ر جولائی ۱۹۶۴ء

بسم اللہ

یوم افق

افق صاحب کا نام نامی کان میں اس وقت پڑا جب میں اسکول کے ساتویں آٹھویں درجے کا طالب علم تھا ان کی ایک نظم اُردو کورس میں داخل تھی غالباً کوئی مسدس "شہر آشوب" قسم کا تھا دو ایک مصرعے اب بھی حافظہ میں رہ گئے ہیں۔

وہ شالہ اوڑھ کر چلے ہیں فصل گرما میں
ہے شربتی کا انگرکھا بدن پہ سرما میں

جب ذرا اور بڑا ہوا تو اودھ اخبار میں کہ وہی اپنے دور میں اردو کا سب سے زیادہ سربرآوردہ اخبار تھا۔ ان کے مضمون پر مضمون دیکھنے میں آئے۔ شاعر کا نام بھی جب ہی معلوم ہوا۔ ملک الشعراء کا لقب بھی ان کے نام کے ساتھ پڑھنے میں آیا۔ ان کی قدرت کلام کا اندازہ بھی اسی وقت ہوا اس وقت وہ اودھ اخبار کے ایڈیٹر تھے اور یہ بجائے خود ایک امتیازی اعزاز تھا۔

مشہور یہ تھا کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے اس کلیہ کی تردید میں ایک ہجوم جس طرح ایک طرف کشمیری پنڈتوں (نسیم سرشار وغیرہ) کا تھا اسی طرح دوسری طرف کائستھوں کا تھا اور کائستھ برادری کے صف اول میں ایک جوالا پرشاد برق تھے۔ اور دوسرے یہی دوارکا پرشاد افق تھے اور حضرت افق کی خوش نصیبی تھی کہ اپنا جانشین اپنے فرزند سعید اور شاگرد رشید کو چھوڑ گئے جو ہر طرح ان کے کام کو ترقی و تکمیل تک پہنچانے والے اور ان کے نام اور یاد کو موقر رکھنے والے ہیں۔ ایسی خوش نصیبی کم ہی کسی کے حصہ میں آتی ہے۔

والسلام
عبدالماجد

اکبر الٰہ آبادی

یوم اکبر کے سلسلے میں ناظم انجمن اردو پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور کے نام

دریاباد۔

۲۹ ستمبر ۱۹۶۰ء

بسم اللہ

پیام

اکبر کی عزت کرنا خود اپنی عزت بڑھانا ہے ع
مادح خورشید مداح خود است

دل خوش ہوا کہ آپ نے اکبر شناسی کا ثبوت دے کر اپنے عرفان نفس کے بھی مدارج طے کر لیے۔ اکبر کا پیام مسیح الطیف، ذوق ادب کے ساتھ اسلام اور اسلامیت کے پیام کے سوا کچھ نہیں۔ ناک سخن و حاصل کلام کے لحاظ سے اکبر و اقبال بالکل ہم زبان ہیں، گو راستے دونوں کے الگ الگ ہیں۔

والسلام
عبدالماجد

(۲)

یوم اکبر الٰہ آبادی کے سلسلے میں اکبر مرحوم کے پوتے سید محمد مسلم رضوی، کراچی کے نام

دریاباد

۴ ستمبر ۱۹۶۲ء

بسم اللہ

پیام

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

اکبر کے زمانہ میں تو رپٹ اللہ کا نام لینے پر لکھائی جاتی تھی، مگر اب تو وہ وقت آ گیا ہے کہ خود حضرت اکبر کا نام لینا بھی رپٹ لکھانے کے قابل نظر آتا ہے۔ چہ جائیکہ ان کی یاد منانا اور یوم اکبر کی طرح منانا!

اکبر کا پیام اور تھا بھی کیا۔ بجز اسلام اور اسلامیت اور درس خودداری کے دل روتا جاتا اور چہرے پر بجائے آنسوؤں کے تبسم کے آثار طاری رکھتے۔ مرثیہ کا مضمون نغمہ طرب

کی سے میں ادا کرتے۔
آفریں ہے آپ کی ہمت پر کہ آپ نے اس دور میں بھی ان کا پیام سنانے کی
ٹھان لی ——

دعاگو:
عبدالماجد

(۳)

یوم اکبر کے موقع پر محمد عصمت اللہ خاں سکریٹری اردو فارسی سوسائٹی، لکھنؤ کے نام

پیام

دریاباد
۱۵ر مارچ ۱۹۶۷ء

کلام اکبر کی اگر آپ کو چاٹ پڑ گئی تو ایک ہی وقت میں ۔
۱۔ آپ نے اپنی زبان بھی درست کر لی ۔
۲۔ اردو کے ایک اچھوتے، لطیف، پیارے اسلوب بیان کے بھی رمز شناس ہو گئے۔
۳۔ اپنی سخن گوئی، سخن فہمی، سخن سنجی کی بھی نوک پلک درست کر لی۔
۴۔ توحید و معرفت کی بھی چاشنی چکھ لی۔
۵۔ اپنے اندر مشرقیت، اسلامیت، غیرت ملی اور خودداری کی روح بھی جذب کر لی۔
اکبر اور کلام اکبر پر سیکڑوں صفحے لکھ چکا ہوں اور پھر بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے
کچھ بھی نہیں لکھا اللہ تکملہ آپ لوگوں کے ہاتھ سے کردے۔

عبدالماجد

امجد حیدرآبادی

امجد حیدرآبادی پر مضمون کے مطالبے پر خواجہ حمیدالدین شاہد کے نام شاہد صاحب اس وقت
حیدرآباد دکن میں تھے اب کراچی میں مقیم ہیں۔

دریاباد
۴ر جنوری ۱۹۵۵ء
بسم اللہ

"امجد" نامور بڑی شان کے باب میں "ماجد" گمنام و بے نشان کا کچھ عرض کرنا سورج
کو چراغ سے دکھانا۔

شہد کو اور کون سی مٹھاس ڈال کر میٹھا کیا جائے، اور نمک میں اور کون سی نمکینی
ڈال کر نمکیں بنایا جائے؟
وہ میرے افضل التفضیل برائے نام ہی نہیں زندگی کے ہر صیغہ میں مجھ سے افضل،
اکرم، اشرف، اور اکمل ہیں۔
اللہ ان کی عمر میں، کمالات میں، کرامات میں زیادہ سے زیادہ برکت عطا فرمائے۔

عبدالماجد

بابائے اردو مولوی عبدالحق

بابائے اردو کی جوبلی کے موقع پر سید ہاشمی فریدآبادی سکریٹری عبدالحق جوبلی کمیٹی کراچی کے نام

دریاباد
۱۵ر دسمبر ۱۹۵۹ء
بسم اللہ

پیام

بابائے اردو کی خدمات زبان و ادب پر کچھ لکھنا لکھانا ؎
سورج کو چراغ سے دکھانا

جو چیز خود ہی آفتاب کی طرح روشن ہو اس پر کوئی روشنی کہاں سے لا کر ڈالے گا۔
یہ عظیم الشان تناور درخت جس کا نام انجمن ترقی اردو ہے اور جس کی شاخیں ہندوستان و
پاکستان دونوں مملکتوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ خوب یاد ہے کہ ایک زمانہ میں کچھ بھی نہ تھا اور یہ
سارا فیض ایک ہی ذات کی ان تھک آبیاری کا ہے۔ یہ انجمن ابتداءً محمڈن ایجوکیشنل
کانفرنس کے صرف ایک شعبہ کی حیثیت سے شعبۂ علمیہ کا نام رکھتی تھی۔ غالباً ۱۹۰۳ء میں
قائم ہوا تھا پھر ۱۹۱۱ء میں مولوی عزیز مرزا مرحوم کی وفات سے بالکل مردہ ہو گیا تھا ۱۹۱۲ء
میں صاحب زادہ آفتاب احمد خاں مرحوم کی مردم شناس نگاہ نے اس کا سکریٹری مولوی عبدالحق
صاحب کو منتخب کیا اور اسی گھڑی سے قالب بے جان میں جان پڑ گئی بلکہ قالب تک نیا
ہو گیا۔ موصوف حیدرآباد، اورنگ آباد، دہلی جہاں کہیں بھی رہے بس وہی اردو تحریک
کا مرکز بن گیا اور اب قیام کراچی کے وقت سے جو کچھ کر رہے ہیں سب پر روشن اور آشکارا
ہے۔ انجمن کو ایک مستقل قائم بالذات خود مختار ادارہ کس کی مسیحا نفسی نے بنایا۔ سیاسی، علمی،
یا لسانی ہر محاذ پر یہی اردو کے لیے لڑائیاں لڑے اور شدید مخالف قوتوں کے باوجود

میدان پر میدان مار لیے۔

بس ایک دھن ہے خدمت اردو کی جو ان کی زندگی کی رگ رگ میں بسی ہوئی ان کے عقیدے میں عبادت کا درجہ حاصل کیے ہوتے ہے۔

اللہ ان کی عمر میں برکت زیادہ سے زیادہ عطا فرمائے اور ان کی ہمت کو جو جوانوں کو شرمائے ہوتے ہے ہمیشہ جوان ہی رکھے! ان کی سرگرمیاں قابلِ رشک ہیں اور ان کی بلند ہمتی قابلِ صد تقلید و ہزار آفریں۔

والسلام، دعاگو و دعا خواہ: عبدالماجد

(۲)

ماہنامہ صداقت حیدرآباد (دکن) کے بابائے اردو نمبر کے لیے مضمون کے مطالبہ پر، اس کے ایڈیٹر کے نام

دریاباد
۶ مئی سنہ ۱۹۶۰ء

بسم اللہ

بابائے اردو

ہمارے مخدوم و مکرم مرزا محمد ہادی مرزا لکھنوی (رسوا نہیں مرزا، رسوا تو انہوں نے بدنامی سے بچنے کے لیے ایک نقاب ناول نویسی کے لیے تیار کر لیا تھا۔ ورنہ شاعری کی دنیا میں محض مرزا تھے) شعر بڑے مزے کے کہتے تھے ان کی ایک غزل کا شعر ہے ؎

ہو کوئی حور پہ فدا کوئی بتوں پہ ہو شہید
ڈھونڈھ ہی لیتا ہے انسان خدا ایک نہ ایک

سو جانے بزرگ بابائے اردو نے اپنا خدا اردو ڈھونڈھ نکالا ہے۔ وہی ان کا مرجع، وہی ان کا ملجا، وہی ان کا مقصود، وہی ان کا مسجود، وہی ان کی عبادت، وہی ان کی ریاضت، وہی ان کا معبد، وہی ان کا مصلیٰ۔ نہ بیوی نہ بچے۔ ساری خانگی الفتوں دلچسپیوں کا وہی ایک مرکز و محور ۱۹۱۲ء سے جب انجمن ترقی اردو اس کس مپرسی میں پڑی ہوتی ان کے حوالے ہوئی ہے یہی دیکھیے کیسی نکھر گئی ہے۔

اورنگ آباد ہو کر حیدرآباد، دہلی ہو کر کراچی، جہاں کہیں بھی رہے سوتے جاگتے ہیں

ایک دھن ان پر سوار۔ جوان سے ادھیڑ ہوتے اور ادھیڑ سے بوڑھے اسی ایک عشق میں۔ عجب نہیں کہ جب کبھی گنگناتے ہوں تو اپنے اسی محبوب کو مخاطب کر کے۔

اے تو افلاطون و جالینوس ما

دولت لٹائی تو اسی کی خاطر، دست گدائی پھیلایا تو اسی کے لیے۔ آج اس سے لڑے، کل اس سے ملے، سب اسی پر جفاد پر وفا کے لیے۔ اتنے مجاہدے دین و مذہب کی خاطر کرتے تو عجب کیا کہ جنیدؒ و بایزیدؒ کی صف میں شمار ہوتے۔

آندھیاں اٹھیں اور گزر گئیں، انقلاب آتے اور ختم ہو گئے و بدستور اسی بساطِ اردو سے چپٹے ہوتے۔

ان کے کارناموں کو گنانا، ان کی تفصیل لکھنا دوسروں کا کام ہے۔ یہاں تو داد محض ان کی استقامت بلکہ کرامت کی دینا ہے جس کسی نے انھیں بابائے اردو کہا بہت خوب کہا۔ کچھ خیال ایسا پڑتا ہے سب سے پہلے شاید میر نیرنگ مرحوم کی زبان سے نکلا تھا یا شاید اس کے موجد خواجہ حسن نظامی ہوں۔

اللہ ان کی عمر و توانائی میں زیادہ سے زیادہ برکت دے اور خدمت اردو کے لیے ان کی جسمانی اور دماغی قوتوں کو سدا جوان رکھے۔

عبدالماجد

جگر مراد آبادی

یوم جگر کے موقع پر نادم سیتاپوری کے نام

دریاباد
۲۰ اکتوبر سنہ ۱۹۶۱ء

پیام

جگر اپنی غزل گوئی میں تو فرد تھے ہی۔ شخصیت بھی محبوب و دل آویز رکھتے تھے۔ اور یہ ادا تو ان کی کبھی بھولنے والی نہیں کہ سالہا سال کا زمانہ رندی میں گزرا اور بدمست اس مدت میں ایک بار بھی نہ ہوتے۔ شرافت کے حدود بہرحال قائم رکھے اور اسی وصف نے انھیں بہت بڑا انسان بنا دیا۔

اردو والوں پر فرض ہے کہ ان کی یاد کے ساتھ اپنی محبت اور عقیدت کا تعلق زیادہ

سے زیادہ قائم رکھیں۔

والسّلام عبدالماجد

مولانا حسرت موہانی

یوم حسرت موہانی کے موقع پر نصرت موہانی، کراچی کے نام

دریاباد
۲۴ مئی ۱۹۵۶ء

بسم اللہ

پیام

یونانیوں اور بہت سی قدیم قوموں میں دستور رہا ہے کہ صفات انسانی کے اعلیٰ اور مثالی درجہ تکمیل کے لیے ایک ایک دیوتا تراش لیا تھا۔ مثلاً شجاعت کا دیوتا، حسن و جمال کا دیوتا وغیرہ وغیرہ۔ ہمارے دین میں اگر یہ جائز ہوتا تو عجب نہیں بے خوفی، لالچی اور سادگی کا دیوتا ہم حسرت موہانی کو قرار دیتے۔ ان اوصاف کے وہ مثالی پیکر تھے اور توکل علی اللہ سب پر مستزاد۔ ان کے شعری، ادبی اور تنقیدی کمالات کا باب ان اوصاف ملکوتی کے علاوہ ہے۔ ایسی ہستیاں اپنی صدی میں کہیں دو چار ہی ہوتی ہیں۔

والسّلام
عبدالماجد

(۲)

اُمّد ہندی سنگم، لکھنؤ کے سکریٹری حیات وارثی کے نام مولانا کا پیام

دریاباد
۱۴ ستمبر ۱۹۶۶ء

پیام

حسرت موہانی سچے مسلمان تھے۔

- صاحب ایمان و عرفان تھے۔
- محبت کی جان اور اخلاص و ایثار کے مجسم نشان تھے
- قناعت اور توکل میں اپنی مثال آپ تھے۔
- ایک بہترین شاعر خصوصاً غزل گو تھے۔
- جرأت و ہمت میں لاثانی تھے۔

- جاں بازی و بے خوفی میں فردِ فرید تھے۔
- ایک بہترین ناقد و ادیب تھے۔

اخلاق، کردار، عقل و ذہن کی خوبیوں کی جامعیت کے لحاظ سے ایک مکمل انسان تھے۔

عبدالماجد

خواجہ حسن نظامی

ماہنامہ منادی، دہلی کے لیے مضمون کی فرمائش پر، منادی کے ایڈیٹر خواجہ حسن ثانی نظامی کے نام

دریاباد
۷ جولائی ۱۹۵۶ء

بسم اللہ

البیلا انشا پرداز

خواجہ صاحب کی بزرگی و درگی کا حال تو کوئی بزرگ ہی بتا سکتا ہے۔ اپنا ایمان تو ان کی انشا پردازی پر ہے۔ صاحب قلم (یا انھیں کی زبان میں قلم کار) کی حیثیت سے فرد تھے۔ اور اس کی شہادت یہاں سے لے کر آخر تک میں دے سکتا ہوں کہ ان کا سا البیلا انشا پرداز نہ ان کے زمانے میں پیدا ہو سکا اور نہ آج تک پیدا ہوا ہے۔

وہ صحیح معنی میں انشا پرداز تھے۔ ساز سے زیادہ سوز کے مالک اور اس سے بڑھ کر تاریخ ادب پر کوئی ظلم نہیں کہ کتابوں پر کتابیں اور مقالوں پر مقالے نثر اردو کے ماہرین پر تیار کر دیے جائیں اور ان میں مرحوم کا نام بھی نہ آنے پاتے۔

والسّلام عبدالماجد

(۲)

یوم حسن نظامی کے سلسلے میں حلقہ ادب پاکستان، لاہور کے صدر جناب عابد نظامی کے نام

دریاباد
۲۱ مئی ۱۹۶۲

پیام

خواجہ صاحب کی دوسری حیثیتوں سے متعلق جو بھی رائے قائم کی جائے بحیثیت ادیب و انشا پرداز ان کا مرتبہ بالکل مسلّم ہے۔ سلاست، گھلاوٹ، شگفتگی کے وہ بادشاہ تھے۔ ایک مخصوص طرزِ انشا کے وہ مالک تھے۔ اس کے موجد بھی وہی، اس کے خاتم بھی وہی۔ فن بلاغت میں جسے سہل ممتنع کہا گیا ہے یہ انھیں کی انشا تھی۔

میں نے اپنے ابتدائی دور میں ان کے قلم سے خاصا کسب فیض کیا ہے۔ حال میں جن لوگوں نے اردو ادب کی تاریخیں لکھی ہیں انھوں نے بڑا ظلم کیا ہے کہ خواجہ صاحب کا ذکر ہی سرے سے اڑا گئے ہیں۔ یہ ایسی ہی بات ہے کہ کوئی عشق و عاشقی کی تاریخ لکھے اور اس میں نام قیس عامری کا نہ آنے پائے۔

میں نے حال ہی میں ایک مضمون لکھا ہے عنوان ہے "اردو کے چند مظلوم ادیب" ان مظلوموں کی فہرست میں مولانا آزاد کے بعد ہی نام خواجہ صاحب کا رکھا ہے۔

ان کا قلم جامع تھا "آہ" "اوہ" "واہ" کا لیکن مسکراہٹوں سے بھی کہیں بڑھ کر آنسوؤں کے لیے موزوں تھا۔

ان کی ادبیت کی یاد منا کر آپ لوگ خود اپنے حسن ذوق کا ثبوت دے رہے ہیں۔

والسلام عبدالماجد

(۳)

یوم خواجہ حسن نظامی کے موقع پر جناب عابد نظامی کے نام مولانا دریابادی کا پیام

دریاباد

یکم اپریل ۶۵ء

البیلا ادیب

تاریخ زبان اردو کے پرچہ میں اگر یہ سوال آیا ہے کہ البیلا ادیب کون گزرا ہے تو جواب صرف ایک ہوگا:

خواجہ حسن نظامی

وہ مستوں کا مست، سرشاروں کا سرشار، دیوانہ بکار خویش ہشیار، ادب کا خادم ادیبوں کا مخدوم سب سے نرالا اپنی اداؤں میں البیلا، زباں دانوں کا پیالا ادب دانشاں کی آنکھوں کا تارا۔

والسلام عبدالماجد

حفیظ جالندھری

ماہنامہ افکار، کراچی کے حفیظ نمبر کے لیے اس کے ایڈیٹر جناب صہبا لکھنوی کے نام

دریاباد

۳۰ر جولائی ۱۹۶۳ء بسم اللہ

پیام

جوش نمبر کے بعد حفیظ جالندھری نمبر! آتش سیال کے بعد دور ماء اللحم کا اور شربت روح افزا کا! الحاد کو شہ دینے کے بعد تحسین اور پیشوائی اسلام کی! — حسن تلافی کا حسین و قابل دید نمونہ۔

شاہنامۂ اسلام کا مصنف اور "سر پھرا ملاح"[1] کا خالق۔ آپ کے ملک میں اندھیرے گھر کا چراغ۔ اکبر و اقبال دونوں کا جانشین۔

والسلام عبدالماجد

رفیع احمد قدوائی

روزنامہ سیاست جدید، کانپور کے قدوائی نمبر کے لیے مضمون کی فرمائش پر

مقام رفیع

ہندوستان کی تازہ تاریخ میں جو مقام رفیع رفیع احمد قدوائی مرحوم کو حاصل ہے اس سے انکار کسی دشمن کے لیے بھی ممکن نہیں دل خوش ہوا کہ اسی کا اعتراف سیاست جدید اپنا ایک خصوصی نمبر نکال کر کر رہا ہے۔ ایک سیاسی مخالف کی عظمت کا اعتراف خود ادارہ سیاست کی بھی شرافت کا ایک عملی ثبوت ہے۔

اپنی دوسری بے شمار خدمات کے علاوہ مرحوم نے ہندوستان کے ایک پیچیدہ ترین مسئلہ رزق کو جس طرح حل کر دکھایا اور رزاق مطلق کے نائب کی جو تجلی اس عالم ناسوت میں دکھا دی اس کے لحاظ سے اگر انہیں "میکائیل ہند" کہا جائے تو کیا بے جا ہے!

"حسرت آیات" ایسی ہی وفات کو کہا جا سکتا ہے۔ مرحوم کی وفات کے وقت صدق نے جو کچھ عرض کیا تھا، اسے آج بھی پڑھا جا سکتا ہے۔

عبدالماجد

ڈاکٹر محی الدین زور

ڈاکٹر زور پر محمد بن عمر کوئی نمبر یا کتاب مرتب کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں مولانا دریابادی سے مضمون کی فرمائش کی تو مولانا نے حسب ذیل جواب دیا۔

دریاباد

۱۴ر دسمبر ۱۹۵۴ء بسم اللہ

---

(۱) مولانا محمد علی کے انتقال پر حفیظ صاحب نے ایک تعزیتی نظم اسی عنوان سے کہی تھی۔

جوہ زور مجسم ہے اس کی مدح و توصیف میں مجھ جیسا کم زور، قلم اٹھا ہی کیا سکتا ہے۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو کے تو خیر وہ بانی ہیں، باقی حیدرآباد دکن سے کون ایسی ادبی تحریک ادھر ۲۵، ۳۰ سال میں اٹھی جس کے وہ مدح رواں نہ تھے۔ کوئی لکھنے کو قلم اٹھائے تو کیا کیا لکھے اور کہاں تک لکھتا جائے۔

ان کے کمالات کو سمجھ لینا اور ان کی داد پہ آمادہ ہو جانا یہ خود ہی ایک کمال ہے۔ آفتاب کو روشن دیکھنا خود اپنی صحتِ بصارت کا اعلان کرنا ہے بہ قول عارف رومی

مادحِ خورشید مداحِ خود است
کیں دو چشمم روشن نامر مدست

اس اجمال کے اندر آپ ساری تفصیل پڑھ سکتے ہیں۔

والسلام عبدالماجد

سید سلیمان ندوی

حضرت سید صاحب کی یادگار کے طور پر سلیمان ہال؟ کے قیام پر مولانا دریابادی کا پیام

دریاباد

۲۶ر دسمبر ۱۹۵۷ء

بسم اللہ

"سلیمان عصر" کی یادگار کے سلسلہ میں آپ لوگوں کا مجھ "مورِ ضعیف" کو یاد کرنا محض آپ کی ذرہ نوازی ہے۔

اور پھر ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے علم دوست و جوہر شناس گورنر کے ورود کے موقع پر میران کے فرائض کی یاد دہانی کرانا بلکہ اس کی طرف اشارہ بھی کرنا۔

سورج کو چراغ ہے دکھانا
یا لقمان کو حکمت سکھانا۔

جو پروردگار کارسازان کے قدم وہاں لے آیا ہے وہی ان کے قلب و زبان پر بھی حکمراں ہے مجھے تو صرف دور سے دعا گوئی اور خوشخبری سننے کے لیے رہنے دیجیے۔

دعاگو: عبدالماجد

(۱) ڈاکٹر محی الدین زور صاحب جامعہ عثمانیہ اور اس کے بعد کشمیر یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر و صدر شعبہ رہے پروفیسر صاحب موصوف ادارہ ادبیاتِ اردو کے بانی تھے ادارے نے خاصا علمی و ادبی کام حیدرآباد میں کیا اور اب تک کر رہا ہے۔

(۳)

ماہنامہ "نیا راہی" کراچی کے ایڈیٹر انوار ظہوری کے نام جنھوں نے رسالے کا سلیمان نمبر نکالنے کا عزم کیا تھا۔ یہ نمبر نکل نہیں سکا۔

دریاباد

۲۱ر جنوری ۱۹۶۱ء

بسم اللہ

پیام

"سلیمان نمبر" کے لیے سلیمان کے شایانِ شان یہ "مورِ ضعیف" "پر و بال" کہاں سے لائے۔ مرحوم سے اس نیاز مند کے تعلقات ۴۰، ۴۵ برس تک رہے، گہرے بے تکلفانہ عزیزانہ، طالب علمی سے لے کر سن کہولت تک، عمر کے ہر دور میں، شروع شروع میں ایک حد تک حریفانہ، معارضانہ، اخلاص نے ساتھ ہر دور میں دیا۔

اتنے طویل تجربے اور ساتھ میں ایسا شریف، ایسا متین، ایسا سنجیدہ کمتر ہی کوئی نظر آیا۔ صحیح معنی میں طالب علم ساری عمر رہے۔ علم کے پتلے کتاب کے کیڑے۔ علم و تحقیق کا ذوق، ہر دوسرے ذوق پر غالب۔ سیرت نبوی سے عشق ساری عمر رہا اور آخر عمر میں فنا فی الشیخ ہو کر رہ گئے تھے۔ ایک پیکر تواضع و خشوع علمی معاملات میں اپنے چھوٹے سے بھی اپنے کو چھوٹا سمجھنے والے۔

والسلام عبدالماجد

علامہ شبلی نعمانی

مولانا اسد القادری صدر پاکستان اسعد اکیڈمی کراچی نے یوم شبلی منانے کا عزم کیا تھا۔ اُن کی درخواست پر مولانا دریابادی نے یہ خط روانہ فرمایا۔ یہ یوم منایا نہیں جا سکا۔

۲۳ر جون ۱۹۶۵ء

بندہ نواز! وعلیکم السلام

یوم "شبلی" کی تحریک مولانا "اسد" کی طرف سے! بہت ہی خوب

مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

پروگرام کی دفعات بکھری ہوئی مگر بڑی نکھری ہوئی نظر آئیں! دلکش من موہنی، وجد آفریں! اہلِ قال سے بڑھ کر اہلِ حال کے قابل! یہ نیاز نامہ ان ہی کی خاطر ہے۔

والسلام

دعاگو و دعاخواہ، عبدالماجد دریاباد

قاضی عبدالغفار

قاضی صاحب مرحوم کی یادگاری تقریب کے موقع پر خبیر بھوروی کے نام مولانا دریابادی کا پیام

دریاباد

۱۰ر جنوری ۱۹۷۱ء

پیام

قاضی عبدالغفار مرحوم ظریف تھے۔

اور شریف تھے۔

ظرافت اور شرافت کا اجتماع لازمی نہیں قاضی صاحب دونوں کے جامع تھے۔ مسکراتے ہوتے مزاح میں جسے خوش طبعی کہہ لیجیے یا شوخ نگاری اردو میں ان کی ٹکر کا شاید کوئی مل سکے۔

وہ ابتذال اور رکاکت سے ناآشنا تھے اور پھکڑ کی تو شاید انھیں ہوا بھی نہ لگی تھی۔ وہ مہر و وفا کے پتلے تھے، بغض، دشمنی و دل آزاری سے کوسوں دور تھے۔ زندہ دلی کے ایک مجسم پیکر تھے۔ مدتوں مولانا محمد علی کے حاشیہ نشین رہے صحافت کے ابتدائی سبق انھیں سے سیکھے علی گڑھ کے شیدائی تھے وہیں کی زمین اپنی ابدی خواب گاہ بنائی۔

اللہ جزائے خیر دے جناب خیر کو انھیں نے ان کی یاد ہم نا اہلوں کو دلادی۔

علی عباس حسینی

حسینی مرحوم کے یادگاری جلسے کے موقع پر انجمن ارباب ادب لکھنؤ کے ایس اے احسن نقوی کے نام

دریاباد۔

۱۳ر دسمبر ۱۹۶۹ء

پیام

علی عباس حسینی کیا بہ حیثیت انسان اور کیا بہ حیثیت صاحب فن دونوں حیثیتوں سے بڑا امتیازی درجہ رکھتے تھے کہنے کو وہ ترقی پسند تھے لیکن میں کہا کرتا تھا کہ اگر ایسے ہی ترقی پسند سب ہو جائیں تو میں ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لیے تیار ہوں اتنا صاف ستھرا قلم، اتنا شستہ ذوق، اتنی فصیح اور سلیس زبان، گندگی و بداطواری سے اتنا گریزاں ان کے طبقہ

میں شاید ہی کسی کے نصیب میں آیا ہو۔ امریکہ کے گندے جنسی ناولوں کے مطالعہ میں غرق رہتے لیکن کیا مجال جو اپنے قلم پذرا بھی ان کا عکس پڑنے دیں۔ زندگی کی عکاسی اور مصوری میں انھیں ملکہ حاصل تھا اور زبان و بیان پر پوری قدرت۔

بہ حیثیت صاحب قلم اگر شریف تھے تو بہ حیثیت انسان شاید شریف تر۔ جب انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے تو منطق (Logic) کے کچھ سبق مجھ سے پڑھ لیے تھے اس چند روزہ سرسری تعلق کا پاس آخر عمر تک کرتے رہے خود بوڑھے ہو چکے تھے مگر میرے سامنے اپنے کو طالب علم و شاگرد ہی سمجھتے رہے۔ یوں بھی منکسر، متواضع، صلح کل، خدمت گزار، مہمان نواز قسم کے آدمی تھے۔ آخر عمر میں عبادت و مذہبیت کا رنگ اور غالب آگیا گفتگو اکثر آیات قرآنی پر کرتے اور نماز کے لیے چوکی بستر علالت کے پاس لگی رہتی اتنی خوبیوں کے لوگ کمتر ہی نظر آتے ہیں۔

دعاگو: عبدالماجد

اسداللہ خاں غالب

یوم غالب کے موقع پر غالب اکیڈمی، بنارس کے خبیر بھوروی کے نام

دریاباد

۱۳ر دسمبر ۱۹۶۲ء

بسم اللہ

پیام

غالب کی قدر کرنا خود اپنی سخن شناسی اور حسن ذوق کا ثبوت دینا ہے اہل بنارس قابل مبارک باد ہیں کہ انھوں نے اس "کار خیر" کو یاد رکھا۔

عبدالماجد

تلوک چند محروم

منشی تلوک چند محروم کی یادگاری تقریب کے موقع پر محروم کے نامور بیٹے جناب جگن ناتھ آزاد کے نام پیام

کلام محروم کے وسیع اور مکمل مطالعہ سے تو اب تک محروم ہی رہا ہوں۔ پھر بھی اس کا اچھا خاصا حصہ پڑھ لیا ہے۔ کبھی رسالوں میں کبھی خود ان کے مجموعہ کلام میں اور ان کے نام نامی سے تو اپنے بچپن ہی سے روشناس رہا ہوں۔ اتنی بات تو ہانک پکار کر کہہ سکتا ہوں کہ جن

لوگوں نے اُردو کو مسلمانوں کے ساتھ مخصوص سمجھ رکھا ہے ان کے اس سو فیصد غلط دعوے کے جواب میں جن مسلّم و معروف اکابر اردو کو پیش کیا جا سکتا ہے ان میں سرشار، چکبست، نسیم، برقؔ، ہجرؔ، فراقؔ، ساحرؔ، شادؔ، ذرّہؔ اور منوّرؔ لکھنوی کے ساتھ ایک نام محروم کا بھی یقیناً ہوگا۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایک پنجاب اور وہ بھی پنجاب کے دیہات میں پیدا ہونے والے نے دہلی اور لکھنؤ کی معیاری زبان پر عبور کیسے حاصل کر لیا! پھر یہ قدرت زبان کسی ایک صنف کے ساتھ مخصوص نہیں محدود نہیں کیا غزل اور کیا قطعہ، کیا مثنوی اور کیا رباعی ہر جگہ

ہے قلم ان کا ابرِ گوہر بار

ہے زباں ان کی تیغ جوہر دار

یہ تو ہوئی ان کے کلام کی ادبی، لفظی لطافت و ملاحت، رہی معنویت تو ان کے زمزمۂ توحید و نغمۂ معرفت کو سن کر دھوکا بار بار کلام اقبالؔ کا ہوتا ہے اور گماں یہ گزرنے لگتا ہے کہ یہ کوئی نیا اور البیلا شارح و ترجمان سعدیؔ و رومیؔ کا نکل آیا ہے اور شرافت تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کلام کی جان اور جوہر ہی ہے۔

اس مادیت، سطحیت، اخلاق بیزاری اور سفل پروری کے دور میں جس کسی نے محروم کی یادگار منانا چاہی وہ خود لائق صد احترام اور مستحق صد ستائش ہے اس نے ثابت کر دیا کہ روحانیت کے، اخلاص کے، شرافت کے صحیح و لطیف ذوقِ شعر و ادب کے ماننے والوں سے، قدر دانوں سے، احترام کرنے والوں سے ملک اب بھی خالی نہیں ہے۔

محسن کاکوروی

۱۹۶۸ء میں یوم محسن کاکوروی کے اہتمام کے موقع پر طاہر محسن علوی کے نام

اُردو والے قابل مبارک باد ہیں کہ مدتوں کے تغافل کے بعد اب انھیں محسنؔ کی یاد آئی اور اگر آداب محفل کے منافی نہ ہو تو اس محسنؔ کے ساتھ اُس محسن زادے کی یاد میں بھی ایک حرف کہتا چلوں جس کا لغت "نور اللغات" اس وقت تک کے چھپے ہوئے اُردو لغات میں مکمل اور سب سے زیادہ جامع و مستند ہے۔ یہ روشنی پھیلائی ہوئی اُسی کے دم کی ہے۔

بشیشور پرشاد منوّر لکھنوی دہلوی

یوم منوّر کے موقع پر راج نارائن، دہلی کے نام مولانا دریابادی کا پیام

دریاباد۔

۱۲ / اپریل ۱۹۶۷ء

بسم اللہ

پیام

منوّر صاحب ماشاء اللہ شاعر ابن شاعر ہیں۔ بلکہ یوں کہیے کہ ان کا گھرانا ہی شعر و شاعری کا گھرانا ہے۔ اسی کو کہتے ہیں،

این خانہ تمام آفتاب است

پہلے لکھنوی تھے اب تو دہلوی ہو گئے۔ آنکھیں کھولیں تو زبان و ادب کے ایک مرکز میں، اب چل پھر رہے ہیں اُٹھ بیٹھ رہے ہیں ہنس بول رہے ہیں تو زبان و ادب کے دوسرے مرکز میں، آغاز بھی مبارک اور انجام بھی مبارک۔

کلام نام روشن کیے ہوتے آخر منوّر ہی ہیں روشن بھی اور دوسروں کے لیے روشنی بخش بھی، بر نہال شروع ہی سے تھے سن کے ساتھ کلام میں بھی پختگی آتی گئی اور اب تو نام و شمار استادوں میں ہے۔

جیتے رہیں کہ ان کے دم سے خدمتِ اردو کی ایک روایت کہن زندہ و تازہ ہے۔

عبدالماجد

میر تقی میرؔ

دلّی یونیورسٹی کے اردو میگزین کے میر نمبر کے لیے پیام پروفیسر نثار احمد فاروقی کے نام

میگزین کا میر نمبر آنعزیز کی رہبری میں نکلے گا انشاء اللہ سب میگزینوں کا میر ہی ہوگا۔ مضامین تحقیقی ہوں گے لیکن خشک نہیں، عمیق ہوں گے لیکن دقیق نہیں، لطیف و شگفتہ ہوں گے لیکن سپاٹ اور بے مغز نہیں۔ ندرت دکھیں گے لیکن غرابت نہیں۔

یہ سب باتیں بطور ایمان بالغیب پہلے ہی سے فرض کیے لیتے ہوں۔ اور خدانخواستہ یہ سب کچھ نہ سہی جب بھی یہ جرأت کیا کچھ کم قابلِ داد اور مستحق آفریں ہے کہ میر تقی میرؔ جیسے پرانے شاعر کی یاد آپ اس دورِ جدت پرستی میں منانے نکلے ہیں۔

ایسے باکمال کی یاد منانا خود اپنے حسنِ ذوق کا ثبوت پیش کرنا ہے۔

دریاباد
۲۴ جنوری ۱۹۶۳ء

والسلام
عبدالماجد

نیاز فتح پوری

نگار پاکستان، کراچی کے نیاز نمبر کے لیے مضمون کی فرمائش پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے نام

دریاباد
۹ مارچ ۱۹۶۳ء

بسم اللہ

ایک "نیاز مند" کی فرمائش مدیر "صدق" سے کہ وہ مناقب "نگار و نیاز" پر کچھ لکھے ستم ظریفی کا شاہکار!

عشق و مزدورئ عشرت گہ خسرو کیا خوب!

"فرمان" کی تعمیل میں بس اتنا ہی عرض کر سکتا ہوں کہ نیاز صاحب سخن سنج اچھے ہیں، شعر کی پرکھ خوب رکھتے ہیں اور صاحب طرز ادیب ہیں۔

والسلام
عبدالماجد

وزیر لکھنوی

یوم وزیر لکھنوی کے موقع پر امین سلونوی سکریٹری انجمن فردوس، لکھنؤ کے نام

دریاباد
۲۵ جولائی ۱۹۵۶ء

بسم اللہ

آپ لوگ بھی خوب ہیں کہ اس زمانے میں جبکہ ہر ہوا جو چلتی ہے اُردو کے خلاف ہی چلتی ہے اور نہ کوئی بادشاہ کو پوچھتا ہے نہ وزیر کو — اُردو ہی کے ایک شاعر وزیر نامی کو یاد منانے اور یادگار قائم کرنے کے لیے ڈھونڈھ نکالا۔

ڈھونڈھ ہی لیتا ہے انساں خدا ایک نہ ایک

مبارک باد قبول کیجیے اور دعائیں لیجیے اس سے زیادہ یہ دعا گو اور کر ہی کیا سکتا ہے۔

والسلام
عبدالماجد

پروگرام

مطبوعاتِ آزاد صدی

آزاد نیشنل کمیٹی پاکستان نے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے صد سالہ یوم پیدائش یعنی آزاد صدی کی تقریب جو یادگار پروگرام بنایا ہے اس کا خاص حصہ کتابوں کی اشاعت سے متعلق ہے یہاں چند کتابوں کا مختصر تعارف کرایا جا رہا ہے جو شائع ہونگی۔ واضح ہے کہ یہ تمام کتابیں مختلف اہل علم کی تصنیف و تالیف اور مختلف اداروں کی مطبوعات میں شمار ہونگی ان میں سے بعض کی اشاعت یا تالیف و تدریس میں کمیٹی کا صرف ایماء یا اخلاقی یا علمی تعاون شامل ہوگا۔

★

اردو کا ادیبِ اعظم

مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق مولانا عبدالماجد دریابادی کے مضمون، تقریریں، شذرات و دیگر تحریرات

مولانا ابوالکلام آزادؒ (شخصی مطالعہ)

از
ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی

مولانا آزاد کی شخصیت، سیرت اور افکار کا مطالعہ

امام الہند مولانا آزاد

از
مولانا امداد صابری

مولانا ابوالکلام آزاد کے سوانح و افکار، شخصیت و سیرت اور خدمات کا تذکرہ!

مولانا آزاد اور اُن کے معاصر
(افکار و تعلقات)

سرسید احمد خان، علامہ شبلی، نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمن خان شروانی، علامہ اقبال، سر عبدالقادر، مولانا عبیداللہ سندھی، بابائے اردو مولوی عبدالحق، مولانا سید سلیمان ندوی اور کئی دیگر اکابر و مشاہیر

طوبیٰ ریسرچ لائبریری

اسلامی اردو، انگلش کتب،

تاریخی، سفرنامے، لغات،

اردو ادب، آپ بیتی، نقد و تجزیہ

toobaa-elibrary.blogspot.com